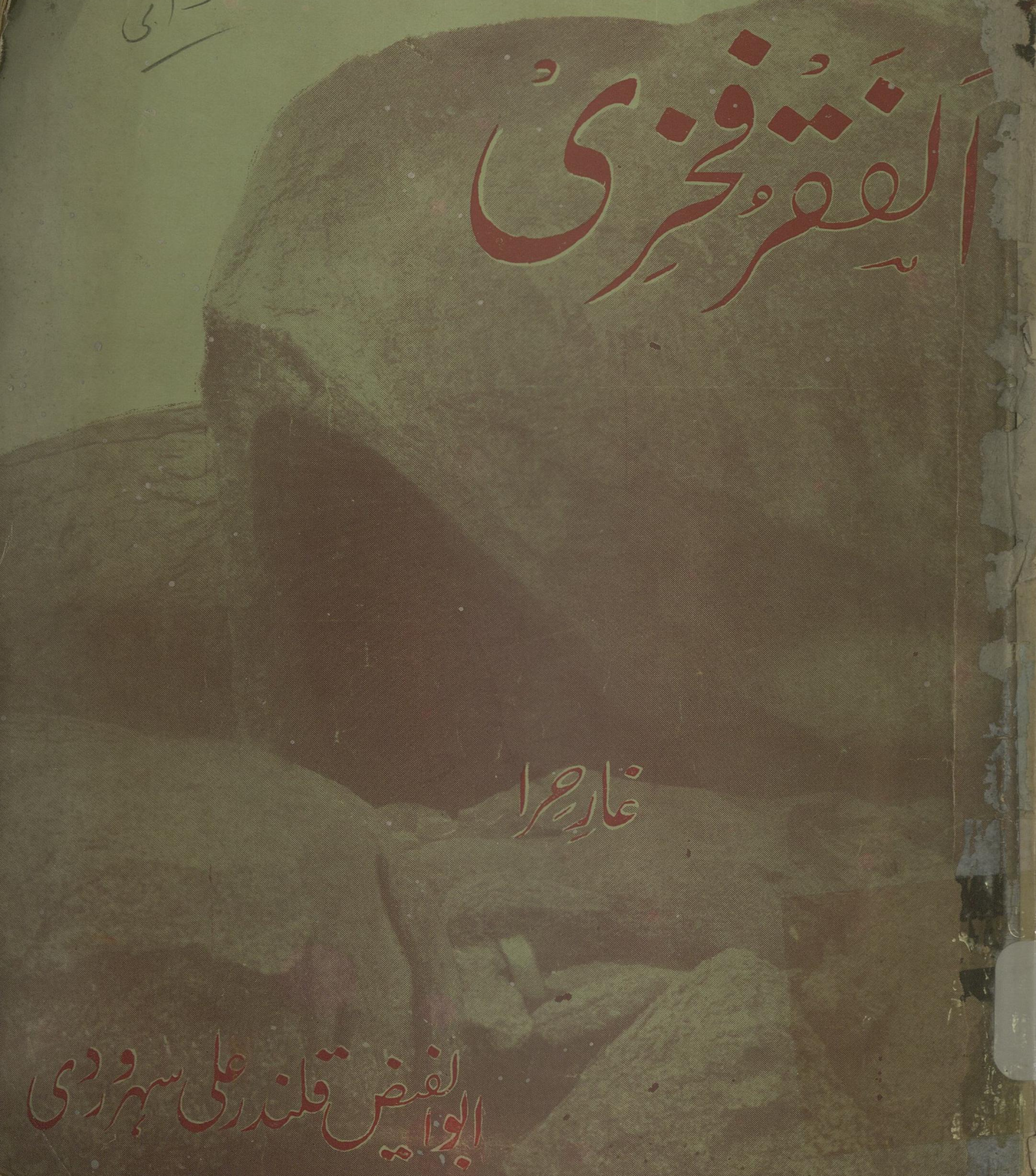
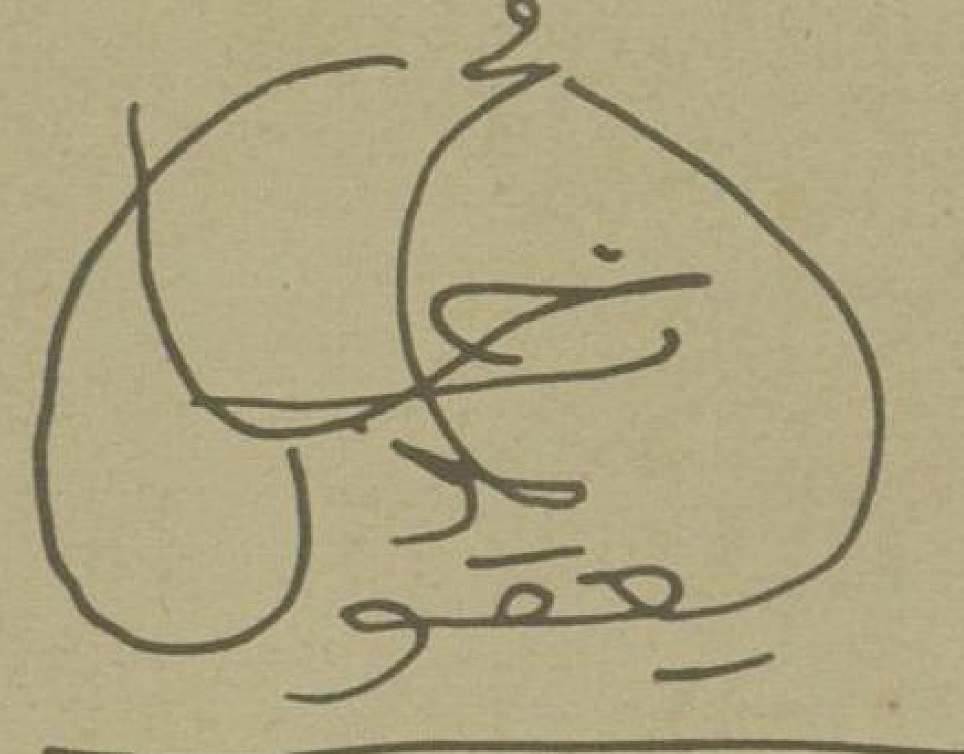
اَلفقرُ فخرِی



غارِ حرا

ابوالفیض قلندر علی سہروردی



ذاتی

۷۸۶

الفقر فخری

کروں مال و زر کی میں کیوں ہوس مجھے اپنے فقر پہ فخر بس
یہی حرزِ جانِ فقیر ہے یہی قولِ شاہِ حجاز ہے

از اعلیٰ حضرت واقفِ اسرارِ خفی و جلی مولانا الحاج ابو الفیض
قلندر علی صاحب قبلہ سہروردی مدظلہ العالی

ناشر
مرکزی مجلس سہروردیہ، لاہور

ناشر ———— مرکزی مجلس سہروردیہ لاہور

طابع ———— ملک محمد عارف

مطبوعہ ———— دین محمدی پریس لاہور

تعداد طبع ———— ۱۰۰۰

قیمت ———— پے

فہرستِ ابواب

معذرت

فقیر افسوس کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ باخدا بنانے والی کتاب "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" جو کتاب و سنّت کی روشنی میں علمِ تصوّف کا ایک پاکیزہ سرمایہ ہے بدیر آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ حالانکہ اس کا مسودہ عرصہ سے مکمّل ہو چکا تھا۔ اور خیال تھا کہ فقیر جلد ہی اس کو شائع کر کے دین کی ایک اہم خدمت سرانجام دے سکے گا۔ مگر اپنی علالت اور بعض دیگر ذاتی مجبوریوں نے اس کام کو کچھ ایسا التواء میں ڈالے رکھا کہ آج بجز معذرت کے اور کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ مولا کریم ہی اس کی اشاعت میں فقیر کی دستگیری فرمائیں۔

امید ہے کہ اس کتاب کا خلوص سے مطالعہ معرفتِ الٰہی کے ہر متلاشی کے قلب و دماغ میں ایک ایسا نورانی و روحانی انقلاب پیدا کر دے گا۔ جو طالبوں کی اجتماعی اور انفرادی، شاہانہ و فقیرانہ، عالمانہ و صوفیانہ زندگی میں اسلامی اخلاق شرافت، خداشناسی، حق پرستی، سنجیدگی، عملی پاکیزگی اور ضبط و نظم کو تخلیق کرتا ہے۔

پاکستانیوں کیلئے اس کتاب کی اشاعت یقیناً خشک سالی میں بارانِ رحمت ثابت ہو گی۔ کیونکہ دُنیا کے عین ایّامِ جوانی میں تمام انبیاء علیہمُ السلام کی تعلیمات کے آخر پر خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم نے اپنے اسوہ حسنہ کی روشنی میں یہی دعوت عمل دی تھی۔ جس پر عمل پیرا ہو کر آج کم و بیش چودہ سو سال تک اہل اللّٰہ نے اسلام کو صرف زندہ ہی نہیں رکھا بلکہ دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچا بھی دیا ہے۔ والسّلام علیٰ منِ اتّبع الھُدیٰ۔

پیش لفظ

تصوّف کے بارے میں اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ اور آئندہ بھی یہ سلسلہ بدستور جاری رہے گا۔ کیونکہ جب تک تصوّف کے ماننے والے اور اس کا انکار کرنے والے اس جہان میں موجود ہیں اس پر بحث و تمحیص ہوتی رہے گی اور اس بارے میں نئے نئے نکات پیدا ہوتے رہیں گے ۔ مگر آج جس انداز میں بحث ہو رہی ہے ۔ وہ کل گذشتہ سے بالکل مختلف ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ کل جو کچھ لکھا گیا تھا اس میں مخالفت کے باوجود نیک نیّتی کو بہت زیادہ دخل ہوتا تھا ۔ اگر کوئی اُن کی تسلّی کر دیتا یا وہ کسی حقیقت پر خود بخود مطمئن ہو جاتے تو وہ مخالفت ترک کر کے موافقت پر رجوع فرما لیتے ۔ لیکن آج علم و فضل کا دعوےٰ مقدّم ہے ۔ مخالفت میں جب بھی قدم اٹھایا جائے گا ، اس کی غایتِ اولیٰ دوسروں پر اپنے علم و فضل کا سکّہ بٹھانا اور اپنی اپنی علمی فضیلت سے مرعوب کرنا مطلوب ہوگا ۔ انہیں اپنے قول و فعل اور دلائل سے لاکھ قائل کرنے کی کوشش کی جائے ، وہی "میں نہ مانوں" کی ایک ہی رٹ ہوگی ،

بحث کا یہ انداز مغربی تعلیم کا نتیجہ ہے ، کیونکہ نہ جاننے کے باوجود بھی انہیں دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں ۔ اور تعلیم کے دوران میں یہ بات اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دی جاتی ہے کہ مسلمانوں کا تمام تر علمی سرمایہ یورپ کے مقابلہ میں ، ہیچ اور بیکار ہے ۔ اس میں شکوک و اوہام کے سوا کیا دھرا ہے ۔ اس کا نظام فرسودہ ہے جو علمی معیار پر پورا نہیں اُترتا ۔ چونکہ ہمارے تمدّن کی اساس روحانیت پر ہے ۔ اس لئے وہ ساحرِ مغرب کی افسوں طرازیوں سے مسحور ہو کر اس کے سرے سے منکر ہی ہو گئے ہیں ۔ تصوّف کی اساس ، اس کا نظام ، اس کا طریقِ کار ، اس کا محورِ عمل اور اس کے اذکار و افکار روحانیت سے الگ کچھ بھی نہیں ہیں ، اور وہ سراپا روحانیت ہی ہے ۔ اس لئے وہ ان سب سے انکار کر کے تصوّف کے سب سے بڑے معترض بن گئے ہیں ۔ اکبر مرحوم نے سچ کہا ہے ۔

مسٹر کو دیکھتا ہوں تصوّف پہ معترض ٭ کالج کے کیڑے پڑ گئے دلقِ فقیر میں

آج تصوّف کے بہت دوست اور موافقین اور بہت سے دشمن اور معاندین بھی ہیں ۔ ایک جماعت اس کو شریعتِ اسلام سے کوئی الگ نظام کہہ رہی ہے تو دوسری جماعت اس میں اور شریعتِ اسلامی میں سرِ مو

کا فرق نہیں باقی، اور اسی لئے اس کو اسلام کے مطابق سمجھتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ فقرِ محمدی کا ہی دوسرا نام تصوّف ہے اس لئے اگر صُوفی کو سچی درویشی کی تلاش ہے تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ سرکارِ دوجہاں محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی فقیری اور درویشی اختیار کرے۔ اور لفظاً و معناً ان کا ہی پیرو ہو جائے۔ اور یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر گامزن ہوئے بغیر وہ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

صُوفیائے متقدّمین کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔ اُن پر ایک نظر ڈال لینے سے جو بات بہت نمایاں نظر آتی ہے اور جو اُنہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ تقلید و اتباعِ سنّتِ نبوی ہے۔ وہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے سوچتے کہ اس وقت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے کیا کیا تھا۔ پھر جب انہیں رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا عمل معلوم ہو جاتا تو وہ اس سے سرِمُو انحراف نہ کرتے۔ ان کی زندگی کی ہر نقل و حرکت اور خاص کر اُن کے اخلاق پاک رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے رنگ میں ڈوبے ہُوئے نظر آتے ہیں۔ وہ آپ کو اپنا امام و پیشوا سمجھتے ہیں۔ اور آپ ہی سے پیوندِ محبت مستحکم کرتے ہیں۔ وہ آپ کا اسمِ پاک سُن کر بے چین ہو جاتے ہیں۔ اُن کے دل و دماغ اور ان کی آنکھوں میں حضوؐر ہی کی صُورت پھرتی ہے۔ زبان آپ کے ذکر کے ایسے مزے لیتی ہے کہ گویا ان کی بنیاد کار حُبِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی ہے۔ صُوفی بننے اور فقر کے میدان میں قدم رکھنے کے امکانات اسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں۔ جب ممنوعات سے بچنے اور تعمیل احکامِ الٰہی کی قدرت حاصل ہو جائے۔ اسکی پہلی منزل یہ ہے۔ کہ طالب اپنے دل کو گناہ کے خیال سے اس طرح محفوظ رکھے جس طرح متقی اپنے جسم کو گناہوں سے پاک و صاف رکھتا ہے۔ گویا فقیر یا صُوفی کے دل میں اللہ تعالےٰ کی مرضی کے خلاف کسی خطرہ کا گذر نہیں ہوتا۔ اسے اس بات کی شرم ہوتی ہے۔ کہ خداوندِ عالم جلّ وعلا شانہٗ کی دوستی کا مدّعی ہو اور کسی غیر خدا کو دل میں جگہ دے۔ یہ پہلا قدم ہے اگر اسکی توفیق بھی حاصل نہ ہو تو کہاں کی درویشی اور کیسا تصوّف ؟

اس کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے کہ طالب کے دل میں خدا کی محبت اس قدر غالب ہو کہ دنیا و مافیہا کی ہر بات اس کے مقابل میں محو ہو جائے۔ دل اور دل کی ہر خواہش اس معبودِ حقیقی کے لئے وقف ہو۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ تو پھر وہ قرآنِ کریم کے ذوق سے مست اور اس کی ہر آواز پر وجد کرے گا۔ اور جب وہ اس کی تلاوت کرے گا۔ تو اللہ تعالےٰ کے انوار و تجلّیات سے اسکا دل منوّر ہو جائیگا

یہ ایک سچے درویش (صوفی) کی پہچان ہے اور تصوف ان ہی باتوں کا حامل ہے - اگر جاہل لوگوں نے اس میں آمیزش کر کے اسکا ڈھانچہ بدل دیا ہے تو اسمیں تصوف یا سچے صوفیاء کا کیا قصور کیونکہ صاف اور پاکیزہ پانی وہاں تک ہے جہاں سے چشمہ پھوٹتا ہے پھر وہ جیسی زمین سے گزریگا ویسی اس میں رنگ آمیزی ہوتی جائیگی اسلئے معاندین کو تصوف پر خامہ فرسائی کرنیسے پہلے متقدمین کے حالات کا جائزہ لینا چاہئے - تاکہ ان پر تصوف کی حقیقت منکشف ہو اور اسکی اصل سے واقف ہو سکیں - تصوف کی ماہیت و اصلیت پر بحث کرنا درحقیقت صاحبِ دل لوگوں کا کام ہے کیونکہ اس میں اکثر کیفیتوں کا تعلق وارداتِ قلبی کے ساتھ ہوتا ہے جو لوگ تزکیہ نفس اور ریاضت و عبادت کے ذوق و شوق کے بغیر تصوف کی حقیقت کو دریافت کرنا چاہتے ہیں - وہ اس اندھے کی طرح ہوتے ہیں جو کورچشمی کے باوجود آئینے میں اپنے خد و خال دیکھنے کا متمنی ہو - یہی وجہ ہے کہ تصوف کے معاندین جب اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو بصیرت نہ رکھنے کی بنا پر قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں اور نہایت مضحکہ خیز غلطیاں کرتے ہیں -

تصوف کے معاندین نے جو بے تعلقی کا لبادہ اوڑھ کر گذشتہ دور فتن میں لکھا ہے - اس کے لئے وقت کا تقاضا تھا کہ کوئی صاحبِ دل بزرگ اُن کے اعتراضات کا مسکت جواب دیتا - چنانچہ میرے مخدوم و محترم حضرت قدوۃ السالکین مولانا الحاج صوفی ابو الفیض قلندر علی صاحب قبلہ سہروردی مدظلہٗ نے اس جانب توجہ فرمائی اور اس موضوع پر قلم اٹھایا - حق تو یہ ہے کہ یہ آپ ہی کا حصہ ہے - کیونکہ علم و فضل کے ساتھ ساتھ آپ صاحب سجادہ و تقوٰے بھی ہیں اور تصوف و درویشی کی انتہائی منازل پر عبور بھی رکھتے ہیں - گویا آپ کی ذات گرامی شریعت و تصوف اور علم و عمل کا سنگم ہے - اس لئے اس نیک کام کے لئے آپ سے زیادہ اور کون موزون ہو سکتا ہے -

آپ نے نہایت سیدھے سادھے مگر دل نشین انداز میں کہ تصوف کیا ہے؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اس کا اسلام کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ صوفی کسے کہتے ہیں؟ صوفیانہ اخلاق و اعمال کیا ہیں؟ صوفیائے نے اسلام کی خدمت کس کس رنگ میں کی ہے؟ اور مسلمان بحیثیت قوم تصوف اور اربابِ تصوف سے کس حد تک متاثر ہوئے ہیں؟ اسلامی تصوف اور غیر اسلامی تصوف کا کیا فرق ہے؟ معترضین تصوف کی یاوہ گوئی، وغیرہ وغیرہ کے موضوعات پر بحث کی ہے - اور لطف یہ ہے کہ آپ نے اپنے سارے استدلال کی عمارت قرآنِ کریم کی آیات اور احادیث نبوی علیہ السّلام پر رکھی ہے اور اپنے دامن کو اِدھر اُدھر کے غیر مستند اقوال سے آلودہ نہیں ہونے دیا - اور نہ ہی بحث میں ذاتی جذبات کو

کو جگہ دی ہے۔

کتاب "اَلفَقرُ فَخرِی" اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ تاکہ تصوّف کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں اُن سے اربابِ تصوّف اثر پذیر نہ ہوں۔ اور وہ فرائض جو بہت حد تک صوفیاءِ کرام نے ادا کئے ہیں وہ معاندین کی رقیبانہ در اندازیوں سے پریشان ہوئے بغیر برابر ادا کرتے چلے جائیں۔ کیونکہ زمانے کے حالات اس امر کے متقضی ہیں کہ سلف صالحین کی طرح دورِ حاضر کے متصوفین جبر سے فریضۂ تبلیغ کے لئے آمادہ ہوں۔ غیر مسلموں کو اسلام سے اور مسلمانوں کو اسلامی اخلاق اور طریق کار سے آشنا کریں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی عملی زندگی میں یہ دونوں فرض ادا کئے ہیں۔ بحثوں میں پڑنا، قیل و قال میں الجھنا اور مناظروں کے تکلّفات سے آلودہ ہونا، صوفیانہ نظامِ زندگی کے بالکل خلاف ہے۔ انہوں نے جو کیا وہ عمل کی معجزانہ قوّت سے کیا اور آج بھی جو ہوگا اسی قوّت سے ہوگا۔ آج اسی قوّت کی ضرورت ہے۔ اور زمانہ اسی کے لئے چشم براہ ہے۔

محمد علم الدّین سالک

ایم۔ اے

انتساب

فقیر اس حقیر تصنیف کو پیشوائے اولی الالباب، حافظ اوضاح شرح والکتاب، واقفِ اسرارِ احدیت، کاشفِ انوارِ صمدیت، مقیم خیام جلال علیم حجاب جمال، حضرت خواجہ میاں غلام محمدؒ رحمۃ اللہ علیہ مہروی حیات گڑھی گجراتی کے اسم گرامی سے معنون کرتا ہے جن کی ذات ستودہ صفات کے فیضِ باطنی سے سینکڑوں دل تشنہ کامانِ شرابِ معرفت اور ہزاروں متلاشیانِ نورِ ہدایت کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔

اشارہ

زندۂ جاوید ہو جاتا ہے وُہ مردِ خُدا
مُوتُوا قبلَ اَن تمُوتُوا کو جو سمجھے زندگی

حمد

قابلِ حمد و ستائش وہ معبودِ مُطلق و محمُودِ برحق ہے جس نے ہر زوال و نقص سے پاک اور مثال و شرکت سے مبرا ہوتے ہوُئے اس ظالم و جاہل خاکی پُتلے کو اعتبارِ ہستی بخشا اور اَلْاِنْسَانُ سِرِّیْ وَاَنَا سِرُّہٗ کے شرف و مجد سے نواز کر عقل و خرد کی روشنی عطا فرمائی۔ مگر اِسکی چشمِ سر ہمیشہ اُس کے مشاہدہ جمال میں خیرہ اور دیدہ تر ملاحظہ کمال میں تیرہ رہی۔ پھر صراطِ مستقیم کی کھُلی راہیں متعیّن فرما کر نہ صرف پہچان کی صلاحیت ہی مرحمت فرمائی بلکہ لکھوکھا انبیاء و مرسلین کو مبعوث فرما کر اس پر چلنے کی تمام آسانیاں اور سہُولتیں بھی بہم پہنچا دیں۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ ط

نعت

بے شمار درُود و سلام اُس ہادیٔ سُبُل، ختمِ رُسل، مولائے کُل محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ہو جنہوں نے خاتم الانبیاء مبعوث ہو کر یقین و حق الیقین کی محفل کے متلاشیوں کو ضیاءِ ایمان و نورِ القان بخشا اور اللہ کریم کے آخری پیغام کے ذریعہ خلقتِ انسان کا حقیقی مقصد و تحقیقی راستہ ایسا صاف و غیر مشتبہ طریق پر سمجھایا کہ جس کے بعد کسی کو حجتِ انکار باقی نہ رہی، ہر سرکش و متمرد انسان کو راہ کے کامل ہونے کا یقین اور ہر سعید روح کو حصولِ معرفت الٰہی میں کمالِ نورِ دین حاصل ہو گیا۔ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ

اِلتجائے فقیر

توبعلمِ ازل مرا دیدی

دیدی آنگہ بعیب بخریدی

توبعلمِ آں ومن بعیب ہماں

رد مکن آنچہ خود پسندیدی

الفقر فخری

کیوں کریں فریاد جب، رکھتے نہیں فریاد رس
دم بخود ہیں اپنے عالم میں اسیرانِ قفس
ساز برگِ کارواں ہے اور نہ آوازِ جرس
اپنا مسلک ہے فقط اللہ بس باقی ہوس

رات دن کرتے رہے ہیں نفس کی قربانیاں
مخبرِ الفقر فخری ہیں یہ سب بے سامانیاں

بائے استبرق و قاقم سے ہم کو کام کیا
ساغرِ جمشید کیا اور بادۂ گلفام کیا
داستانِ شکوہ ہائے گردشِ ایام کیا
رات دن یکساں ہیں ہم کو صبح کیا اور شام کیا

چشمِ عبرت میں ہمیشہ سے یہ دونوں رنگ ہیں
دل کے پردے اس نوا سے سازِ ہم آہنگ ہیں

بے بقا ہے جب تو یہ انشا غلط، دفتر غلط
نظمِ سیار و ثوابت صورتِ محور غلط
جلوۂ مہرِ مُبین و تابشِ اختر غلط
نقطہ نُقطہ فردِ ہستی کا ہے سرتا سر غلط

اس نمودِ بے بقا سے کسبِ عبرت کیجئے
عالمِ کثرت میں رہ کر درسِ وحدت لیجئے

وہم باطل کارِ عقلِ تفرقہ پرداز ہے
دل پہ قبضہ ہو جسے وہ مایۂ صد ناز ہے
سازِ نیرنگِ جہاں بھی دیکھئے کیا ساز ہے
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

نور پیدا ہو رہے ہیں ایک ہی تنویر سے
اتنی تصویریں کھنچی ہیں ایک ہی تصویر سے

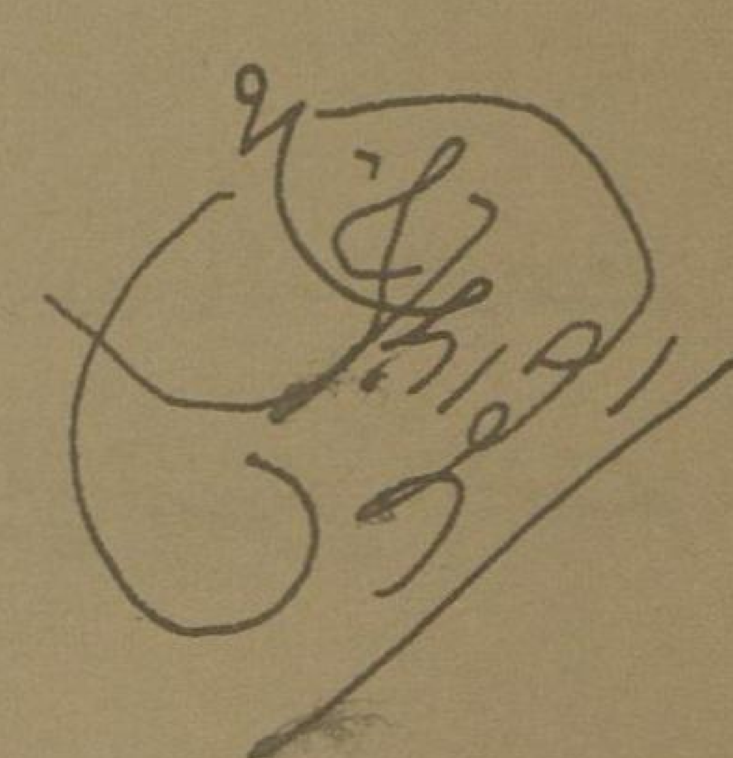
عیشِ فانی کا تصوّر لغو ہے، بیہودہ ہے　　حُبِّ دُنیا سے دلِ غم آشنا آسودہ ہے
اِک حصیرِ فقر ہے وہ بھی غبار آلودہ ہے　　صبرِ ایّوبیؑ ہمارا شیوۂ فرسودہ ہے

دردِ دل را میکنم با ضبط پیوندے دگر
بر طبیبِ خود تغافل میزنم چندے دگر

ہم کو اُس سے کیا غرض ہو قصرِ گردوں کا جواب　　نقش ہے جس پر لِدُوا لِلْمَوْتِ وَابْنُوا لِلْخَرَاب
ہم جہاں ہیں وہ زمیں ہے رشکِ صد آفتاب　　ذرّہ ذرّہ ہے ہماری خاک کا حکمت مآب

بارگاہِ حق میں ہیں حاضر ہمیشہ دِل بکف
خاک کے پُتلے ہیں ہم اور نُوریوں پر ہے شرف





شکرِ نعمت

شکرِ نعمت ہائے تو چندانکہ نعمت ہائے تو
عُذرِ تقصیراتِ ما چندانکہ تقصیراتِ ما

انسانِ خاکی کی خاک کا ہر ہر ذرّہ اور اس کے مرکّب جسم کے خون کا ہر ہر قطرہ پروردگارِ عالم کی بیشمار احسانمندیوں اور رحمتوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اور ہر مسلمان پر سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ اس کو ایمان و ایقان اور دین و قرآن کی دولت سے سرفراز فرمایا گیا اور اپنے حبیبِ پاک صاحبِ لولاک سیّد المرسلین، رحمۃ اللعالمین، سرورِ کائنات، مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے غلاموں اور فرماں برداروں میں پیدا کیا۔ یہ وہ عزت افزائی اور سرفرازی ہے جس کے سامنے ہر نعمت ہیچ ہے۔ اور جس قدر بھی شکر اس نعمت کا ادا کیا جائے کم ہے۔ حقیقتاً انسان شکر گذاری کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو نہیں سکتا۔ اور اس شکر گذاری کی پہلی کڑی اُن بزرگانِ دین کا بھی شکر ادا کرنا ہے۔ جن کے ذریعہ سے یہ دولت ہمیں نصیب ہوئی۔ کیونکہ حضور پُرنور شافع یوم النشور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ مَن لَّم یَشکُرِ النَّاسَ لَم یَشکُرِ اللّٰہِ یعنی جو انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ خدا کا شکر گذار بھی نہیں ہوسکتا۔

ان بزرگانِ دین کے اس احسانِ عظیم کا حقیقی شکر تو یہ ہے کہ ہم اُن کے نقشِ قدم پر چلیں اور جو جدوجہد انہوں نے دین کے تحفّظ و بقا کے لئے میدانِ تبلیغ میں کی ہے۔ اس میں ان کے شریکِ کار و حال بنیں۔ اور وہی دولتِ ایمان و ایقان و دین و قرآن جو اُن کی پاک جوانیوں اور مقدّس نفوس کے صدقہ میں ہم تک پہنچی ہے۔ ہم بھی دوسروں تک پہنچانے کی کامل سعی کریں۔ اور ادنیٰ درجہ کی شکر گذاری یہ ہے۔ کہ اپنے آپ میں بصورتِ عمل ان کے ناموں اور کارناموں کو روشن رکھیں۔

جب شریعتِ مطہرہ میں جسمانی انساب کے بقا و تحفّظ کی نہایت تاکید فرمائی گئی ہے۔ تو مقصدِ حیات یعنی روحانی سلسلہ کا بقا اور تحفّظ بھی یقیناً ضروری و لابدی ہے۔

جن نفوسِ قدسیہ نے اپنے انفاسِ طیّبہ کو رضا الٰہی سے سرشار کیا۔ بلاشبہ اُن کے متبرک ناموں کا ورد اور اُن کی

مقدس زندگیوں کا تذکرہ خوشنودئ خداوندی کا سبب اور ایمان کی تازگی کا موجب ہوگا۔ لہٰذا اُن کے اسماءِ گرامی کی برکات سے بہرہ ور ہوکر ایک بے پناہ خیر اور بہت بڑی سعادت کا شکر ادا کرنا ہمارا فرض ہے۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

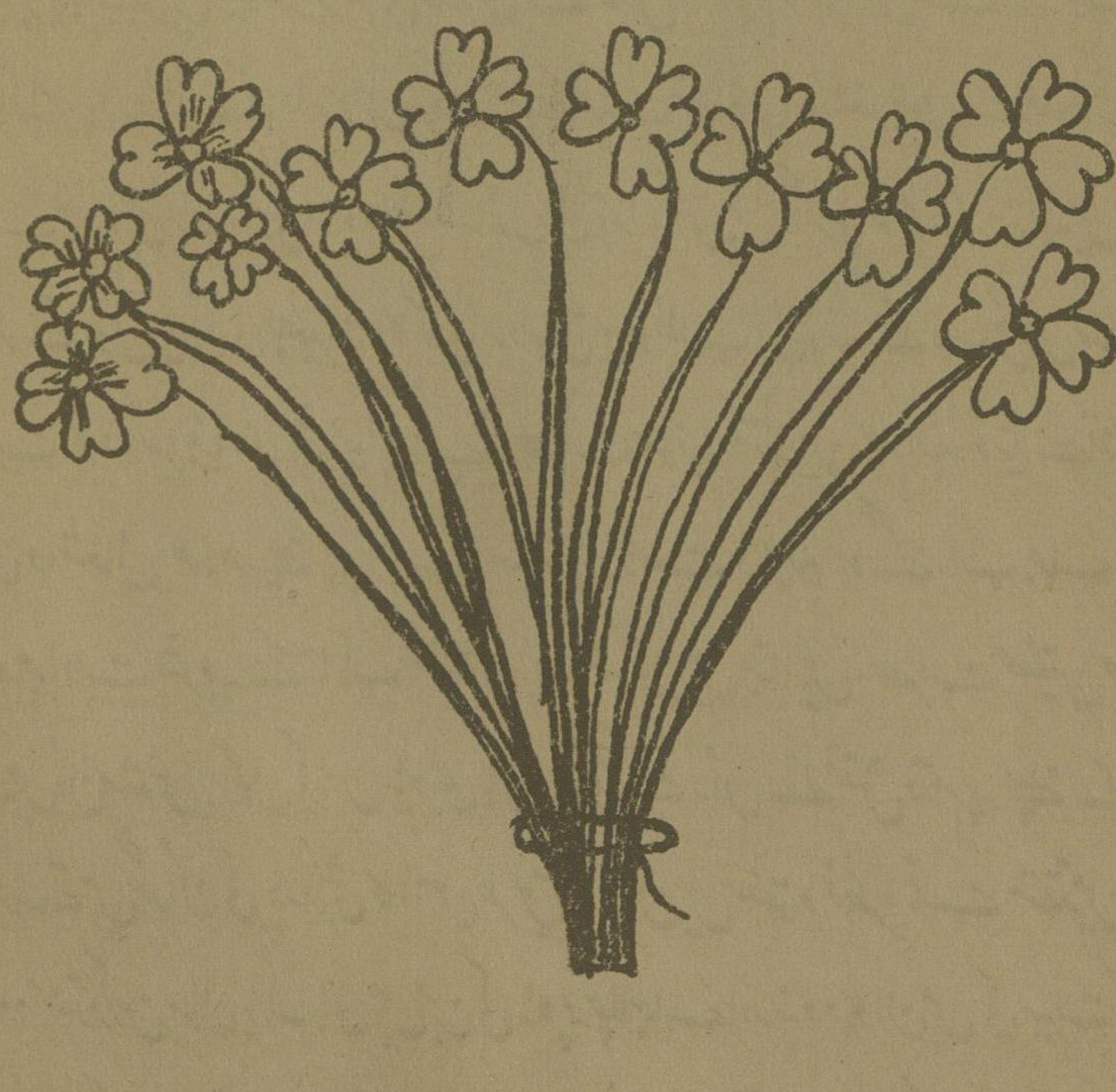


سببِ تالیفِ کتاب

یہ کتاب ساری کی ساری اُن نام نہاد درویشوں، جاہل صُوفیوں اور لنگوٹ بند ملنگوں کے لیئے معرضِ تحریر میں لائی جارہی ہے۔ جو امورِ تصوّف اور درویشی کی حقیقتوں سے ناواقف ہوتے ہُوئے فریبِ نفس میں اُلجھ کر ایک خودساختہ اور مبالغہ آمیز تصوّف کو جو شرک سے ڈانڈے ملا دینے والے تخیّل کا حامل ہو ایجاد کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ جس میں نہ حقیقی اعتدال ہوتا ہے اور نہ شرعی اعمال و اصطلاحات کے ساتھ اس کی کوئی حد ملتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بقول پیرِ رومی یہ لوگ خود نامرد اور مُردوں کے راہزن بن جاتے ہیں۔ کیونکہ غیر شرعی درویشی کے حامل معصُوم تو ہو نہیں سکتے اور بحیثیت بشر اُن سے معصیتوں کا صدور بھی ناممکن نہیں۔ بلکہ اس درویشی کے دائرہ میں رہ کر بھی وہ مختلف خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ نہیں ہوتے تو تصوّف کے عام مسائل میں ان کی رائے بھی وہی درجہ رکھیگی۔ جو عام انسانوں کی آرا رکھتی ہیں۔ اگرچہ عوام کے مقابلہ میں وہ اپنے فضائل وکمالات کا پلہ بھاری ہی گمان کرتے ہوں یا اُن کی بصیرت کا کوئی روحانی پہلو تقرب الی اللہ کے وسائل میں صاف بھی ہو۔

اس ضرورت کا دوسرا بنیادی پتھر یہ بھی ہے کہ حضرات صوفیاءِ متقدمین رحمہم اللہ دُنیا سے تشریف لے گئے۔ اور اُن کے اوضاع و اطوار، اعمال و اشغال، طور طریقے بھی ان کے ساتھ ہی رخصت و ناپید ہو گئے۔ اب بجائے اُن کے جو لوگ ہیں اور اُن کی نیابت کے مدعی وہ عبادات شرعیہ کے تارک غفلتوں اور شہوتوں میں مبتلا ہیں۔ حضرات محققین صوفیاء کے اُٹھ جانے کے بعد آج ہمارے زمانے میں اُن مقدس بزرگوں کی بس یاد ہی باقی رہ گئی ہے۔ اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کے دعویدار اُن کے وظائف و اعمال کو تو فخریہ ذکر کرتے ہیں مگر اُن کی درویشی کا اصل طریقِ کار ان میں مفقود نظر آتا ہے۔ متقدمین کے میدانِ طریقت میں ایک لاعلاج سناٹا چھا گیا ہے۔ نہ وہ معمر و کہن سال بزرگ باقی ہیں جن کی راہ پر چلا جائے اور نہ وہ جوان جن کی سیرت کو مشعلِ راہ سمجھا جائے۔ زہد و تقویٰ کی ساری بساط اُلٹ کر حرص و طمع کا دَور دورہ ہو رہا ہے۔ شریعتِ غرّا کا احترام تک دلوں سے مٹ گیا ہے۔ اور دین کی طرف سے بے پرواہی قطعی آسان ہو گئی ہے۔ احکام کی عظمت نہیں رہی اور عبادات شرعیہ نماز روزہ کی بے وقعتی دلوں میں گھر کر چکی ہے۔

جب ان مدعیان فقرہی کی اخلاقی پستی حد سے گزر جائے تو عبادت وطاعت میں انہماک رکھنے والے کیونکر اور کہاں سے پیدا ہوں گے یہی لوگ اگر شریعت کی پیروی کی بجائے اس کی خلاف ورزی کو باعثِ فخر سمجھنا شروع کر دیں۔ اور روح کے تزکیہ سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھیں تو فقر محمدی علیہ الصلوات والتسلیمات کی تلاش کہاں سے کی جائیگی۔ پھر طرہ یہ کہ سرتا پا غلبۂ نفسانیت میں مغلوب ہوتے ہوئے اور مادی حرکتوں کے باوجود بھی ان کا دعویٰ وہی مشیخیت اور روحانیت کا قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہی حضرات کی اس روش سے مخالفین کو حقیقت تصوف سے انکار اور منکرین کو مسلکِ حقیقت پر اعتراضات کے مواقع کثرت سے ملنے لگے ہیں۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوا، کہ اس جماعت کے سامنے ایک ایسی کتاب پیش کی جائے، جو حضرات فقراء وصوفیائے متقدمینؒ کے صحیح اخلاق واعمال اور عقائد و معلومات کی مرقع ہو۔ تاکہ خود ساختہ صوفیوں اور اُن کے گھڑے ہوئے تصوف کے نقوش کی اصلاح ہو سکے۔ وباللہ التوفیق۔



عرضِ حال

فقیر ابوالفیض قلندر علی سہروردی کوٹلوی سیالکوٹی ثم لاہوری یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وجود ہائے باجود اولیائے کرام و بزرگانِ عظام وصلحائے انامِ اہلِ جہان کے لئے رب العزت جل شانہ کی نعمتِ عظمیٰ وعنایتِ کبریٰ ہیں۔ کیونکہ ہمارے آقا و مولا مختارِ دوجہاں باعثِ تخلیق کون ومکان سیدِ انس وجان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری امت میں تیس ابدال ہیں۔ جن کے سبب سے زمین قائم ہے۔ اور انہی کے سبب و برکت سے لوگوں پر مینہ برسائے جاتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے مدد اور فتح پاتے ہیں۔ اور ان ہی کی وجہ سے رزق دیئے جاتے ہیں۔ پس جس شخص نے اس نعمت کی شکر گزاری سے منہ موڑا۔ اس نے بارگاہِ خداوند عالم کو چھوڑا۔ حقیقتاً افضل ترین عبادت اور موثر ترین اطاعت صحبتِ اہلِ کمال و مجالستِ مقربانِ بارگاہِ ذوالجلال ہی ہے۔ مقدونیہ کے زندۂ جاوید حکیم حضرت مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:۔ شعر

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء ۔۔۔ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

پس اگر کسی کو دولتِ صحبت و سعادتِ مجالست میسر نہ ہو تو ذکر اذکار و اتباع و آثار بزرگانِ دین بھی ایک طرح کی صحبت ہی ہے۔ کیونکہ ع "ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے"، ہمت افزائی اور ظلمت زدائی میں اسکی بھی وہی تاثیر ہے جو صحبت اور مجالست کی ہے۔ نیز بزرگانِ عظام کے تذکار میں بے شمار فوائد ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی کا ذکر دلیل محبت ہے اور محبت محب کو محبوب تک پہنچا دیتی ہے۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ دوسرے یہ کہ محبوبانِ بارگاہ کا ذکر بھی باعثِ تقرب الی اللہ ہے۔ کیونکہ محبوب کو ذکر اپنے محب کا مرغوب اور محب کو یاد اپنے محبوب کی محبوب ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ حسب ارشاد عِنْدَ ذِکْرِ الصّٰلِحِیْنَ تَنَزَّلُ الرَّحْمَۃُ موجبِ نزولِ رحمتِ باری ہے۔ حضرت بوعلی وقاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقبولانِ بارگاہ کا محض ذکر سننا بھی اگرچہ اس پر عمل نہ ہوسکے فائدہ سے خالی نہیں۔ اگر مرد طالب ہوگا تو اس ذکر سے ہمت اس کی بلند ہوگی اور طلب اس کی بڑھے گی اور اگر اس میں رعونت ہوگی تو وہ ٹوٹ جائے گی

یہاں تک کہ اس کو اپنا نیک و بد نظر آنے لگے گا۔ اور اگر وہ کور باطن نہ ہوگا تو خود مشاہدہ کرے گا۔ چنانچہ حضرت شیخ محفوظ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں لَا تَزِنِ الْخَلْقَ بِمِیْزَانِکَ وَزِنْ نَفْسَکَ بِمِیْزَانِ الْمُوْقِنِیْنَ لِتَعْلَمَ فَضْلَھُمْ وَاَفْلَاسَکَ یعنی تو خلقِ خدا کو اپنے ترازو میں وزن نہ کر بلکہ اپنے آپ کو مردانِ خدا کے ترازو میں وزن کر تاکہ تو اُن کی فضیلت اور اپنے افلاس سے واقف ہو۔ کسی نے حضرت امام المتقین فخر الاولیاء و سید الطائفہ حضرت ابوالقاسم جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کسی ارادتمند کو بغیر عمل کے محض بزرگانِ سلسلہ کے روایات و حکایات سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ یہ ایک لشکر اللہ تعالیٰ کے لشکروں سے ہے۔ اس سے مرید کو مدد پہنچتی ہے۔ اور اس کی دل شکستگی دلجمعی سے بدل جاتی ہے اس کا ضعف قلب دور ہو کر دل یادِ الٰہی میں قوی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ۔ یعنی اے محبوب ہم اگلے پیغمبروں کے قصے آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ تاکہ آپ کا دل اس سے ثبت دوام اور مکمل آرام حاصل کرے۔ اور قوی ہو جائے۔ اس کے ماتحت مولینا جلال الدین رومیؒ مثنوی میں فرماتے ہیں:۔

ذکرِ نیکو رفتگاں دارد ثواب ‏ عاصیاں را مے رہاند از عذاب
چوں بہ نیکو رفتگاں در ساختم ‏ ہمنشینانِ ملائک یافتم
ہر کرا باشد محبت با خدا ‏ کے بداند واصلانش را جدا
اولیاء اللہ ، اللہ اولیاء ‏ ہیچ فرق درمیاں نبود روا
ذکرِ ایشاں ذکرِ آں یزداں بود ‏ یادِ نیکاں یادِ آں سبحاں بود

پس جب سے یہ عاجز سلسلہ ارادت و سعادت بیعت حضرت ولائت منزلت قیوم زماں واقف اسرار ذات صمد مولنا الحاج قبلہ میاں غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ سہروردی میں داخل ہوا۔ ہمیشہ یہی خیال رہا۔ کہ کچھ حال خیر مآل مقبولانِ ذوالجلال کا اس طرح تحریر میں لائے کہ آئندہ آنے والی جماعت متلاشیانِ حق کو راہِ حق و متجستان فقر ادق کو منزلِ فقر واضح تر ہو جائے کیونکہ صوفیائے کرام کے خصائص و معارف و حقائق و لطائف کا جس قدر ذخیرہ آج ہمارے سامنے ہے۔ اس سے عوام دو وجہ سے فائدہ اٹھانے سے قاصر ہیں۔ ایک یہ کہ عربی فارسی زبان میں جو اس ذکرِ خیر کا مجموعہ ہے۔ اس سے موجودہ دور کے عربی فارسی سے ناواقف حضرات بالکلیہ محروم رہتے ہیں۔ دوسرے اردو تراجم جن میں بڑا ستم یہ ہے کہ بعض مترجم

حضرات خود اصطلاحاتِ تصوف و مقاماتِ فقر سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے بغیر صحیح مفہوم ادا کئے کے بڑے آرام سے وہی الفاظ تراجم میں بھی چپکا دیتے ہیں۔ جو اصل متن عربی و فارسی میں دقیق ہوتے ہیں اور جن کے مطالب بیان کرنے کے لئے ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی یا زحمت اٹھانی پڑی تھی۔

مگر فقیر کو ہمیشہ اپنی بے بضاعتی و بے سروسامانی اور بے مائگی و ہیچمدانی مانع و مزاحم رہی۔ کہ کیونکر اپنی علمی و عملی کمزوری کے ماتحت اس میدانِ عرفان میں قلم اٹھانے کی جرأت کرے۔ یہاں تک کہ ۱۳۷۰ھ ہجری المقدس آگیا۔ اور یہ مسئلہ لازم فی الذہن ہی رہا۔ ایک روز عالی جناب قبلہ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔ تو حضور نے فرمایا کہ فی زمانہ بہت سے جاہل درویش اور نام نہاد فقیر شرعی تصوف و احسان اور کشف و عرفان کے خلاف کلام کرتے ہیں۔ اور راہبانِ ہند کی تعلیم اور لنگوٹ بندی و بھنگ نوشی کی تفہیم نے ان کو اصل معارف و آیات فقر سے قطعاً دور پھینک دیا ہے اور وہ اپنے خود ساختہ فقر اور خود کاشتہ حصر پر عوام کو فریب دے کر گمراہ کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر کچھ لکھنا چاہئے تاکہ اس فتنہ کا سدِ باب ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ طالبانِ حق اس وقت ایک ایسی عام فہم اور مستند کتاب کے خواہشمند بھی ہیں جس میں غلط تعلیم و تربیت سے پاک اور رہبانیت کی آمیزش سے صاف صحیح اسلامی طریقت کو پیش کیا گیا ہو۔ اور وہ مسائل فقر جو مخلوط ہو کر جوگ و اشراق کے معتقدات سے قریب ہو گئے ہیں۔ مفصل بحث کے ماتحت بالکل روشن اور واضح تر ہو جائیں۔ گویا حضور نے بھی وہی امر فرمایا جو پہلے فقیر کے اپنے ذہن میں تھا۔ اور اس امر کے پورا کرنے پر مستقیم ہونے کے ہدایت فرمائی۔ پھر تو اپنا پرانا خیال تازہ ہو گیا۔ اور وہ تساہل و تردد جو پہلے تھا، رفع ہو کر ارادہ میں دوبارہ استحکام کی صورت پیدا ہو گئی۔ فقیر نے صدقِ ہمت اور خلوص نیت سے اس ارشاد کے پورا کرنے میں قلم اٹھایا۔ اور اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ پر نظر رکھتے ہوئے لکھنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ بتائیدِ ربانی یہ اوراق پریشان محبانِ فقر و فقرا اور خادمانِ اولیاء اللہ کے ہاتھوں میں ہیں۔ مولا کریم قبول فرمائیں اور طالبین حق کثیر فوائد حاصل کریں۔ لہٰذا قارئینِ کرام سے یہ استدعا ہے کہ جب اولیاء کرام کے پاکیزہ نفوس کی برکات اور اُن کے مقدس ارواح کی حسنات سے ان کا وقت خوش ہو۔ تو ان اوراق کے مؤلف کو بھی دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔ بَارَكَ اللّٰهُ لَنَا فِيْ دِيْنِنَا وَدُنْيَانَا۔

تمہید

کہا جاتا ہے۔ کہ یہ زمانہ الحاد و زندقہ و دہریت و مادہ پرستی کا ہے جس میں روحانیت اور متصوفیت سے بعد المشرقین ہے۔ دورِ حاضرہ کے ترقی یافتہ انسانوں کے نقطۂ نظر میں کسی تعلیم کے روحانی اثر کا قائل ہونا ایک بے دلیل بات اور لغو عقیدہ ہے۔ روحانی کمالات اور روحانی قوتوں کو تسلیم کرنا پُرانے زمانہ کے احمقوں کا ایک بے معنی تخیل ہے۔ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ دُنیا جس قدر مادیت میں ترقی کرتی اور عقولی نظریات و محسوسات کے پھندوں میں پھنستی جارہی ہے۔ وہ اسی برق رفتاری کے ساتھ تصوّف و روحانیت کی طرف بھی آرہی ہے وہ منبع جس سے مذکورہ بالا قبیح خیالات پھُوٹ پھُوٹ کر نکلے تھے۔ اُسی سے اب روحانی اثر کی آوازیں بھی نکل رہی ہیں۔ گو ابھی تک وہ نہایت مدھم ہیں۔ مگر سننے والے انہیں سن رہے ہیں اور محسوس کرنے والے انہیں محسوس بھی کر رہے ہیں۔ کہ اہلِ دنیا کی یہی مادی ترقی روحانی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے۔ اور انسانوں کو مادیت سے بیزار کر کے انہیں روحانیت سے سکون حاصل کرنے کی جانب راہ نمائی کر رہی ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ کہ خدا طلبی اور خدارسی کا اوّلین ذریعۂ کتاب و سنّت ہے اور قرآنِ کریم نے بتلایا ہے۔ کہ انسانی زندگی کی غرض و غایت صرف عبادتِ الٰہی ہے۔ پھر عبادت کے لئے تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کی سخت ضرورت ہے اور تصفیۂ قلب و تزکیۂ نفس ہی تصوّف کی اساس ہیں۔ پھر تصوّف کے لئے فقہ کی احتیاج ہے۔ جس طرح شرع شریف کے مطابق عمل کرنے کے لئے فقہائے قرآن و حدیث کے مسائل کو استنباط کر کے فقہ کی صورت میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے اسی طرح صوفیائے کرام اور اولیائے عظام نے بھی تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کے اصول و قوانین کو شرع شریف سے استخراج کر کے یک جا منضبط فرما دیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عوام کیلئے خدا طلبی اور خدارسی کی راہ آسان ہو جائے۔ لیکن پھر بھی دنیا کی کثافتوں اور نجاستوں سے پاکیزگی حاصل کرنے، نفس و شیطان کے شر سے محفوظ رہنے اور خدا کی بارگاہ تک پہنچنے کیلئے کسی رہبر کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ کیونکہ بغیر نورِ اتباعِ رسول علیہ السلام اور بغیر ضیائے اولیاء کرام کے اس راہ پر

چلنا دشوار ہے اس لئے کہ راہ حقیقی محبوب اور آسان ہے ۔اتنی ہی پیچ در پیچ اور پرخطر بھی ہے ۔ شعر

ہے وادئ عشق بھی کیا وادی گلزار بھی ہے پُرخار بھی ہے   اس وادی کا طے کر لینا آسان بھی ہے دشوار بھی ہے

اس راہ کے چلنے والوں کے شیاطین ۔جن و انس اس قدر دشمن ہیں کہ بے نور ولایت متلاشیٔ حق کا ایک قدم بھی چلنا محال ترین امر ہے جسب ارشاد حضور سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کولا سنتان هلك النعمان ۔یعنی حضرت سیدنا امام اعظم آخر عمر میں حضرت سیدنا امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت وارادت میں رہے اور دو سال فیض باطنی کا حصہ پایا ۔تو فرمایا اگر یہ دو سال نعمان کی عمر میں نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہو جاتا ۔گویا راہنمائی شیخ کامل ہی ایک وہ چیز ہے ۔جس کی طفیل گمراہی وضلالت کا مطلقاً خوف نہیں رہتا اور سالک راہ نہایت پُرامن طریق پر ہلاکت سے بچتا ہوا بے فکری کے ساتھ چل کر سلوک کی منزلیں طے کرتا ہے اور یہی وہ ضرورت ہے ، جس کے ماتحت اسلام میں پیری مریدی کا سلسلہ قائم ہوا ۔ چنانچہ نقشبندیہ سلسلہ کے ایک برگزیدہ بزرگ حضرت خواجہ محمد معصومؒ فرماتے ہیں :-

” کہ سیر وسلوک سے مقصود رسمی پیری مریدی نہیں ہے ۔ بلکہ اس سے مقصود ادائے وظائف بندگی اور نیستی وگمنامی اور زوال رعونت وانانیت نفس امارہ ہے کہ معرفت اسی سے وابستہ ہے ۔“

پس حقیقی پیر اور سچا شیخ وہ ہے جو مرید کو طریقت کی پہنائیوں میں لینے کے بعد اس میں ایک تغیر وانقلاب پیدا کر دے اور عملی قوائے کے ضعف واضمحلال کو دور کر کے اپنے ارادتمندیں وہ قوت پرواز بھر دے کہ اس کی روح تنازع وتنافس کے عرصۂ حیات سے آسائش گاہ حقیقی کی جانب پرواز کرنے لگ جائے ۔ اگر بیعت حاصل کرنے کے بعد مرید میں کوئی تغیر واقع نہ ہو اور اس کی قوت عمل تیز تر نہ ہو جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ایسی پیری مریدی محض ایک رسم پسندی کی چیز ہے ۔ اور دنیا میں اس کی غرض وغایت جلب منفعت کے مشغلہ کے سوائے اور کچھ نہیں ۔

آج کل چونکہ بکثرت مکار و دغاباز لوگ ولایت کے مدعی ہو کر سادہ لوح انسانوں کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالتے پھرتے ہیں اور عوام میں دینی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اس قدر صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اس قابل ہوں اور یہ دریافت کر سکیں کہ کون ان کی روحانی تشنگی کی تسکین کر سکتا ہے ۔ اور وہ کسے اپنی رہنمائی کے لئے شیخ کہہ سکتے ہیں ۔اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی واقفیت کیلئے ولایت کے چند آثار وخواص بیان کر دیئے جائیں ۔جن کے مطالعہ سے یہ پتہ چل جائے گا کہ حقیقتاً یہ آثار وخواص کسی غیر ولی کا حصہ نہیں ہو سکتے اور نہ ہی وہ کسی غیر ولی کی ذات میں جمع ہو سکتے ہیں ۔ ان میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر

ہیں :-

اعتماد علی اللہ ، تسلیم و رضا ، استغناء ، تمول و ناداری کی مساوات ، عدم و وجود کی یکسانیت ہمت و شجاعت ، شرافت و نجابت ، جرأت و استقامت ، عزت و حرمت - خودی و خودداری ، رعب و غلبہ ، غیرت و حمیت ، جود و سخا ، جذب قلوب ، تاثیر کلام ، برکت صحبت دلی آسودگی ، نفس و طبیعت کے ساتھ دائمی جہاد ، اور ماسوائے اللہ سے کلی انقطاع وغیرہ وغیرہ یہ حسنات صرف ایک مرشد کامل اور ولی حقیقی کا ہی سرمایہ حیات ہو سکتے ہیں - اور یہی وجہ ہے کہ پیر کا نہایت صالح ، پرہیزگار اور متبع سنت ہونا اس کی زندگی کا نمایاں پہلو ہوتا ہے - وہ گناہوں سے پاک اور بدعتوں سے منزہ ہوتا ہے - ان شاہبازانِ طریقت کے یہ اوصاف تصوف کی ہر کتاب میں مذکور ہیں - چنانچہ حضرت قبلہ شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے مریدوں کی تربیت دودھ پلانے والی عورت سے سیکھی ہے - اگر وہ ناخوردنی اشیاء سے پرہیز کرے گی تو اس کے بچے کی صحت بھی اچھی رہے گی - اور پاکیزہ دودھ اس کے پیٹ میں جائے گا - ورنہ بصورت دیگر تمام خراب چیزیں دودھ میں اثر کر کے بچے کی صحت پر بری طرح اثر انداز ہوں گی اور وہ توانا و تندرست نہ رہ سکے گا - یہی حال پیر طریقت کا ہے اگر پیر خود افعالِ شنیعہ اور اعمال قبیحہ کا مرتکب ہوگا - تو مرید بھی یقیناً اس کے اتباع میں گناہوں پر زیادہ جری اور دلیر ہو جائے گا - لہٰذا مرید کو صالح اور پرہیزگار بنانے کے لئے اشد ضروری ہے کہ پیر خود صالح ، پرہیزگار اور عامل و کامل ہو جس کی مفصل تشریح آگے آئیگی - انشاء اللہ (یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے - کہ اگر کسی پیر سے بیعت ہونے کے بعد یہ ثابت ہو کہ وہ غیر صالح ، ناقص ، نااہل اور خلاف شرع و بدعتی ہے - تو اس کی بیعت فسخ کر دینی چاہئے - اس مسئلہ کے متعلق کسی شخص نے حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا - کہ اگر کوئی شخص کسی کا مرید ہو جائے اور بعد ازاں اس پیر کو باطل و بیکار پائے تو کیا وہ دوسرے سے بیعت ہو سکتا ہے - آپ نے فرمایا کہ اس پر فرض ہے کہ دوسرے سے بیعت کرے - کیونکہ اگر کوئی شخص جنگل میں ہو اور قبلہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے اندھیرے میں کسی ایک سمت پر نماز پڑھ چکا ہو اور بعد میں اسکو معلوم ہو کہ قبلہ اس طرف نہیں جس طرف منہ کر کے میں نے نماز ادا کی ہے - تو اسی سمت پر قائم رہنا اور آئندہ بھی اسی سمت پر نماز ادا کرنا اس کے لئے جائز نہ ہوگا - پس اسی طرح اگر کسی نے کسی کو اپنا پیر بنایا اور بعد کو اس کے غیر شرع ہونے اور طریقت کے نقص و عیب کا علم ہوا تو وہ اس قبلۂ باطن نہیں ہو سکتا اور ایسے

پیر کا اتباع محض ضلالت و گمراہی ہے ۔ کیونکہ شریعت ہی اساسِ طریقت، رہنمائے حقیقت اور پردہ کشائے معرفت ہے بغیر اتباعِ شریعت حصول کمال تصوف امر محال ہی نہیں بلکہ الحاد بھی ہے لیکن فی زمانہ اہلِ زمانہ کا مذاق کچھ ایسا بگڑا ہوا ہے کہ پاسبانانِ علمِ معرفت کی تعلیمات و ارشادات ان کے سلاسل و شجرات مع تاریخ و سنین عرائس اور ہر خاندان کی امتیازی شان کے اثرات و علامات ہوتے ہوئے بھی بعض لوگ ایسے بے تحقیق طور پر اپنے اکابرین کی تعلیمات ترک کر دیتے ہیں گویا اُن کے نزدیک کسی پابند شریعت پیر کی متابعت گناہ کبیرہ ہے ۔ بلکہ بعض فریب خوردہ لوگ وہ ہیں جن کے نزدیک شریعت اور فقر دو متضاد چیزیں ہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں نام نہاد فقرا، مختلف لباسوں، رنگ برنگ گجروں، خوبصورت کلاہوں طرح طرح کی ٹوپیوں، قسم قسم کے خرقوں، بالوں کی رسیوں، گاؤ دُم ڈنڈوں، شیروں کی کھالوں اور مرداروں کے سینگوں میں ملبوس نظر آتے ہیں ۔ جو حقیقتاً جوگیانِ ہند کی نقل ہے ۔ اور وہ اس سب کچھ کی کوئی سند سوائے اس کے نہیں لاسکتے ۔ کہ ہم سے پہلے جو گزر چکے ہیں وہ ایسا ہی کرتے تھے ۔

حالانکہ اسلام کے گلیم پوش و محرمِ اسرار خدا رسیدہ حضرات جو پہلے گزر چکے ہیں اور جو اس وقت بھی موجود ہیں ۔ اور جنکے مقدس وجود اسلام کی زینت اور مذہب کی رونق کا موجب ہیں ۔ اور جن کی پاک جوانیوں کے صدقہ سے یہ معمورہ دنیا باوجود اپنی اس کثرتِ معصیت کے قائم و برقرار ہے (جن کی محبت اللہ کی محبت، جنکی صحبت جنت کی چابی اور جن کی نیازمندی قلب کی روشنی ہے) نے مسنون درویشی و فقر کی صاف وضاحت فرما دی کہ متبع شریعت ہی درویش ہو سکتا ہے، جس نے پہلی منزل پر ہی قدم غلط رکھا ہو وہ جہاں تک چلے گا غلط رَو ہی کہلائے گا ۔ شعر

خشت اوّل چوں نہد معمار کج   تا ثریا مے رود دیوار کج

چنانچہ خواجہ احمد بلخیؒ فرماتے ہیں کہ ایسے ہی بندگانِ خدا سے محبت ایمان کی علامت اور ان سے بغض و حسد فرعون و شیطان کی عادت ہے ۔ جو انسان کسی خباثتِ باطنی کے ماتحت ان لوگوں سے دشمنی رکھے گا ۔ وہ خدا کے دشمنوں میں شمار ہوگا ۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا

مگر ہاں فقیر کو یہ لکھنے میں بھی ملامت کا ڈر نہیں کہ اہل اللہ کی محبت اور بے پناہ عقیدت، ان کے در کی جبہ سائی اور ان سے مخلوقِ خدا کی عقیدتمندانہ دوہائی نے ہمارے ملک میں بے شمار نام نہاد و مکار جبہ پوشوں اور زلف درازوں کو پیدا کر دیا ہے ۔ جن کی کثرت سے کسی بے ریا اور ریاکار، حقیقی اور غیر حقیقی، اصلی و نقلی درویش کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا ہے

اور انہی کی وجہ سے ہمارے تعلیم یافتہ و سنجیدہ طبقہ میں قواعد طریقت اور رسم و راہ تصوف کی سخت بے حرمتی ہو رہی ہے کاش ایسے لوگوں کو جو درویشی کا دم بھرتے ہیں، اپنے آپ کو ملامت کرنے کی توفیق حاصل ہو اور مغالطہ یافتہ گروہ کو بھی نگاہِ بینا ملے۔ تاکہ دونوں مدعی اور متلاشی قطعی انکار و گمراہی کی بجائے خاصانِ خدا کی تمیز و اتباع کر سکیں اور معرفتِ الٰہی سے محروم رہ کر دنیا سے نامراد نہ جائیں۔ چنانچہ اسی ضمن میں حضرت ابو سعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تو چند نامردوں کو دیکھ کر مردانِ راہِ خدا پر طعن نہ کر۔ کیونکہ یہ ایک وہ مغالطہ ہے جو منکرِ فقر کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے اور وہ اپنا دین و دنیا کا مفاد کھو بیٹھتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کیا لطیف رنگ میں توجہ دلا گئے ہیں۔ کہ۔ شعر

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہو در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

گویا اُن کے نزدیک معرفتِ الٰہی کے لئے محض علمی ذخیرہ پر اکتفا کرنا ایک فاش غلطی ہے جب تک اس کے ساتھ کسی عملی نمونے کا اتباع نہ ہو۔

معیارِ ولائت

تفصیل کے ساتھ تو یہ مسئلہ اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ ذکر کیا جائے گا۔ مگر یہاں صرف اتنا ہی بیان کرنا ضروری ہے۔ کہ عوام وخواص کے نزدیک یہ تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ کہ تعلق الٰہی کے لحاظ سے مسلمانوں کے دو گروہ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خطاؤں اور معاصی کے عادی ہو کر اپنی خطاؤں کی تلافی رجوع الی الخیر سے کرتا رہتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو مالک و خالق حقیقی کو ہر لمحہ وہر آن حاضر وناظر سمجھ کر ہر قسم کی معصیت سے ڈرتا اور بچتا ہے۔ اور اپنی لوحِ اعمال کو خوف کے آنسوؤں سے دھو کر ہمیشہ ایسا پاک وصاف رکھتا ہے کہ اُس کا آئینۂ قلب انوارِ الٰہی کا گنجینہ بن جاتا ہے۔ اسی جماعت کو اولیاء اللہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اور اسی جماعت کی طفیل عصیاں شعاروں کے تمام کام نکلتے ہیں۔ صاحب کتاب الاسلام نے اس بحث کو بحوالہ عقائد نسفی یوں لکھا ہے۔ وَالْوَلِیُّ هُوَ الْعَارِفُ بِاللّٰهِ تَعَالٰی وَصِفَاتِهٖ مَا یُمْكِنُ الْمُوَاظِبِ عَلَى الطَّاعَاتِ الْمُجْتَنِبُ عَنِ الْمَعَاصِی الْمُعْرِضُ عَنِ الْاِنْهِمَاكِ فِی اللَّذَّاتِ وَالشَّهْوَاتِ۔ یعنی ولی وہ ہے۔ جو اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات میں حتی الامکان زیادہ معرفت رکھتا ہو۔ اطاعتِ الٰہی میں استغراق رکھنے والا اور گناہوں سے اجتناب کرنے والا ہو۔ اور لذات وشہوات سے بیزار ہو۔ جس طرح تمام بندوں میں نبی خدا کا مقرب ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر نبی کی امت میں سے بعض لوگ روحانی وجسمانی کمالات کے سبب بارگاہ خداوندی میں باریاب اور مقبول ہو جاتے ہیں ان کی علمی اور عملی حالت امت کے تمام افراد سے ممتاز ونمایاں ہوتی ہے۔ ان کو تمام کمالات نبوّت کی طفیل ہی حاصل ہوتے ہیں۔ اور نبی کی تابعداری سے ہی وہ اس مرتبہ کو پہنچتے ہیں۔ ان کو بڑی بڑی قوتیں اور نشانیاں دی جاتی ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ ان کے ہاتھوں سے کرامت کا اظہار فرماتا ہے تاکہ اس کے نبی کی نبوّت سے انکار کرنے والے اس کی کرامت کو دیکھ کر نبی کی صداقت کے قائل ہو جائیں۔ اسی سے اکثر بزرگانِ دین نے لکھا ہے۔ کہ اولیاء اللہ کا وجود اور ان کی کرامت حق ہے۔ پھر اولیاء اللہ کے ذاتی خصائل کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ شیخ عبد اللہ ابن المبارک نے ایک مرتبہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ ولی کی کیا تعریف ہے۔ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:- هُوَ الَّذِیْ فِیْ وَجْهِهٖ حَیَاءٌ وَفِیْ عَیْنِهٖ بُكَاءٌ وَفِیْ قَلْبِهٖ صَفَاءٌ وَفِیْ لِسَانِهٖ ثَنَاءٌ

وَفِی یَدِہٖ عَطَاءٌ وَفِی وَعْدِہٖ وَفَاءٌ وَفِی نُطْقِہٖ شَفَاءٌ یعنی ولی وہ ہے جس کے چہرہ پر حیا، آنکھوں میں گریہ دل میں پاکیزگی، زبان پر تعریف، ہاتھ میں بخشش، وعدہ میں وفا اور بات میں شفا ہو۔

حضرت قطب ربانی، غوث صمدانی، شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی کتاب فتوح الغیب میں اولیاء اللہ کے خصائص واوصاف یوں بیان فرمائے ہیں۔ کہ خدا کی محبت و رضا کو بلا طلب اغراض و اعراض منظورِ خاطر رکھتے ہیں اور تذلل و اخلاص ان کا شیوہ ہوتے ہیں۔ نفس کے ساتھ جہاد اور روح کو ذکرِ الٰہی سے زندہ کرتے ہیں۔ امیروں میں جب بیٹھیں تو اپنے شرف و احترام کا غلبہ رکھیں اور فقیروں کی مجلس میں عاجزی کریں۔ بے شرمی، شوخی اور بدخُلقی سے بچیں۔ مسلمانوں سے حسنِ ظن اور اُن کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں کوشاں رہتے ہیں۔ اور کسی کی بُرائی اور بغض و کینہ اپنے سینہ میں نہیں رکھتے۔ حتیٰ کہ جو شخص ان پر ظلم کرے اُس کے حق میں بھی دعا کرتے ہیں۔ سوائے اپنے خالق و مالک خدا کے کسی کا خوف اپنے دل میں نہیں رکھتے۔ اور خلقِ خدا سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ہمیشہ سچائی اور حق و صداقت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ ادائے فرض میں کسی مصیبت اور آزمائش سے نہیں گھبراتے۔ اپنی روزی قوتِ بازو سے پیدا کرتے اور کھانا حلال کھاتے ہیں۔

بقول حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ ولی وہ ہے جس میں محبت الٰہی کی علامات پائی جائیں اور وہ اخلاق و اعمال میں متابعت سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کاربند ہو۔ یعنی اخلاق و افعال میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادا کرنا ہی علامت اہل اللہ اور سچی درویشی ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر تم کسی درویش کو ہوا میں پرواز کرتا ہُوا دیکھو تو اس کی اس کرامت سے دھوکا نہ کھاؤ۔ جب تک تم یہ نہ دیکھ لو کہ وہ حال وقال، حفظ حدود اللہ اور اوامر و نواہی میں کیسا ہے۔ اگر شریعت و سنتِ محمدی کا پابند پاؤ تو اس کی ولایت کا یقین کرو، ورنہ اس کے برعکس سمجھو۔ گویا جس کے اقوال و اعمال شریعت کے مطابق نہ ہوں۔ اس کو مردانِ خدا سے خیال کرنا ایک فریبِ نفس ہے۔ کیونکہ تصوّف علومِ دین کا خلاصہ ہے۔ جو باطنی اجتہاد سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کا تعلق علم ظاہر کے ساتھ جان و تن کا سا ہے۔ یعنی علمِ ظاہر تن ہے اور علم باطن اسکی جان ہے چنانچہ افضل الرسل سید الانبیاء، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ اَلْعِلْمُ بِدُوْنِ الْعَمَلِ وَبَالٌ وَالْعَمَلُ بِدُوْنِ الْعِلْمِ ضَلَالٌ۔ یعنی علم بے عمل عذاب ہے اور عمل بے علم گمراہی۔ اس سے ثابت ہُوا کہ تصوّف کیلئے شریعت اور شریعت کے لئے تصوّف کی سخت ضرورت ہے۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ بعض اولیاء کرام وصوفیائے عظام جب حضور قلب اور حقیقت و معرفت کے انتہائی مدارج میں پہنچ جاتے ہیں تو کسی غلبہ حال کی وجہ سے ظاہری اعمال کے چنداں پابند نہیں رہتے اور کبھی ایسے کلمات بھی منہ سے نکال دیتے ہیں۔ جو سراسر شریعت کے خلاف ہوتے ہیں اور ان کی یہ حالت اختیار سے باہر، خود فراموشی کا سبب اور عالم محویت میں ہوتی ہے۔ مگر بعض وہ بھی ہیں جو ہوش وحواس کی قائمی میں ریاکاری کا لہو لگا کر ان شہیدوں میں ملنا چاہتے ہیں جیسا کہ آج کل کے بعض مصنوعی بدعتی فقیروں کا وطیرہ ہے۔ اگر ہوش وحواس کے قیام کے باوجود کسی کا قول وفعل شریعت کے خلاف پایا جائے تو ایسے مکار اور بناوٹی سے دور رہو۔ اور جان لو کہ وہ اہل اللہ سے نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کا احکامِ شریعت سے ہٹ کر درویشی کا مدعی ہونا اور یہ کہنا کہ اہلِ طریقت کی شاہراہ جداگانہ ہے اور ہمارے لئے شریعت کی پابندی لازمی نہیں، شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور، ہمارے درویشانہ مسلک کے آئین وقوانین ہی الگ ھیں وغیرہ وغیرہ محض ایک اولیاء اللہ کے متلاشی کیلئے موزوں سا بہکاوا ہے اور کچھ نہیں، نہ ان کا آئین الگ اور نہ شاہراہ جدا ہے۔ بلکہ حضور سید وشافع یوم النشور علیہ السلام ہی کے دونوں طریق کار ہیں، جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر ناتمام رہتے ہیں۔ کیونکہ ولی کامل کا کوئی قول وفعل شریعت غرا کے خلاف نہیں ہوتا۔

افسوس کہ ولایت اور درویشی کی شناخت کا جو اصل معیار ہے اس پر عوام کی نظر نہیں بلکہ انہوں نے ایسی شعبدہ بازیوں کو معیار سمجھ رکھا ہے۔ جن سے بعض اوقات غیر مسلم درویشوں کی حرکات پر بھی حقیقی اور سچی درویشی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ اور یہ ایک عظیم ترین غلطی ہے جو عوام میں غلط العام صحیح ہو کر جگہ پکڑ رہی ہے۔ ہر طالب ولایت کو یاد رکھنا چاہئے کہ شریعت کی تابعداری اصل چیز ہے اور کشف وکرامت اس کی فرع ہیں۔ جب تک اصل ثابت نہ ہو فرع ثابت نہیں رہ سکتی پس اتباع شریعت کی بلندیوں طریقت کی پہنائیوں اور علم وعمل کی خوشنمائیوں میں بزرگی اور ولایت کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ شعبدہ بازیوں اور نام نہاد انکشافی شہرتوں اور حیرت انگیزیوں میں بعض اوقات ٹھوکر لگ جانے کا احتمال ہو جاتا ہے۔ جس سے بچنا واجب ہے۔

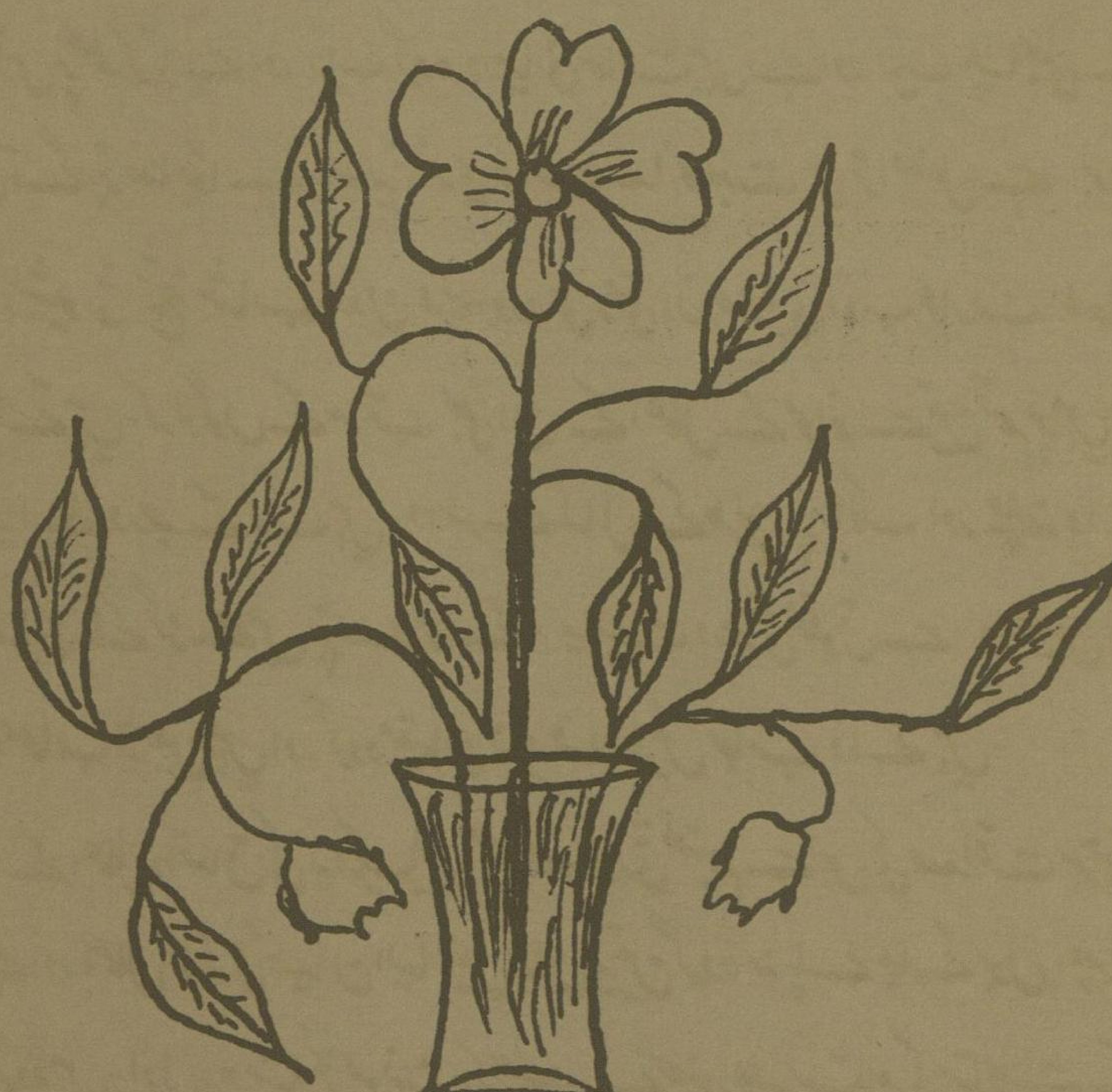
انسانی قیاسات کی بے ثباتی

عالمِ ارواح اور روحانی طاقتوں کی بابت جو انقلاب اہلِ یورپ میں واقع ہوا اور انہوں نے روحانیت کے متعلق عالمِ تخیلات میں جو قلابازیاں کھائیں وہ اہلِ یورپ کے معتقدات و تخیلات کی بوقلمونی اور بے اعتباری کا ایک دلچسپ اور قابلِ دید نمونہ ہیں۔ چند صدیوں کی بات ہے کہ یورپ والوں کے ہاں ہر قسم کے بھوت پریت اور جادو و آسیب کا اعتقاد مذہباً اور قانوناً مسلّم تھا۔ حتیٰ کہ صدہا ناکردہ گناہ عورتیں ڈائن اور چڑیل سمجھ کر زندہ جلا دی گئیں۔ چنانچہ ایک صوبہ لورین میں ۱۵۸۰ء سے ۱۵۹۵ء تک نو سو عورتیں جادوگری کے الزام میں زندہ جلا دی گئیں تھیں۔ اس کے بعد اُن کے خیالات نے پھر پلٹا کھایا اور ایسے خیالات کو اوہام سمجھا جانے لگا۔ اور اس میں اس قدر غلو ہوا کہ روح اور خدا تک کے وجود سے انکار کر دیا گیا۔ شیطانوں، جنوں اور فرشتوں کے وجود کو مضحکہ انگیز اعتقاد بتلایا گیا۔ اس کا اثر اتنا پھیلا کہ جہاں جہاں مغربی تمدن اپنی روحانیت سوز تباہ کاریاں لئے ہوئے پہنچا۔ وہاں وہاں کے تمام اہلِ مذاہب میں ہلچل ڈال دی۔ اور لگے وہ اپنے اپنے مذاہب میں کتر و بیونت اور کاٹ چھانٹ کر کے اہلِ مغرب کے خیالات سے مطابقت کرانے۔ چنانچہ ہندوستان کی ایک مایۂ ناز ہستی سر سید مرحوم کو بھی ان ہی ہوائی خیالات کی تقلید میں شیطانوں، جنوں اور فرشتوں کے وجود خارجی کی تردید میں بیجا، رقیق اور دُور از کار تاویلوں سے کام لینا پڑا۔ جو اہلِ مغرب ہی کی موانست اعتقاد کا نتیجہ تھا۔

اس کے بعد پھر خیالات کی رَو بدلی۔ اور مسمریزم و ہپناٹیزم کی تحقیق و تفتیش کرتے کرتے فلاسفۂ مغرب روحانیت جدیدہ کی حد تک جا پہنچے۔ جس نے سارے پچھلے خیالات و قیاسات کو غلط اور بے بنیاد ثابت کر دیا۔ اس نئے انکشافات سے دنیائے سائنس و فلسفہ کے مشاہیر اور مستند استاد بھی ہر قسم کی روحانی ترقی کے قائل ہی نہیں ہو گئے بلکہ یہاں تک تسلیم کر لیا کہ ارواح جسمِ ظاہری کے فنا ہو جانے کے بعد بھی مادی اشیاء پر مختلف قسم کا اثر ڈال کر اپنے وجود اور روحانی طاقت کا اظہار کر سکتی ہیں اور ہم کو اپنے حالات بعد الموت سے بھی آگاہ کر سکتی ہیں۔ صرف یہی نہیں، بلکہ دُنیائے سائنس میں آٹومیٹک رائیٹنگ یعنی غیبی تحریر کا ذکر بھی کئی بار آ چکا ہے۔ جس کا ماخذ روحانی طاقت ہی بتایا

جاتا ہے۔ غرضیکہ روحانی تعلیم اور روحانی طاقت و ترقی سے ہزار ہا جتنوں کے باوجود فلسفۂ جدید بھی اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اور اسلامی معتقدات کے مقابلہ میں ان سائنس دانوں اور فلسفیوں کی یہی ایک بے بسی، مادی اور روحانی تذبذب اور مضحکہ انگیز انکار و اقرار قابلِ غور ہے۔ شعر ؎

مانا نہیں جس نے تجھے جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا



اقسام الناس

قرآنِ کریم کے تدبر و مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اعتقاد و اعمال اور تعلق الٰہی کے لحاظ سے انسانوں کو تین جماعتوں میں تقسیم فرمایا ہے:۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ۔ یعنی ان میں سے ایک گروہ احکامِ الٰہی سے سرتابی کرنیوالا ہے۔ جو اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور ایک گروہ درمیانی حالت میں ہے اور ایک ایسا بھی ہے جو خدا کے حکم سے نیکیوں کے کرنے میں آگے بڑھا ہوا ہے۔ سو یہ آخری حالت خدا کا بہت ہی بڑا فضل ہے۔ جو وہ اپنے بندوں پر کرتا ہے۔ حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رضی اللہ عنہ اپنی کتاب عوارف المعارف کے تیسرے باب کی دسویں فصل میں فرماتے ہیں۔ کہ لوگوں کے مراتب بھی ان کے اعمال کے لحاظ سے تین قسم پر ہیں' اول تو واصلوں اور کاملوں کا مرتبہ ہے۔ یہ اعلےٰ درجہ کے لوگ ہیں۔ دوسرے کمال کے طریق پر سالک اور چلنے والے۔ یہ متوسط درجہ کے لوگ ہیں۔ تیسرے نقصان کے گڑھے میں پڑے ہوئے۔ یہ پست درجہ کی مخلوق ہے۔ واصلین تو مقربین اور سابقین ہیں اور سالکین نیک اور اصحاب الیمین ہیں اور گروہ مقیمان شر و فساد بائیں جانب والے ہیں۔

فی الحقیقت انسان کے اعمال و اخلاق کی یہ ایک ایسی صحیح اور قدرتی تقسیم ہے جس کی صداقت ہر حیثیت سے مُسلّم اور ہر پہلو سے ثابت شدہ ہے اور اعمال کا کوئی میدان ایسا نہیں جہاں یہ تین گروہ نہ پائے جاتے ہوں۔ پھر انبیاء علیہم السلام کے بعد واصلین کے بھی دو گروہ ہیں۔ اول وہ مشائخ صوفیہ ہیں کہ جنہوں نے حضور علیہ السلام کی متابعت کے سبب وصول کا مرتبہ پالیا ہے۔ اور پھر مخلوق کی دعوت کی طرف بطریق متابعت شرع متوجہ ہونے پر مامور و ماذون ہوئے ہیں اور یہ گروہ کامل و مکمل افراد کا ہے۔ کیونکہ خداوند عالم جلشانہٗ کی ازلی عنائت اور فضل نے ان کو جمعیت کے چشمہ اور توحید کے بحر میں غرق ہونے کے بعد لقا کے میدان میں صحیح سلامت پہنچا دیا ہے۔ تاکہ لوگوں کو راہِ نجات و بلندئ درجات کا نشان دیں دوسرا گروہ وہ ہے کہ درجۂ کمال کو پہنچنے کے بعد مخلوق کی طرف رجوع کرنا اور تکمیل کا اوروں کی سپردگی میں دینا ان کو میسر ہی

نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ توجمعیت کے چشمہ اور توحید کے سمندر میں ایسے غرق ہوتے ہیں کہ تفرقہ کے ساحل یا بقا کے میدان تک پہنچنے کی ان کی کوئی خبر ہی نہیں ملتی۔ اور نہ ان کا کوئی اثر پہنچتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ بعد کمال وصول ولایت اور دل کی تکمیل ان کے سپرد ہی نہیں ہوتی۔ بزرگان دین کے ملفوظات میں لکھا ہے۔ کہ اہل سلوک بھی دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مقصد اعلےٰ کے طالب اور ذات احدیت کے مرید ہوتے ہیں۔ یعنی اسی کو چاہنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے۔ کہ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ (اسی کی ذات کا ارادہ رکھتے ہیں اور اسی کو چاہتے ہیں) دوسرے وہ جن کا ارادہ آخرت میں کامیابی اور جن کی طلب جنت کی باریابی ہے۔ یعنی وہ حسب ارشاد کلام پاک وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ط بہشت کے طالب اور آخرت کے مرید ہیں۔

پھر فرمایا کہ اسی طرح عام طالبانِ حق بھی دو گروہوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ ایک گروہ متصوفیہ کا ہے۔ جو نفوس کی بعض صفات سے تو چھوٹ گئے ہوں۔ مگر صوفیوں کے بعض حالات وصفات ان میں پائے جاتے ہوں۔ مگر وہ نفسانی خواہشات کے احاطہ سے باہر نہ نکلے ہوں اور مقام قرب صوفیہ سے پیچھے رہ گئے ہوں۔ دوسرا گروہ ملامتیہ کا ہے۔ کہ وہ اخلاص وصدق کی رعایت ومحافظت میں نہایت ہی سعی کرتے ہیں اور بندگی وعبادت کے اخفا میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ اور ایسا کرنا ضروری جانتے ہیں باوجودیکہ اعمال صالحہ سے کوئی دقیقہ فضائل ونوافل تک کی بجا آوری کا فروگذاشت نہیں کرتے۔ پھر بھی بگمان ریاکاری عبادت کے ظہور سے حیران وترساں ہوتے ہیں اور ہر وقت ایسے خوفزدہ رہتے ہیں کہ جیسے گنہگار اظہار گناہ سے ڈرتا ہے۔ بعض فقرا کے نزدیک اس گروہ کی تعریف یوں کی گئی ہے:۔ اَلْمَلَامَتِیُّ هُوَالَّذِیْ لَا یُظْهِرُ خَیْرًا وَّلَا یُضْمِرُ شَرًّا یعنی ملامتی وہ گروہ ہے کہ جو نیکی کو ظاہر نہ کرے اور برائی دل میں نہ رکھے یہاں سے پورے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ اگرچہ نادر الوجود اور شریف الحال ہے۔ لیکن ابھی تک ان کی نظر سے مخلوق کے وجود کا حجاب نہیں اٹھا اور باوجود اس بات کے کہ یہ گروہ نیکی کرنے اور چھپانے میں نہایت حریص ہوتا ہے۔ مگر فی زمانہ بعض جہلاء نے اس گروہ کے صرف ظاہری نام اور کام سے نفع اٹھاتے ہوئے ملامتی کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ غیر شرع دین کا منحرف، فقر اور اصول فقر محمدی کا منکر، عمل میں کمزور، علم میں بے طور اور خدا کے اوامر ونواہی کی علانیہ سرکشی اور سرتابی کرنے والا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ تعریف نہایت لغو اور اس مشرب ومسلک کے درویشوں کے اصول کے خلاف ہے۔ بلکہ جو شخص اس تعریف کا قائل ہوتا ہے۔ وہ ایک محفوظ ومصئون عن الوساوس طبقے کی

توہین کرتا ہے۔ اور اس گروہ پاک پہ تہمت لگاتا ہے۔

ہمارے شیخ سلسلہ شیخ الاسلام ابونجیب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تاریخ تصوف کی رو سے یہ فرقہ ملامتیہ کوئی نیا فرقہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود نفس طریق ملامتیہ کی عظمت کے پوری طرح قائل ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ ایک معزز حال اور بلند مقام ہے۔ یہ سنت نبوی علیہ السلام اور آثار صحابہ کرام سے تمسک اور مرتبۂ اخلاص کی تحقیق کا نام ہے۔

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ بہت بعد کے شخص ہیں۔ لیکن شیخ کے اسی نکتۂ اجمال کی شرح و توضیح وہ بڑی خوبی سے اپنی زبان سے فرما گئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ملامتیہ اس فرقہ کو کہتے ہیں جن کی انتہائی کوشش مرتبۂ صدق و اخلاص کے برقرار رکھنے کی ہوتی ہے۔ اور ریاکاری و نمائش کی ہوا بھی اعمال و طاعات کو نہیں لگنے دیتے اور طاعات و حسنات کو نظرِ خلائق سے مخفی رکھنے میں انتہائی طریق پر کوشاں رہتے ہیں وہ اعمال صالحہ سے کوئی جز تک بھی نہیں چھوڑتے۔ فرائض و نوافل کی بجا آوری کا انتہائی اہتمام رکھتے ہیں اور حسن اخلاق کے تحقق میں لگے رہنا اس جماعت کا مسلک ہے انہیں لذت اسی میں آتی ہے کہ ان کے اعمال و احوال پر صرف ان کے خالق کی ہی نظر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی طاعت کو چھپانے میں ایسا اہتمام رکھتے ہیں کہ دوسرے لوگ اپنی معصیت کے چھپانے میں اتنا نہیں رکھتے وہ ہر لحظہ اس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ اخلاص کامل میں دھبہ اور اعمال صالحہ میں ریا کا شائبہ ظاہر نہ ہونے پائے۔

تصوّف اور معترضین

ہر صوفی مسلمان سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ تصوف پر کس بیدردی سے نکتہ چینیاں ہو رہی ہیں اور کن کن تاویلات باطلہ اور تشریحات رقیقہ سے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر متصوفین کو رہبانیت کی وادی کے ساکن ثابت کرنے کی سعی کی جارہی ہے۔ چنانچہ کتاب صراط مستقیم کے مصنف اسد الرحمٰن صاحب بھوپالی بھی باوجود اپنے آپ کو پیر طریقت ظاہر کرنے کے اس مسئلہ میں غلو کرنے سے باز نہیں رہے اور لکھتے ہیں کہ:-

۱۔ بعض صاحب ذوق علماء نے اشراقین کی پیروی کی اور اسلامی اعمال کو اشراقی اصول پر ترتیب دیا یہ تصوّف اسی کا ثمرہ ہے۔

۲۔ ماہرین علم الاصول نے نظریات کا تصوّف نام رکھا۔

۳۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں جب تمام ادیان و مذاہب سے حضرات اہل تصوّف آشنا ہوئے تو ہر ایک کے عقائد و اعمال میں سے اپنے مفید مطلب امور اخذ کر کے ایک عجیب وغریب مجموعہ تیار کر لیا۔

۴۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں تصوّف نے ایک ہمہ گیر عظمت حاصل کر لی اور جوگیان ہند کے علوم قدیم سے بہت سے معتقدات و اعمال اخذ کر کے داخل تصوّف کئے گئے۔ اور ایک معجون مرکب تیار ہو گیا۔ اور دسویں صدی ہجری کے بعد سے تو تصوّف ایک طلسم ہوشربا بن گیا۔

معاذ اللہ کن کن طریقوں سے بخل کا اظہار ہو رہا ہے اور کس کس رنگ میں بندگان خدا کی اور ان کے ایک پاکیزہ طریق کار کی مخالفت کی جارہی ہے۔ اور بعض لوگ تو صوفی کے ساتھ باطنی بغض کے معاملہ میں یہاں تک بڑھ چکے ہیں۔ کہ صوفی تو درکنار صوفی کے نام اور لفظ تک کو شودر اور ملیچھ کا درجہ دیتے ہیں۔ بلکہ صوفی کے ساتھ اس لفظ صوفی کی بھی وہ مخالفت کرتے اور گت بناتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی ہے۔ صوفی اور اس کا فعل کسی حد

تک بھی نیک اور قابلِ تحسین کیوں نہ ہو، ان چودھویں صدی کے خود رائے مجتہدوں کے نزدیک گردن زدنی ہی ہے۔ ان لوگوں نے مخالفانہ رنگ میں یہاں تک تجاوز کیا ہے کہ لفظ اور عمل صوفی کو باطل قرار دینے کیلئے سرکارِ انبیاء محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ حیاتِ ظاہری سے لے کر آج تک کچھ اس کٹ حجتی سے گھسیٹا ہے کہ گویا جہادِ افضل لفظ صوفی اور تصوّف ہی کو مٹانا ہے۔ کسی نے صوفی کے عمل کی تحقیق میں قلم اٹھایا تو کسی نے لفظ صُوفی اور تصوّف کے مادۂ اشتقاق میں ٹوہ لگائی۔ چنانچہ بھوپالی صاحب کے علاوہ ایک اور اعظم گڑھی محقق نے لکھا ہے کہ عہدِ رسالت اور صحابہ میں اصحابِ صفہ کے سوا کوئی شخص یا کوئی گروہ کسی خاص لقب سے نہیں پکارا گیا۔ اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے لقب ایجاد ہوئے۔ اس کے بعد بزرگانِ دین کو زاہد و عابد کے لقب سے پکارا گیا۔ لیکن صوفی یا تصوّف کے لفظ سے لوگ بالکل ناآشنا تھے۔ اس لئے لفظ صوفی کو کوئی مذہبی وقعت نہیں دی جا سکتی۔ پھر جب بدعات کا ظہور ہوا اور مختلف فرقے پیدا ہو گئے تو ایک جماعتِ زہاد کے لئے صوفی کا اسم بھی ایجاد ہو گیا۔ بظاہر اس اسم صوفی کی کوئی وجہ اشتقاق معلوم نہیں ہوتی اور نہ یہ اسلامی یا عربی زبان کا لفظ ہے بلکہ یہ ایک یونانی لفظ ہے، جس کا مادہ سُوف ہے۔ جس کے معنی یونانی زبان میں حکمت کے ہیں۔ اور دوسری صدی میں جب یونانی کتابوں کے ترجمے ہوئے تو یہ لفظ عربی میں آیا۔ چونکہ حضرات صوفیہ میں اشراقی حکما کا انداز پایا جاتا تھا۔ اس لئے لوگوں نے ان کو سُوفی (حکیم) کہنا شروع کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ لفظ سُوفی سے صُوفی ہو گیا۔ بعض نے کہا کہ غوث بن مُر نے خانہ کعبہ کے پاس سب سے پہلے اپنے آپ کو خدا کی خدمت کیلئے وقف کیا تھا۔ اور اس کا مشہور نام صُوفہ تھا۔ اس لئے جن لوگوں نے اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کیا۔ وہ صوفیاء کہلائے۔ اور غوث بن مُر کو صُوفہ اس لئے کہتے تھے کہ اس کی ماں کی کوئی اولاد زندہ نہ رہتی تھی۔ اور اس نے منت مانی تھی کہ اگر اس کی کوئی اولاد زندہ رہی تو وہ اُس کے سر پر اُون لگا کر اس کو کعبہ پر وقف کر دے گی۔ چنانچہ اس نے ایسا کیا۔ تو غوث بن مُر کا نام صُوفہ پڑ گیا۔ بعض نے کہا کہ یہ لفظ صُوفانہ سے مشتق ہے۔ جو ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے۔ چونکہ صوفی لوگ صحرا کی گھاس پات کھا کر گذارہ کرتے تھے۔ اس لئے اس نام سے مشہور ہو گئے۔ اور بعض نے تو یہاں تک تشدد سے کام لیا ہے کہ یہ نام سینٹ صوفیہ گرجا کے رہنے والے راہبوں کی وجہ سے جو اپنے آپ کو تارک الدنیا

کہتے تھے مسلمان درویشوں میں آیا ہے۔ اور اسی تاویل کے ماتحت وہ اس کو اسلامی لفظ بھی نہیں مانتے۔

غرضیکہ جتنے منہ اُتنی باتیں۔ کسی خدا کے بندے نے اپنی للّٰہیت پرستی کے ماتحت بھول کر بھی اس کا یہ مفہوم نہیں سمجھا کہ لفظ صوفی کا تعلق صفائی ظاہری و باطنی سے بھی متعلق ہو سکتا ہے۔ یا صوفی صفا سے مشتق ہے اور اس کو اہلِ باطن اہلِ صفا پر استعمال کرتے ہیں۔ یا جو لوگ کدورتِ بشریت سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ ان کو صوفی کہا جاتا ہے۔ یا اصحابِ صفہ کے باقیات صالحات صوفی کے لقب سے موسوم ہوتے ہیں۔ تاہم صوفی کے لئے کس قدر مقامِ شکر ہے کہ مخالفین باوجود شدتِ مخالفت کے بھی تصوف اور صوفی کا کوئی تاریک پہلو پیش نہیں کر سکے۔ ورنہ ان کے ہاتھ میں قلم تھا۔ کعبہ شریفہ پر عبادت کے لئے زندگی وقف کرنے والوں پر کوئی اور بھی بے سروپا الزام لگا دیتے یا کعبہ کی بجائے کسی بُت خانہ سے ہی منسوب کر دیتے تو ان کا کوئی کیا کر لیتا۔ خدا کی پناہ یہ یک طرفہ فیصلہ بھی عجیب معاندت ہے۔ کاش کہ وہ تصوف کا مادہ اشتقاق تلاش کرنے سے پہلے اور صوفی کو بدعتی کا لقب دینے سے قبل ذرا ٹھنڈے دل سے اس پر بھی غور کر لیتے۔ کہ یہ یونانی لفظ تھیا صوفی کا چربہ ہے۔ جس کے معنے حکمتِ خدا ہیں۔ پھر اس نقطۂ نگاہ سے صوفی کا اطلاق اس شخص پر کیا جائے گا جو حکمتِ خدا کا طالب ہو۔ صوفیاء دراصل وہی بزرگ تھے جنہوں نے دنیوی مشاغل کو ترک کر کے اپنی زندگی حکمتِ خدا کی تلاش اور چھان بین میں صرف کر دی۔ ایران میں تصوف کی تاریخ ایک طویل مدت کو گھیرے ہوئے ہے۔ طوائف الملوکی کے زمانہ میں ایران کے ذہین طبقہ نے حکمتِ خدا کی طرف رجوع کیا۔ ان بزرگوں نے نہ صرف نفسِ انسانی اور اس کے لطائف کو ماپنے تولنے کی کوشش کی۔ بلکہ اپنے زمانہ کے استبداد کے خلاف بھی ایک خاموش قسم کا عدم تعاون کیا۔ اور اس کے علاوہ انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف احتجاج کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا پرست اور جاہ پسند لوگوں نے ہمیشہ صوفیاء کو ذلیل کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان صوفیاء کرام کے عملی کارنامے ہمارے سامنے ہیں۔ گو ان کا وجود دنیا میں موجود نہیں۔ اس کے علاوہ وہ سلاطین بھی موجود نہیں، جن کے تشدد اور بے رُخی کا انکو تختہ مشق بننا پڑا۔ تاہم ہمارے دل میں ان جلیل القدر فرزندانِ اسلام اور انسانیت کے سچے عاشقوں کے علمی اور عملی آثار موجود ہیں۔ جو ان کی عظمت کے زندہ شواہد ہیں۔ اور انہی آثار کے ذریعہ قیامت تک ان کی یاد ہمارے دلوں میں محفوظ رہے گی۔ کاش ہمارے ملک کے اہلِ علم حضرات اسلامیات کے اس اہم حصہ کی جانب بھی توجہ فرماتے۔ جس سے معاندین تصوف کا یہ مغالطہ دور ہو جاتا۔ فقیر کہتا ہے، کہ

اگر صُوفی کا لفظ حضور علیہ السلام کے زمانے میں رائج نہ ہونے کی وجہ سے بدعت اور قابلِ نفرین ہے تو اہلِ حدیث، اہلِ قرآن دیوبندی، وہابی، شیعہ، احمدی، مرزائی، ندوی اور لیڈر کب رائج تھے۔ کانگرسی، لیگی، احراری، خاکسار، نیلی پوش سُرخ پوش، خدائی فوجدار کہاں تھے؟ حکیم الامت، علامہ، مولٰنا، مولوی کا کب ذکر ہوا تھا؟ کبھی تو خوفِ خدا کے ماتحت مولائیت، مولانیت یا مولویت کے الفاظ کا مادۂ اشتقاق بھی تلاش کرنے کیلئے قلم اٹھایا ہوتا۔ کیا صحابہ کرام کی جماعت میں کوئی بزرگ مولوی ابوہریرہ یا مولٰنا معاذ بن جبل یا مُلّاں ابنِ سعود یا علامہ ابنِ عباس یا حکیم الامت ابن عمر رضوان اللہ علیہم اجمعین مشہور تھے۔ اگر مخالفین کے اپنے گھر میں یہ بدعت دھڑلے سے جاری ہے تو بچارے صوفی کو لفظ صُوفی کے عجیب وغریب اشتقاقات بتا بتا کر کیوں شرمایا جاتا ہے ؏

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

معترض اتنا بھی نہیں سوچ سکتا۔ کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے کوئی دوسرا تعظیمی لفظ مستعمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ ان کے جتنے بھی فضائل تھے سب سے اشرف و اعظم انکی فضیلت صحابیت میں تھی۔ کیونکہ صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام بزرگیوں اور فضیلتوں سے بڑھ کر ہے۔ ان کا زہد، فقر، توکل اور عبادات صبر ورضا جو کچھ بھی ان کے فضائل تھے ان سب پر ان کا شرف صحابیت غالب تھا۔ پس جب کسی کو لفظ صحابی سے ملقب کر دیا گیا تو اسکے فضائل کی انتہا ہو گئی اور باقی کوئی محل ہی صوفی یا کسی دوسرے تعظیمی لفظ کا نہیں رہا۔ جس سے اس کو یاد کیا جائے۔

اگر اس تقسیم خطابی پر ذرہ بھی غور کیا جائے تو سمجھ آجائے گی۔ کہ صوفی یا مولوی مذہبی گروہ کی قسمیں نہیں۔ بلکہ یہ آدمیوں کے اقسام ہیں۔ بعض آدمی صوفی منش اور بعض مولوی صفت ہوتے ہیں۔ بہرحال ہر مومن یا دیندار صوفی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کوئی مومن ایمان وعمل صالح کے ساتھ جب موافق ہوتا ہے تو اسی کو عام لوگ صُوفی کہتے ہیں۔ اسی طرح جب مولوی بھی ایمان وعمل کے دائرہ میں قدم رکھتا ہے تو اپنی مولویت کے حسب ایمان کو پاتا ہے اس پر مولویت کے لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ کیا یہ ظلم نہیں کہ تصوف کو تو اس قدر کر دیا جائے اور مولویت کے لئے خود بھی گناہِ عظیم سمجھا جائے۔ کیا مولوی کا مادہ اشتقاق تلاش کرنیوالے کو اس قدر وسیع میدان نہیں مل سکے گا۔ افسوس کہ آج یہ مسلمان جن کے پاس لے دیکر قرآن وحدیث اور فقہ وتصوف کا ہی سرمایہ محافظِ ایمان تھا، خود بخود اس کے نیست ونابود کرنے کے درپے ہو رہے ہیں۔ حالانکہ مسلمان کے پاس جو کچھ ہے سب کارآمد ہے۔ اور بعض چیزیں اگر آج کارآمد نہیں سمجھی جاتیں توکل (گذشتہ) تک وہ ضرور کارآمد چیزیں تھیں۔ فقیر

کا مطلب ان الفاظ سے محض یہ ہے کہ جن بزرگوں نے جو کچھ کیا اپنے زمانے میں نورِ نبوت کے ماتحت کچھ دیکھ کر کیا۔ اور وہ اس پر مامور تھے۔ اب ان پر نفرین کرنا یا یہ کہنا کہ ہمارے وقت کے لئے ان کی مساعی کارآمد نہیں کس طرح حق بجانب سمجھا جاسکتا ہے۔ صدیوں کی مخلصین اسلام کی محنتوں کو اکارت قرار دے دینا اور چند لمحوں میں ایک باخدا جماعت کے حق میں یک طرفہ معاندانہ ڈگری جاری کر دینا بڑی زود کاری ہے +

ایسی ہی غلط فہمیوں کی اصلاح کے لئے جن میں اکثر علماء ظاہر اور صوفیاء ناقص مبتلا رہتے ہیں۔ علامہ ابوالنصر سراج نے اپنی بابرکت تصنیف کتاب اللمع میں وہ کچھ ارشاد فرمایا ہے کہ جس کے پڑھ لینے کے بعد ایسے شکوک و اوہام قریب بھی نہیں بھٹکتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ کہ:۔

اللہ تعالےٰ نے تمام مومنین سے بلند و بالا مرتبہ ان کا رکھا ہے جو اولی العلم اور قائمین بالقسط اور ملائکہ کے بعد انہی کی شہادت پیش کی ہے۔ چنانچہ فرمایا شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ۔ اور آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علماء کو جانشین انبیاء علیہم السلام ارشاد فرمایا ہے۔ سو یہ القاب میری تحقیق میں ان لوگوں کے حق میں وارد ہوئے ہیں جو کتاب اللہ کا سررشتہ مضبوط تھامنے والے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے پورے کوشاں اور صحابہؓ اور تابعین کے نقش قدم پر چلنے والے اور اللہ تعالےٰ کے اولیاء متقین و صالحین کی راہ اختیار کرنے والے ہیں اور ایسے اشخاص کو طبقات سہ گاہ میں رکھا جاسکتا ہے۔

ایک طبقہ اربابِ حدیث کا ہے، دوسرا فقہاء کرام کا، تیسرا صوفیاء عظام کا۔ بس یہی طبقات سہ گانہ اولوا العلم اور قائم بالقسط کہے جانے کے مستحق ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے جانشین ہوتے ہیں۔

بہت سے امور تو صوفیہ اور محدثین و فقہا کے درمیان مشترک ہی ہوتے ہیں اور جو عقائد ان کے ہوتے ہیں۔ وہی ان کے بھی ہوتے ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی یہ اور وہ دونوں گروہ اپنے لئے واجب سمجھتے ہیں علوم و فنون سے جس طرح وہ کام لیتے ہیں یہ بھی لیتے ہیں۔

لیکن اس اشتراک کے بعد صوفیاء انواع عبادات، حقائق طاعات اور اخلاق جمیلہ سے جن درجات عالیہ اور منازل رفیعہ کو طے کرنے لگتے ہیں، وہاں تک علماء ظاہر اور فقہا اور اصحاب حدیث کی رسائی نہیں ہوسکتی اور صوفیاء کے امتیازی خصوصیات سے جن میں دوسرے طبقات ان کے ساتھ شریک نہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی توحید بالکل خالص

ہوتی ہے۔ غیر اللہ سے وہ کسی صورت بھی دل نہیں اٹکاتے اور ان کی کو صرف اللہ ہی سے لگی رہتی ہے۔ وہ اللہ ہی پر نظر رکھتے ہیں اور ان کا تمام تر مقصود و مطلوب اللہ ہی ہوتا ہے۔ وہ قناعت کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں۔ قلیل کو کثیر پر ترجیح دیتے ہیں۔ غذا، لباس اور ہر قسم کے سامان دنیوی سے صرف مایحتاج کو اختیار کرتے ہیں۔ بجائے تونگری کے تنگدستی، بجائے سیری کے گرسنگی، بجائے افراط کے قلت، بجائے جاہ و حشمت کے تواضع ان کی پسندیدہ خصلتیں ہوتی ہیں۔ تمام علائق و اسباب سے قطع نظر کر کے صرف رب العزت جل و علا شانہٗ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ نیکیوں اور طاعتوں کی جانب خلوص نیت کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہیں۔ بلاء الٰہی پر صابر اور قضاء الٰہی پر راضی رہنا ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ انکے تمام اوصاف و اخلاق سنتِ نبویؐ اور آثار صحابہؓ کی مطابقت میں ہوتے ہیں۔ گویا سب سے بڑا صوفی وہ ہے جو سب سے زیادہ عامل بالقرآن اور متبع سنت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ جب عرصہ تک اپنے علم و معلومات کے مطابق عمل کرتے رہتے ہیں تو اللہ کریم انکو وہ علم بھی عطا فرما دیتا ہے جو پیشتر انہیں حاصل نہ تھا۔ اور یہ علم ان ہی کے ساتھ مخصوص رہتا ہے۔ وہ ان کے نفوس میں تزکیہ اور قلوب میں جلا پیدا کرتا ہے۔ کثرت معاصی و شہوات، حب جاہ، طمع، حرص، خود پسندی وغیرہ سے جو زنگ الواح قلوب پر جما ہوتا ہے، وہ دھل جاتا ہے۔ اس وقت ان پر اسرار غیب منکشف ہو جاتے ہیں اور ان کی زبانیں حقائق عالیہ کی ترجمانی کرنے لگتی ہیں۔

یاد رکھئے کہ اسلام اگر فطری اور ابدی مذہب ہے، تو اس کی روح تصوف بھی ابدی ہے۔ اور جہاں تک تحقیق تصوف کے ساتھ زہد و عبادت اور مجاہدہ و ریاضت کی روشنی کا تعلق ہے۔ تصوف کی ابتدا خود آغاز اسلام ہی میں ہو چکی تھی چنانچہ اسی کے عمل و علم کے ماتحت حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ایک مقدس و ممتاز جماعت نظر آتی ہے۔ جن کی طبقات ابن سعد قسم اول جلد دوئم ص۲۸۷ میں حضرت عثمان بن مظعون، حضرت باہلی، حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اصحاب صفہ ایسی جلیل القدر ہستیوں کی ایک فہرست ملتی ہے۔ جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء کے مطابق اسلام کے دینی مقاصد کی تکمیل کیلئے قیام پذیر ہوئی جن کا شیوہ یہ تھا کہ اپنی زندگی عبادت، تعلیم قرآن و حدیث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت پذیری پر ہی وقف سمجھتے۔ ان کے معاش کے مختلف ذرائع تھے کچھ لوگ تو جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتے اور ان کو فروخت کر کے اپنے بھائیوں کیلئے کھانے پینے کا سامان مہیا کرتے۔ اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور مسجد کی چھت میں لٹکا دیتے۔ جو جو کھجوریں ان شاخوں سے ٹپک ٹپک کر گرتیں

یہ لوگ ان کو اٹھا کر کھا لیتے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں جب کہیں سے کسی قسم کا پاکیزہ کھانا آتا۔ تو حضور ان کے پاس روانہ فرما دیتے اور جب دعوتوں پر ضروری سمجھتے تو ان کو بلا کر ان کے ساتھ خود بھی بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضور علیہ السلام اس جماعت کے افراد کو کھانے کیلئے مہاجرین وانصار پر تقسیم بھی فرما دیتے اور اپنی اپنی مقدور کے مطابق ہر شخص ان میں سے ایک ایک دو دو حضرات کو اپنے ساتھ لے جا کر کھانا کھلاتا۔ حضرت سعد بن عبادہ رضؓ جو نہایت دولتمند اور مخیّر صحابی تھے، بعض اوقات مسجد کے اسّی اسّی مہمانوں کو اپنے ساتھ لے جاتے اور کھانا کھلاتے۔ حسب تحقیق علامہ شبلیؒ ان حضرات کی تعداد چار سَو کے قریب تھی۔ لیکن ایک زمانہ میں اسقدر تعداد نہیں ہوئی اور نہ ہی صفہ میں اس قدر گنجائش تھی۔ بلکہ یہ تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں کا مفصل حال علامہ ابن الاعرابی احمد بن محمد البصری المتوفی (سنہ ۳۴۰ھ ہجری المقدس) جو ابن مندہ کے استاد تھے، نے ایک الگ تصنیف میں لکھا ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دو صفحہ کا ایک رسالہ اصحابِ صفہ کے نام میں لکھا ہے جس میں ایک سو آدمیوں کے نام بترتیب ہجا مذکور ہیں۔ اصحاب صفہ کا بخاری شریف باب المغازی وغیرہ میں اور صحیح مسلم میں جستہ جستہ مقامات پر ذکر کیا گیا ہے۔ نیز مسند ابن حنبل جلد دوم ص ۱۳۷ اور کچھ اضافہ کے ساتھ زرقانی میں بھی درج ہے۔ بلکہ بالوضاحت یوں بھی بیان ہُوا ہے۔ کہ ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل جاتے تھے۔ یہ حضرات دن بھر بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سُنتے اور رات کو چبوترہ پر پڑے رہتے۔ ان کے پاس چادر اور تہ بند دونوں چیزیں ایک ساتھ کبھی موجود نہیں ہوئیں۔ یعنی چادر ہوتی تو تہ بند نہ ہوتا اور تہ بند ہوتا تو چادر نہ ہوتی۔ چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی جسکو پنجابی میں گلمی مارنا کہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کو ان لوگوں کا اسقدر خیال تھا کہ ایک مرتبہ حضرت خاتونِ جنت جگر گوشۂ رسول اللہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے چکی پیسنے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ جانے کی شکایت کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک کنیز کی درخواست کی تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ تم کو کنیز دوں اور صفہ والے بھوکوں مریں۔ سبحان اللہ صفہ والوں پر کتنی رحمت تھی۔

مگر ان مقدس انسانوں کی اس کیفیت کو رہبانیت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ قرآنِ کریم میں تحت آیۃ لایسئلون الناس الحافا (یعنی وہ لوگ چمٹ کر سوال کرنا نہیں جانتے) سے بعض مفسرین نے یہی جماعت مراد لی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف موجودہ دور کے بعض غرض پرست ملّاؤں نے تصوف کو بدنام کرتے وقت ان حضرات پر بھی اتہام

لگا ہی دیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اگر ایسا ہوتا تو حضور علیہ السلام ان کی حمایت واعانت کیوں فرماتے۔ بلکہ یہ جماعت رہبانیت کے ماتحت علم وعمل کی بنا پر ممنوع قرار دیدی جاتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ اور نہ ہو سکنا ممکن تھا۔ اہل دل ہمیشہ سے جہان میں موجود رہے ہیں اور اس وقت تک خدا کے فضل سے دنیا میں موجود رہیں گے۔ جب تک اس جہان کا قیام رہے گا اور خدائے واحد جلشانہٗ اپنے مقبول و پرستار بندوں سے دنیا کو ہمیشہ آباد رکھے گا۔ اور اس کے عبادت گذار ومخلصین کبھی ذلیل وخوار نہیں ہوں گے۔ چونکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام فطری اور ابدی مذہب ہے۔ لہٰذا اسکی ظاہری و باطنی، صوری ومعنوی حقیقت (تصوّف) کو بھی بفضلہ تعالےٰ زوال ونقصان کا اندیشہ نہیں، خواہ معاندین ومادہ پرست اس پر ہزار حملے کریں۔ شعر

شوربختاں بآرزو خواہند — مقبلاں را زوالِ نعمتِ جاہ
گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

پس اہلِ حرص وہوا کی علالت اور ظاہریت کے حامیوں کی بطالت اس مسئلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ کہ خدائے واحد کے مقدّس ذکر سے قلوب مومنین خالی ہوجائیں اور نفس کے پجاری حق پر فتح حاصل کرسکیں۔

تصوّف کی ابتدا

تصوّف اپنے عملی پہلو کے لحاظ سے ایک وہ طریق کار ہے جسکی ابتدا جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر ہوا ہے آغازِ اسلام ہی میں ہوچکی تھی، اور یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضور علیہ الصلوات والسلام (فداہ امی وابی) کے باطنی وصدری کوائف اور رب العزت کے حضور میں وہ پاکیزہ ودلپسندیدہ ادائیں (جو اعلانِ نبوّت سے قبل اور اظہارِ نبوّت کے بعد حصولِ معرفت وخوشنودی باری تعالےٰ کے معاملہ میں ظہور میں آئیں) کا نام تصوّف ہے۔ مگر بعض مخالفین تصوّف نے اہل تصوّف کے تبتل معاملہ میں اور ترکِ دنیا کے خیال کو جو کسی خاص سبب سے ایک وقت معین کے لئے اہل تصوّف میں پایا گیا۔ نہایت غلط بیانی اور ہٹ دھرمی سے رہبانیت کی سرحد میں ملانے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ اُن لوگوں کی اخلاقی وعلمی کمزوری ہے، کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک طالب علم حصول علم دین کیلئے، ایک کاریگر حصول معاش کیلئے، ایک سیاح اپنے مشن کیلئے۔ ایک ملازم اطاعت حکمران کیلئے اگر سالہا سال تک گھر اور وطن سے دور رہتا ہے اور اسکی زندگی پر رہبانیت کا شبہ بھی نہیں کیا جاتا۔ تو پھر کیا یہ نافہمی نہیں کہ ایک حق کے متلاشی نے اسی طالب علمانہ طریق پر اگر چند سال زہد وریاضت میں گزار دیئے یا اصلاحِ نفس کیلئے کچھ عرصہ کسی پیر طریقت کے ارشاد پر بادیہ پیمائی کی تو اس پر جھٹ رہبانیت کیوں ٹھونس دی جائے۔ جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین وتبع تابعین کی مقدّس

جماعتوں میں بھی خود ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔ جن کا وہی عمل تھا جو آج کل کے ایک خداشناس صوفی کا ہے۔ اور حضور علیہ السلام نے ان کو صوفی کے اس کام سے نہ مطعون فرمایا۔ اور نہ ہی ان کے اس عمل کو رہبانیت کی کڑی سے تعبیر کرنے کا حکم دیا۔

متصوفین حضرات کے تمام مضامین تصوّف اور کتابوں میں یہ امر بطور قدر مشترک کے پایا جاتا ہے۔ کہ تصوّف اور صوفی پر تنقید کے وقت یہ لوگ مریدوں (صحابہ کرام) کو تو دیکھتے ہیں، لیکن عین اسی وقت ان کے پیر (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ اگر ان لوگوں کی نظریں دونوں جانب ہوتیں، تو ان کی بہت سی غلط فہمیوں کا خود بخود ازالہ ہو جاتا۔ افسوس کہ ان لوگوں کو یہ توفیق حاصل نہ ہوئی۔ اور تعصب کے ماتحت یک چشم ہی رہے۔

اگر یک چشم بر بندم گناہیست   وگر با ہر دو بینم شرط راہیست

مقام غور ہے کہ کتنی تگ و دو کے ساتھ صوفیوں کے فعل چلہ کشی کو بدعت کا رنگ دے کر اچھالا جاتا ہے اور یہ محض اس لئے کہ ان لوگوں کے زعم باطل میں صوفی کا چلہ کشی کرنا رہبانیت کا جزو اعظم ہے۔ حالانکہ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی اولوالعزمانہ اور پیغمبرانہ شان رکھنے والی ہستی کے لئے (چلہ) یعنی عبادت کیلئے چالیس دن کی میعاد مقرر فرمائی جانے کا بڑی وضاحت سے ذکر ہے۔ صوفیوں کی چلہ کشی کو اگر بے معنی اور خودکشی بھی مان لیا جائے تو یہ بتائیے کہ قرآنِ کریم کی اس اربعین (چلہ) میں کیا حکمت تھی۔ اگر مولا کریم موسےٰ علیہ السلام سے کوئی رازدارانہ بات ہی فرمانا چاہتے تھے۔ تو یوں ہی بغیر چلّہ (اربعین و ثلثین) کے بھی فرما سکتے تھے۔ کیا حق تعالےٰ اس امر پر قادر نہیں (نعوذ باللہ) کہ پلاؤ، قورمہ، قلیہ کھلا کر نرم قالین پر بیٹھے ہوئے اپنے ایک بندے سے مخاطبت فرمائیں، ہو سکتا ہے اور ضرور ہو سکتا ہے۔ قرآنِ کریم کے ایک اور قصہ پر غور فرمائیے کہ زکریا علیہ السلام اولاد کے لئے دعا فرماتے ہیں جواب میں یہ خوشخبری ملتی ہے کہ ہم تجھ کو یحییٰ نام کا بیٹا عطا فرمائیں گے۔ عرض کرتے ہیں' الٰہی وہ کیونکر ہو گا۔ میں بوڑھا ہوں اور بیوی میری بانجھ ہو چکی ہے۔ فرمایا ہاں ملے گا۔ اور ضرور ملے گا۔ عرض کیا کوئی نشانی فرمائی جائے۔ فرمایا تو تین دن خاموشی (چُپ) کا روزہ رکھ اور بغیر اشارہ کے کسی سے بات نہ کر اور اللہ تعالیٰ کا صبح و شام کثرت سے ذکر کر۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو بیٹا ملا۔ مگر تین دن کا یہ ایک مختصر سا چپ کا روزہ اور مجاہدہ بیٹے کے پیدا ہونے سے کیا تعلق رکھتا تھا

جبکہ بیٹا رب العزّت کی رحمت اور مہربانی ہی سے ملتا تھا معلوم ہوا کہ قدرت کے کچھ قوانین ہیں۔ اور عموماً نتائج ان ہی قوانین کی پابندی سے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر علمی تحقیق سے کام لیا جائے تو مجاہدہ کا سب سے بڑا رکن ایک چلہ کشی ہی ہے جس کے بغیر مجاہدہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ یہ فعل چلہ کشی حضرات انبیاء کرام علیہم السّلام کی مخصوص چیزوں میں سے ہے۔ اور تمام اولیاء کرام اسی کی برکات سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چلہ کے لئے مخصوص اور موکد مسائل میں سے ایک یہ مسئلہ بھی ہے کہ جس شخص کی بسراوقات اپنی ذاتی اور قوتِ بازو کی کمائی پر نہ ہو۔ اس کو چلہ کشی نہ اختیار کرنی چاہئے۔ کیونکہ خیرات و زکوٰۃ کھانے والے آدمی کو اس راہ میں قدم رکھنا عبث ہے۔ اس لئے کہ مشتبہ روزی والا آدمی کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بالخصوص قرض لیکر چلہ کشی میں روٹی کھانا تو زہر ہلاہل کا حکم رکھتا ہے۔ ہر قرضدار کو قرض ادا کر کے یہ شغل اختیار کرنا چاہئے۔ ورنہ سب کچھ رائگاں جائیگا۔ صدقات وخیرات اور قرض کی وجہ سے شکم سیری بندے میں سستی اور غفلت کے علاوہ بے حسی شقاوت قلبی اور بے غیرتی پیدا کرتی ہے۔

چلہ کے ساتھ نیت اعتکاف ضروری ہے۔ اور مدت چلہ چالیس دن ہوتی ہے۔ جسکو قرآن کریم نے بھی اربعین (چالیس دن) فرمایا ہے۔ اور سرکارِ دو جہاں سرورِ کائنات فخرِ موجودات سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے چلہ مبارک غارِ حرا کا ذکر بھی احادیثِ شریفہ میں بایں الفاظ آتا ہے۔ من اخلص للہ تعالیٰ اربعین صباحًا ظھرت لہ ینابیع الحکمۃ علی لسانہ من قلبہ ط یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے چالیس دن خلوص سے گزار دیے حکمت (رازداری) کے چشمے اس کے دل اور اس کی زبان پر چل پڑتے ہیں۔ یہاں یہ مسئلہ بھی یاد رہے کہ باطنی انکشافات کیلئے چلہ کشی میں پاکیزگی مکان وطعام نہایت ضروری ہے۔ کسی شے کا حلال اور جائز ہونا اور چیز ہے اور پاکیزہ ہونا اور ہے اور بحکم قرآن کریم جو حلال چیز پاک نہ ہو وہ خبائث میں داخل ہے۔ مثلاً مشرکین کے ہاتھ دکان اور گھر کا کھانا ناپاکی میں سے ہے جسکی مسلمان پرواہ تک نہیں کرتے۔ پھر حضور علیہ السّلام کا یہ ارشاد حُبِّبَ عَلَیْہِ الْخَلَاءُ۔ یہ خلوت کی تنہائی کیوں مرغوب کرائی گئی۔ وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا۔ کا ارشاد (یعنی یاد کر نام رب اپنے کا اور الگ ہو طرف اسکی الگ ہونا) سے کیا مطلب تھا۔ کیا اس سے مراد انقطاع عملیات سفلی اور استحکام عملیات علوی اور اہتمام خلوت وتنہائی ہی ثابت نہیں ہوتا تاکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی غیر کا لگاؤ نہ رہے۔ یہ غارِ حرا کا چلہ اور اس کا سارا قصہ جو بخاری اور مسلم کی سند سے مروی ہے کیا ہے۔ یہ چند خشک کلچے اور بہت کم مقدار کے ستو لے کر مکہ معظمہ سے چند میل دور درندوں والے بیابان کی پہاڑیوں میں

مسلسل راتیں گزارنا اور دشت عرب کے ایک ہیبت ناک کھوہ میں تن تنہا کالی گھڑیاں بسر کرنا، چلہ کشی نہیں تو اور کیا تھا۔ اور پھر ایک بار نہیں۔ بروایت ابن ہشام (مِنْ کُلِّ سَنَةٍ شَهْرًا ط) یعنی ہر سال میں ایک مہینہ حضور علیہ السلام غارِ حرا میں چلہ کشی فرماتے تھے۔ چنانچہ چودھویں صدی کے نامور مورخ اور فاضل محقق علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب سیرۃ النبی علیہ السلام کی جلد اول ص۱۸۶ میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ میں تین میل پر ایک غار تھا جس کو حرا کہتے ہیں، حضور علیہ السلام مہینوں وہاں جاکر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے۔ وہ ہو چکتا تو پھر گھر پر تشریف لاتے۔ اور پھر وہاں جاکر مراقبہ میں مصروف ہو جاتے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ وہاں جاکر (غارِ حرا) میں تحنث یعنی عبادت فرماتے تھے۔ یہ عبادت کیا تھی۔ عینی شرح بخاری میں ہے قِیْلَ مَا کَانَ صِفَةُ تَعَبُّدِہٖ اُجِیْبَ بِاَنَّ ذَالِكَ کَانَ بِالتَّفَکُّرِ وَالْاِعْتِبَارِ ط ترجمہ۔ یہ سوال کیا گیا ہے کہ آپ کی عبادت کیا تھی۔ جواب یہ ہے کہ غور و فکر اور عبرت پذیری اور یہ وہی عبادت تھی جو آپ کے دادا جان ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کی تھی۔ ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی دھوکا ہوا۔ چاند نکلا تو اور بھی شبہ ہوا اور آفتاب پر اس سے زیادہ۔ لیکن جب سب نظروں سے غائب ہو گئے تو بے ساختہ پکار اٹھے اِنِّیْ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ۔ یعنی میں فانی غروب ہونے والی چیزوں کو نہیں چاہتا۔

ایک مغربی مؤرخ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عبادت کی کیفیت اس طرح ادا کی۔ کہ

سفر و حضر میں ہر جگہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے تھے۔ میں کیا ہوں۔ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے۔ نبوت کیا شے ہے۔ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں، کیا کوہ حرا کی چٹانیں، کوہ طور کی سر بفلک چوٹیاں کھنڈر اور میدان کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا۔ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ گنبد گرداں، گردش لیل و نہار، چمکتے ہوئے ستارے، برستے ہوئے بادل، کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔

نبوت کا دیباچہ یہ تھا۔ کہ خواب میں آپ پر اسرار الٰہیہ منکشف ہونے شروع ہوئے۔ اور جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے تھے بعینہٖ وہی پیش آتا تھا (کیونکہ وحی کے انواع میں ایک خواب بھی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی شرح میں ہے اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِہٖ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْیِ الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ فِی النَّوْمِ ط چنانچہ بخاری کتاب التعبیر میں زیادہ صاف طریقہ پر یہ ادا کیا گیا ہے) ایک دن جب آپ حسب معمول غارِ حرا میں مراقبہ میں مصروف تھے تو فرشتہ غیب نظر آیا جو آپ سے کہہ رہا ہے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ط یعنی پڑھ اس خدا کا نام۔ جس نے

کائنات کو پیدا فرمایا۔ الاخر۔ آپ گھر واپس تشریف لائے۔ تو جلال الٰہی سے لبریز تھے۔ طبیعت میں ایک اضطراب تھا۔ جو جلال الٰہی کا تاثر اور نبوت کے بارِ گراں کی عظمت کا تخیّل تھا۔ آپ نے کیا دیکھا۔ ناموس اعظم نے کیا کہا۔ کیا کیا مشاہدات ہوئے۔ یہ وہ نازک باتیں ہیں۔ جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں۔ اب اگر غریب صوفی اس سنّت پر عمل کرے تو رہبانیت کا علمبردار کہلائے۔ کیا عملی اسلام یہی ہے - کہ فرعون کے تکیئے، قارون کے خزانے، نمرود کے محل، مادر پدر آزادی کی ڈینگیں شداد کے جنت، ہامان کے زم قالین اور تیغ ابلیس کے سے تخت و بخت اور رئیسانہ چو چلے جن میں نفس پرستی کے مکمل مستانہ مشاغل ہوں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم۔ یاد رکھیئے صوفی کی جَو کی مسنون روٹی اور غار حرا کے خشک ستو، خلوِ معدہ کی کڑکڑاہٹ اور دماغی خشکی ہی موجودہ مسلمانوں کے بناوٹی اسلام سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ جس میں ملکوتی وجود کا مکاشفہ اور ناسوتی شہود کا مکالمہ ہوتا رہتا ہے۔ اور یہ صوفی کی خود ساختہ وہمی چیز نہیں۔ بلکہ بانیٔ اسلام کے مستقل چلہ کی مقدس خیرات ہے۔ جیسا کہ مسلم اور ترمذی میں حضور علیہ السّلام کے لئے باصرہ پر عجیب و غریب انوار کی تجلیات غیبی ہستیوں کا ظہور اور بہ تصیح محدّث سہیلی، جبرئیل علیہ السّلام سے پہلے آپ کو پہاڑ کی غار میں حضرت اسرافیل علیہ السلام کے ملکوتی وجود کا مکاشفہ مسلسل تین سال تک ہوتے رہنا اور اس کے بعد جبرائیل امین علیہ السّلام کے وجود کا وہ مشہور ناسوتی ظہور جسے سب جانتے ہیں۔ یہ کس فعل کی برکات ہیں۔ یہی جسکو مخالفین صوفی کا بدعتی چلہ اور رہبانیت کی سرحد کا جوڑ قرار دیتے ہیں۔ اُف۔ ہزار نکتۂ باریک تر ز مو ایں جا است۔ ہم کہتے ہیں کہ صوفیوں اور فقراء میں مراقبوں اور مجاہدوں کا جو آئین قائم ہے، اور ان میں سے بعض جو چشم بند و گوش بند و لب بہ بند۔ اور بعض حالم تصور اور بعض عالم محویت میں مراقبے کا حظ حاصل کرتے ہیں۔ وہ اسی سنتِ نبویؐ کے اتباع میں بیٹھتے ہیں۔ روحانی ترقی اور عرفانی مشاہدوں کی بسم اللہ یہیں سے اور اسی طرح ہوتی ہے۔ کیونکہ تصوّف میں تزکیۂ باطنی سے بغیر عرفانی مشاہدات نہیں ہوتے۔ اور نہ انوارِ آسمانی کا نزول ہوتا ہے۔

کاش کہ یہ لوگ صوفیائے کرام کی عملی زندگی کے بعض حصّوں پر نکتہ چینی اور تنقید کرتے وقت صحابہ کرامؓ ہی کی زندگیوں کو سامنے نہ رکھتے تاکہ ان کو کسی صوفی یا پیر کا مقابلہ کرانے کے لئے پیرِ حقیقت (رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے دستور العمل سے موازنہ کی آسانی ہو جاتی اور وہ اس الجھن سے جو مریدوں (صحابہ کرامؓ) سے موازنہ کرانے سے اپنی جانوں کو جوکھوں میں ڈال لیتے ہیں محفوظ ہو جاتے۔ کیونکہ صحابہ کرام کی لکھو کھہا زندگیوں کا حامل موجودہ زمانے کا ایک ہی

متبع سنت پیر بیک وقت نہیں ہو سکتا اور پیر کا مقابلہ مرید سے کرانے میں بہت سے ایسے اشکال پیدا ہو سکتے ہیں جن پر غور کرنے والا انسان خواہ مخواہ گمراہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً مقابلہ میں یہ کہنا کہ موجودہ صوفی کا حبس دم سے سبق پڑھنا یا نفی اثبات پکانا ایک خلاف اسلام طریق اور بدعت ہے۔ کیونکہ یہ صحابہ کرام میں نہ تھا۔ فقیر کہتا ہے کہ اگر ایسا طریق عبادت بفرض محال صحابہ کرام میں سوائے چند ایک کے نہیں ملتا (کیونکہ وہ ابتدائے اسلام میں تبلیغ اسلام اور مجاہدانہ سرگرمیوں میں اپنا وقت گزارنے کے باعث یہ صورت وطریق عبادت الٰہی اختیار کرنے کا وقت ہی نہیں پا سکے) تو کوئی اعتراض کی بات نہیں ان کے اور ہمارے پیشوا سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو پایا جاتا ہے۔ اگر باور نہیں تو جو یہ حدیثوں میں غط کا لفظ آیا ہے۔ جس کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں حتیٰ ظَنَنْتُ اَنَّہُ الْمَوْتُ۔ میں نے ایسا خیال کیا کہ موت طاری ہو گئی ہے۔ اور جس کا ترجمہ زرقانی ص۲۴۶ میں یہی حبس النفس کیا گیا ہے۔ یہ کیا ہے صوفی اگر حبس دم کرے تو اس کو گردن زدنی ٹھہرا کر جوگ و اشراق کا حامل قرار دیا جائے۔ اور محدثین اگر غط یعنی حبس النفس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت کر دیں تو ان کو کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔ اور طیالسی کی مشہور سند سے اس کی تائید میں حدیث حرا کا یہ ٹکڑا بھی پیش کیا جاتا ہے کہ غط کے ساتھ جبرائیل علیہ السلام کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں فَاَخَذَ بِحَلْقِی (جبرائیل نے میرے حلق کو دبایا) یعنی سانس روک دی۔ آخر سانس روک دینے کا کیا نفع تھا۔ جب کہ عالم الغیب کا ادراک یوں بھی ہو سکتا تھا۔ مگر باطنی قویٰ کا بیدار ہونا یاد رکھو اس حبس نفس کو بھی ادراک کے لئے ایک فطری حالت قرار دیا گیا ہے کاش کہ یہ خدا کے بندے جس چیز کے اہل نہیں اس پر قلم نہ اٹھائیں اور اپنی بے خبری اپنے تک ہی محدود رہنے دیں۔ کسی مسئلہ کی عدم واقفیت ہوتے ہوئے اس پر قلم اٹھانا اور تمثیلات سے بحث کرنا دوسرے لوگوں کی گمراہی کا باعث بنتا ہوتا ہے اور ایسی حالت میں تمثیلی قیاس انسان کو غلط نتائج پر پہنچانے کا سبب بن جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اکثر اوقات ایسے مسائل مثالوں میں سلجھانے سے کھیر جیسی نرم شے کو بھی ٹیڑھا بنا دیتے ہیں۔

صوفی اگر کسی باطنی آواز کا اظہار کرے یا الہامی کیفیت کا مدعی ہو جائے تو پکا مجرم ٹھہرے اور شہد کی مکھی کا وحی الٰہی کی نسبت دعوے ہو تو یہ جائز اور قابل قبول، مکاشفۂ قبر حیوانات کے لئے تو ثابت اور جائز کیونکہ حدیث شریف میں ہے اور اگر صوفی اس کا راز دار کہلائے تو گناہ عظیم کا مرتکب۔ افسوس کہ لوگ انسانی شرافت و بلندئ مراتب اور اس کی خلافت کو نظر انداز کر چکے ہیں۔ ورنہ ان ہزلیات کو کام میں نہ لاتے۔ ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ علم نورانی ظاہری عقل وحواس کے

سوا دوسرے ذرائع سے بھی ممکن ہے۔ اور ہمیشہ حق تعالےٰ ایسی نظیروں کو قائم رکھتا ہے جن سے عقل و حواس کے توسط کے بغیر جاننا ثابت ہوتا ہے۔ کچھ نہیں تو ہر دس پانچ آدمیوں میں ایک آدمی ایسا پایا جاتا ہے جسکو ایسے سچے خواب آتے ہوں کہ بعض اوقات وہ حالات و واقعات جو ابھی ظہور پذیر ہونے والے ہوں دیکھ لیتا ہے اور اس وقت دیکھ لیتا ہے جب وہ عالمِ خوابیدگی کی حالت میں ہو، خدانخواستہ اگر یہ نظائر نہ ہوتے تو عقل کے بندوں اور حواس کے اسیروں نے تو ارادہ کر ہی لیا تھا کہ جس طرح بیچارہ صوفی مالیخولیا کا مریض قرار دیدیا گیا ہے۔ اسی طرح پیغمبروں کو بھی اگر نیت کی نہیں تو فہم کی غلطی کا شکار ٹھہرا ہی دیا جائے نعوذ باللہ من ذالک۔

پھر مخالفین تصوف و صوفی یہ اعتراض بھی کیا کرتے ہیں۔ کہ یہ صوفی کہلانے والے لوگ جو اپنی قلبی اور سمعی و بصری کیفیتوں میں قبض و بسط کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ بھی محض برہمن کی تعلیم کا اثر اور ہندو ویدانتیوں کی ویدانتی فقیری کا تتبع ہے۔ اور حقیقت میں اسلام کی تعلیمات میں قبض و بسط کا مسئلہ ایک لایعنی ڈھکوسلہ ہے۔

ان مریض القلب مسلمانوں کی ایسی واہی تباہی باتوں سے (جو درحقیقت الحاد مغرب کی مخالطت اور دہریت کی موانست سے لی گئی ہیں) حیرانگی ہوتی ہے کہ یہ دردمندانِ اسلام جوش میں یہ خیال ہی نہیں فرماتے کہ مسلمانوں کے کسی حصۂ عمل و دین پر حملہ کرنا خود اسلام کے کسی حصہ کو مجروح کرنا ہے۔ غریب مومن و مسلم جب بحکم لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ و والدہ والناس اجمعین۔ سب کچھ کسی پر لٹا چکا اور تمام کائنات کو چھوڑ کر کسی ایک کے قدموں سے لپٹ پڑا۔ تو کم از کم اس پر ایسی غداری کا الزام لگاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے انہیں تحمل و غور سے کام لینا چاہئے۔ کیا کوئی محبِ سرکارِ انبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے یہ چیزیں لے کر اپنے دین و ایمان میں داخل کر سکتا ہے نیت کی غلطی دوسری چیز ہے لیکن ایسی تغلیط بھی تحقیق کے بعد ہونی چاہئے۔ چند سنی سنائی سطحی باتوں پر مسلمانوں کے سوادِ اعظم اور تمام امت اسلامیہ خصوصاً فقراء اہلسنت والجماعت کو متہم کرنا شاید تجاوز عن الحد ہوگا۔

ایک چلہ کشی، خلوت، سمعی، بصری، قلبی مکاشفات و الہامات اور قبض و بسط پر کیا موقوف ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا دیکھنے والی آنکھ سے مطالعہ فرمائیے۔ سب کچھ ملے گا اور بڑی کھلی ہوئی حقیقتوں کے ماتحت ملے گا۔ اس غارِ حرا کی وحی کے بعد بخاری شریف میں ہے کہ فترۃ ہوئی یعنی وحی منقطع ہوگئی تھی لیکن اس کا اتنا اثر کہ حضور علیہ الصلوات والسلام اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دینا بہ نسبت زندہ رہنے کے آسان خیال فرماتے

گئے۔ اور اپنے آپ کو گرا دینے کی نوبت سے پڑھ بھی چکے تھے۔ جیسا کہ آیۃ شریف مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی کے ماتحت بعض مفسرین حضرات نے لکھا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمارے صوفیاء اگر اپنی قلبی کیفیت کی تعبیر کبھی بسط وقبض سے کرتے ہیں۔ تو یہ کچھ اسی فترۃ ہی کا بنا بنایا نقش نہیں ہے۔ دیکھو صحیح بخاری کی شرح فتح الباری کی کتاب التعبیر جلد ۱۲ صفحہ ۳۱۷ مطبوعہ مصر میں ہے کہ چند روز تک جب وحی رُک گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے۔ تاکہ اپنے آپ کو گرا دیں کہ دفعتہً حضرت جبرائیل علیہ السلام نظر آئے اور کہنے لگے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں جس سے آپ کو تسکین ہو گئی۔ لیکن جب کبھی پھر وحی رُک جاتی تو آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینا چاہتے تو پھر جبرائیلؑ نمایاں ہو کر تسکین دیتے۔ اور اس مسئلہ میں محدثین نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ وحی کا بار بار رُکنا اس لئے تھا کہ آپ رفتہ رفتہ اس کے برداشت کرنے کے عادی ہو جائیں۔ اُف کتنی سبق آموزیاں ہیں جن کے بعض لطائف و اسرار کے نہ سمجھنے پر آج نام نہاد مولوی بحث کرتے ہوئے کہہ گزرتے ہیں کہ یہ سب کچھ سرزمین ہند کے جوگیوں کا سرقہ ہے۔ بہت سے ان افراد کو جو اپنے آپ کو قادری خاندان کا غلام سمجھتے ہیں۔ بلکہ قادریہ بزرگوں سے خلافتوں کے بھی مدعی ہیں۔ یہ کہتے سنا ہے کہ یہ قبض و بسط کے قصّے جاہل صوفیوں کی اختراع ہیں۔ ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ حضرت سیدنا غوث الاعظم محبوب سبحانی شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ بھی اپنی انہی کیفیتوں کا ذکر فرماتے ہیں۔ جو حضور علیہ السلام کی فترۃ کے واقعات سے لفظ بلفظ متعلق ہیں۔ یعنی پہاڑ پر سے گرا کر اپنے آپ کو ہلاک کر دینے کے لئے محض اس لئے آمادہ ہو جانا کہ بسا اوقات قلبی بندش کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ مگر ان قادری غلاموں کی تصوف دشمنی کا کون علاج کرے۔ درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جو قادریت سے کوسوں دور ہو کر دوسرے لوگوں کو فریب دیتے ہیں اور دنیوی اغراض کے ماتحت قادری کہلا کر بزرگانِ دین کے تتبع سے روکنا چاہتے ہیں۔ جن کا قادری کہلانا اور حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ سے نسبت کا اظہار کرنا بھی دربار غوثیت کی توہین پر منتج ہوتا ہے۔ کیونکہ ان قادریوں کا باطن وہابیانہ اور ظاہر ایسا مولویانہ ہے کہ دیکھنے والا ان کی چکنی چپڑی باتوں سے ان پر قادری ہونے کا شبہ کر ہی بیٹھتا ہے۔ حالانکہ ان کو خدا کے بندوں سے دُور کا لگاؤ بھی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ایک قادری کہلانے والے مکار کی عملی کیفیت فقیر نے سُنی۔ جس سے خوف پیدا ہوا۔ کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ اور اس مسئلہ سے غافل ہیں کہ انہیں ایک دن خداوند عالم جل وعلا شانہٗ کے سامنے بھی جانا ہے۔ ایک دیوبندی عقیدے کے آدمی نے ان قادری کہلانے والے مولوی سے پوچھا کہ کیوں صاحب وظیفہ "یا شیخ" پڑھنا شرعاً کیسا ہے۔ مولوی صاحب

کو یہ تو معلوم تھا ہی کہ سائل دیوبندی جماعت کا ایک سرگرم رکن ہے۔ ممکن ہے صحیح جواب دینے سے مجھ سے بدگمان ہو جائے اور آنا جانا چھوڑ دے۔ جواب دیا کہ بھائی زندہ خدا کو چھوڑ کر مردوں کو پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ پکار تو فقیر کے نزدیک شرک کے قریب ہے۔ سائل جواب سن کر خوش ہوا اور ان قادری صاحب کی توحید پرستی کے گیت گاتا ہوا چلا گیا۔ پھر کسی دوسرے وقت اتفاق سے یہی مسئلہ ایک پکے قادری نے پیش کیا۔ مولوی نے دیکھا کہ اس کے ہاں سے گیارہویں شریف کی ماہانہ ایک دیگ اور انجمن کا چندہ آیا کرتا ہے۔ ہاتھ سے اسکو بھی نہیں کھونا چاہئے۔ بڑی متانت سے جواب دیا کہ بھائی یہ بات بھی بھلا دریافت کرنے کی ہے۔ ان بزرگوں کے بغیر خدا تمہارا کیا لگتا ہے۔ جب ہماری پکاروں کو یہ نہ سنیں تو خدا کب سنتا ہے۔ وظیفہ "یا شیخ" ایک مبتدی کے لئے تو مشغل راہ ہے۔ میں نے سالہا سال پڑھا ہے۔ اور اب تک پڑھتا ہوں جب تک پوری محبت سے سرکار بغداد کو پکار نہ لوں۔ بخدا قلب میں چمک نہیں آتی۔ اور مرجھایا سا رہتا ہے۔ شعر

نہیں ہم کو مفر اصلا جز حضرت کی خدمت کے ٹھکانا خلق کا بندے خدا کے ہیں جو کامل ہیں

پھر کسی تیسرے وقت میں یہی سوال کوئی اور سائل کرتا ہے تو اسکو جواب ملتا ہے کہ میاں یہ کسی جاہل کی اختراع ہے جس سے پرہیز لابدی ہے۔ ایسے لایعنی وظائف بجائے منزل پر لے جانے کے گمراہ کرتے ہیں اور جہلا کا فعل حجت نہیں ایسے گمراہ کن وظائف سے توبہ کر کے ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو بچاؤ۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ یہ ہے وہ ایمان و الیقان کا بلند درجہ جس کی بنا پر یہ لوگ پیران عظام کو طعن کرتے ہیں اور خود شیخیت کے مدعی بنتے ہیں۔ اور بعض تو ان لوگوں سے وہ ہیں جن کو سوائے کتابی تصوف کے اور کچھ بھی یاد نہیں ہوتا۔ بزعم خود صوفی ہیں اور اصطلاحات صوفیہ میں جا و بیجا استعمال سے بہت غلو کرتے ہیں۔ محسوسات میں مقید، کشف و سلوک سے بے بہرہ، مشاہدہ کی ہوا تک نہیں لگی۔ مگر کتابی معلومات اور عقل کی طبع آزمائیوں کے بل بوتے پر دوسروں کو بہکانے میں ہر وقت سعی لاحاصل کا انہماک رکھتے ہیں اور اس بدنیتی و کور باطنی کا نام خدمت دین ٹھہراتے ہیں۔ پھر قریباً قریباً یہی حال بعض ان لوگوں کا بھی ہے جو حضرات نقشبندیہ رحمہم اللہ تعالےٰ کی اطاعت کے علمبردار کہلاتے ہیں۔ حالانکہ مجددیت اور نقشبندیت کا سارا دارومدار انہی کیفیتوں اور لطائف و اسرار پر ہے۔

ایک مرتبہ ایک نقشبندی صاحب کہنے لگے یہ جو لطائف ستہ کا تذکرہ فقیروں میں ہوتا ہے۔ اس کا کیا ثبوت ہے ہم نے تو آج تک ان لطائف کی صفائی سے اخلاقی غرائز و خصائل کے اندر اعتدال پیدا ہوتا نہیں دیکھا سا اور نہ ہی اس

کی کوئی دلیل بزرگانِ سلف بلکہ صحابہؓ میں سے ہمارے معلومات میں آئی ہے۔ فآہا۔ ثم آہا ثم آہا۔ ان سے کون کہے کہ ممکن ہے صحابہؓ کی زندگی میں اس کی نظیر نہ ملے۔ مگر پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے کہ عمل کے لئے صرف مریدوں ہی کی زندگی کو کیوں لیا جاتا ہے۔ شیخ کی زندگی بھی سامنے رکھی جانی چاہئے۔ آخر بتایا جائے کہ حضور علیہ السلام کے واقعہ شق الصدر (سینہ کا چیرا جانا) کی کیا توجیہہ ہے۔ جس کے متعلق شاہ عبدالعزیز محدث کی تحقیق یہ ہے کہ شق صدر کا واقعہ پانچ دفعہ پیش آیا۔ اور وہ سینہ شق کیا گیا۔ جو ازل ہی سے انوارِ الٰہی کا گنجینہ اور اسرارِ توحید کا خزینہ تھا۔ کیا ایسے مولویوں کے پاس کوئی شرح و توجیہہ اس واقعہ کی ہے کہ سینہ چاک ہوا۔ قلب مبارک نکالا گیا۔ پھاڑا گیا۔ کوئی سیاہ سی چیز اس سے نکالی گئی۔ طشت میں کوئی چیز برف کی مانند لائی گئی جس سے قلب اطہر دھویا گیا، نور تاباں سے بھرا گیا۔ اور اس سے قلب نبیؐ علیہ السلام پر مُہر کی گئی جس کی ٹھنڈک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک بھی محسوس ہوتی رہی۔ جب پچاس سال کی عمر کے بعد بھی آپ اس واقعہ کو مدینہ منورہ کے اصحاب سے ذکر فرما رہے تھے۔ مگر نہ خون نکلا نہ ٹانکے لگے۔ نہ تکلیف ہوئی اور یہ سب کچھ ہو بھی گیا۔ اگر صوفی حضرات لطائف و اسرار کے ان مسائل کو ہم تک نہ پہنچاتے تو شاید ہم ان تمام باتوں کو خواب و خیال ہی کہکر ٹال دیتے۔ جیسا کہ واقعہ معراج شریف کے متعلق بعض لوگوں کو ذہول ظاہر ہو چکا ہے۔

مثل مشہور ہے۔ متعصب بات کہے انہونی جس سے تعصب ہو اسکی نیکی بھی بدی دکھائی دیتی ہے۔ اور جس سے پیار ہو۔ اس کا عیب بھی ثواب نظر آتا ہے۔ موجودہ دنیا پرست مسلمان چونکہ مذہب کے پاکیزہ اصولوں سے کانگرسی پنڈتوں کی صحبت و تعلیم کے ماتحت بہک گیا ہے۔ اس لئے صوفی کا ہر اسلامی فعل اس کو عیب دکھائی دیتا ہے۔ وہ مذہب کو نہرو ؔاور گاندھیوں کی عینک سے دیکھتا رہا ہے۔ اس لئے ان کے پیار کی وجہ سے اس گم کردہ راہ کو ایک زمانہ بھر کا مکار مہاتما نظر آتا ہے۔ مگر اپنا صوفی اسلام کا دشمن اور گمراہ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ پھر صوفیوں کے سیر و سلوک پر صرف طعن ہی نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ان کے برخلاف پارسیوں کی کتابیں دکھائی جاتی ہیں کہ ان کا کوئی موبد محسوس اور نامحسوس شہادت و غیب کے جہانوں سے گزرتا ہوا فردوس بریں تک پہنچا ہے۔

دور کی کوڑی لائے کہ صوفیوں کا ماخذ مل گیا۔ لیکن کاش کہ اتنی طویل مسافت طے کرنے کی بجائے کبھی آیت معراج شریف پر ہی نگاہ ڈال لیتے تو پارسیوں کی کتابوں سے بہت پہلے ان کو بخاری و مسلم کے اوراق میں ان آیات کبریٰ کا حال کھل جاتا۔ جن کا کچھ پتہ کبھی کبھی بچارے صوفی بھی دیتے ہیں۔ مگر کیا کیا جائے۔ یا تو قرآن کریم اور بخاری و مسلم سے واقعہ معراج شریف

حذف کر دیا جائے، یا اُن کے لئے دربارِ نبوت سے چودھویں صدی میں طریقِ کار کی کوئی نئی مشعلِ راہ مانگی جائے۔ کیا ان مومنین کا یہی فریب خوردہ ایمان نہیں۔ جس نے ان کو تصوف سے بھٹکا کر اور مدینہ منورہ کے تعلقات سے قطع کر کے کسی نئی نبوت کے دروازے پر جا کھڑا کیا ہے۔ عیاذاً باللہ۔

پھر صوفیوں کے اس فعل پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا طریقۂ اعدادِ صلوات و تسبیحات غیر شرعی ہے۔ اور گن گن کر ذکرِ الٰہی کرنے کا کیا فلسفہ ہے۔ اور اسکی عقلی ضرورت کیا ہے۔

پیر جی جب گناہ کریں تو کرتے ہیں ان گنت
نام لیتے ہیں خدا کا تو لیتے ہیں گن گن کے

لیکن یہ وجہ صرف غریب صوفیوں اور پیروں ہی سے کیوں پوچھی جاتی ہے۔ ان سے بھی پوچھی جانی چاہئے جن کے نزدیک نمازوں کی رکعتیں عددی، تسبیحات بھی عددی، رکوع بھی عددی، سجدے بھی عددی، تحمیدات بھی عددی، تکبیرات بھی عددی، تہلیلات بھی عددی، روزے بھی عددی۔ اور زکوتیں بھی عددی ہوتی ہیں۔ افسوس کہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی قابلِ اعتراض اور اپنا شہتیر غائب۔ کبھی تو اپنی چارپائی کے نیچے بھی یہ تحقیق کی ڈنگوری پھیرتی ہوتی۔ اگر ریاضیات کو قربِ الٰہی میں دخل نہیں ہے۔ تو یہ صوفیوں ہی سے کیوں پوچھتے ہو، سرکار انبیاء علیہم السلام سے اور امّ الکتاب سے پوچھا ہوتا۔ یہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی اربعین ذکریا علیہ السلام کے تعدادِ صوم، سال بھر کے مہینوں کی تعداد۔ ایامِ حج کی خاص گنتی، عزیز علیہ السلام کے معدود ایامِ بیہوشی، اور اصحابِ کہف کی مدتِ خواب کیا ہیں۔ خدا کی پناہ۔ تعصب کے میدان میں صوفی کا کونسا پہلو ہے۔ جس پر اعتراض نہ کیا جاتا ہو، غیر کی تو تمام بے اعتدالیاں بھی باعثِ تحسین۔ اور صوفی کی عبادتِ الٰہی اور زہد و قناعت و توکل علی اللہ بھی قابلِ نفرین ہیں۔ اور ان کی روٹی تک تو نہیں بھاتی۔ اور کچھ نہیں تو معترض یہی کہہ دیتا ہے کہ یہ کما کر نہیں کھاتے، یہ قوم کیلئے بار ہیں، یہ توکل کے پردے میں ہڈ حرام ہو کر بیٹھ گئے ہیں انہوں نے تعطل کا نام توکل رکھ لیا ہے۔ یہ لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ ان کے گھروں میں بجلی کے ہنڈے جلتے ہیں، مگر مرید بھوکا مرتا ہے۔ خدا جانے انہوں نے سہل انگاری کا اور احدی پن کا نام توکل کس طرح رکھ لیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ تعصب و جہالت بھی کتنی بُری چیزیں ہیں۔ خدا رحم فرمائے۔ ہوشمند کی بھی آنکھیں سی دیتی ہیں۔ کیا پیر اور شیخ کی یہی تعریف ہے کہ وہ بھوکا پیاسا، ننگا دھڑنگا، جنگل اور غلیظ مقامات میں پڑا رہے، کیونکہ معترض کو اس کے گھر کا

تمول چھپتا ہے۔ اگر اتنا ہی بغض و حسد تھا تو قرآن کریم سے سورۂ اعراف رکوع ۱۰ کی یہ آیت پڑھ لی ہوتی۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۔ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۔ مولا کریم فرماتے ہیں کہ زینت الٰہی جو بیش قیمت لباس اور ستھرے پاکیزہ کھانوں کی صورت میں اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کی ہیں اور انمول جواہرات اور لذیذ ماکولات و مشروبات اس سب کچھ کو کس نے حرام کیا ہے۔ بلکہ یہ تمام اسباب آسائش و آرائش اور انعام و اکرام سب مسلمانوں اور ایمانداروں کیلئے ہی تو ہیں۔ کہا گیا ہے کہ عمدہ لباس، طیّب کھانا، اچھا مکان، بہترین سواریاں، املاک و جائداد امارت و سلطنت مومن کیلئے ناجائز و معیوب ہیں۔ کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہو چکا ہے۔ کہ بلا تکلف زندگی بسر کرنا۔ میلے کچیلے پھٹے پُرانے کپڑے سے ننگ نہ کرنا۔ ایمان کی واضح نشانی ہے۔ ربّ العزّت کو اگر مومنین کو یوں ذلیل و خوار اور فقر و فاقہ میں دیکھ کر خوش ہونا مقصود ہوتا تو زکواتیں، صدقات اور حج جیسی بیش بہا رقوم خرچ کرنے والی عبادت فرض نہ فرماتا۔ ان عبادات کی فرضیت اور ان کی لاگت ہی بتا رہی ہے کہ ربّ العزّت جل و علا شانہٗ کو سرکارِ دوجہاں محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے غلاموں کی کوئی متموّل، حکمران صاحبِ ثروت اور غیور و پُرشوکت جماعت پیدا کرنا مقصود تھی۔ جن تنگ نظروں اور کم ظرفوں کو ایک پیرِ طریقت کے گھر میں بجلی کے چراغ کا جلنا اور قالین کا فرش پر نظر آنا ناگوار ہو وہ کیا جانیں کہ مولا کریم نے اپنے مقبول بندوں کیلئے کیونکر دین و دُنیا کے انعامات مرغوب فرمائے ہیں۔ اور وہ کس حکمت و عدل کے ماتحت ان کو اولوالعزمانہ شان میں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جس قوم کے راہنما گداگر، ذلیل، مفلوک الحال اور خانماں برباد ہوں وہ قوم دُنیا میں سلطان و حاکم، مخیّر و حاتم، علمبردار اقبال بخشش کرنے والی اور ملک کی مالک ہو سکے ہرگز نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ خداوندِ عالم کی یاد سے محروم انسان، دُنیا اور عقبےٰ کے انعامات سے بھی محروم و بے نصیب رہتا ہے۔ اسکی اپنی محرومی دوسروں کے آرام پر جلاپے کا سبب بن جاتی ہے۔ علامہ ابن جریرؒ نے کیا مزے کی بات کہی ہے۔ کہ جس شخص نے روئی اور کتان کا کپڑا باوجود حلال اور قادر ہونے کے نہ پہنا اور اسکی جگہ اون یا کم حیثیت بوریا پہنا، گیہوں اور پلاؤ کا کھانا ترک کر کے مسور کی دال، اور ساگ پات پر گزارا کرنا شروع کر دیا، یا شہوت کے خوف سے گوشت کھانا بند کر دیا اُس نے سخت غلطی کی۔ میسّر ہوتے ہوئے اللہ کی نعمتوں سے محروم ہونا قطعاً کفرانِ نعمت ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے یہاں کتنے بلیغ انداز سے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے ؎

کیا فقر ترے وہم میں ہے جوگ کا نقشہ
فطرت کے تقاضوں کو کرے دم میں جو برباد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدئ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

اسلام ہے وہ چشمہ عنایاتِ خدا کا
جس سے ہوئے شیخ پہ انعامِ خدا داد

مگر ہاں تقویٰ و طہارت، زہد و ریاضت، وساوس و خطرات، شب بیداری وغیرہ کے پیش نظر اور جسم کو قائم رکھنے کی ضرورت سے زاید نہ کھانا مسنون اور افراط و تفریط سے بچکر اعتدال کے ساتھ تزکیہ کرنا مستحسن ہے لیکن معاندین نے بات کا تبنگڑ بنا کر صوفی کی پرہیزگاری پر بھی کیچڑ اچھال ہی دیا ہے کہ یہ جوگیانہ زندگی گزارتے ہیں جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ پناہ بخدا۔ فراخی کا رزق کھاتے ہیں تو نشانۂ طعن بنتے ہیں اور اگر کنارہ کش ہوتے ہیں تو رہبانیت کے عامل کہلاتے ہیں، جائیں تو کہاں اور کریں تو کیا؟ حالانکہ یہ مسئلہ صوفیوں کی کتاب میں نہیں بلکہ نام نہاد مولویوں ہی کے صحیفہ ترمذی شریف میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بطحا کی زمین پیش کی گئی کہ سونا کردی جائے۔ مگر حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ رب یوم النشور میں التجا فرماتے ہیں۔ لا یارب اجوع یوماً و افطر یوماً یعنی نہیں اے رب میرے مجھے بطحا کی زمین ساری کی ساری سونا بنوا لینے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک دن بھوکا رہوں گا اور ایک دن کھاؤں گا۔ اس کے علاوہ کس قدر عجیب بات ہے کہ جب خندق کی دعوت میں جابر رضی اللہ عنہ کے چند سیر آٹے سے سینکڑوں صحابیوں کا پیٹ بھرا جا سکتا تھا، تو اس قدرت والے نے اس خندق کے مقام پر اپنے پیٹ سے دو، دو بندھے ہوئے پتھر کیوں کھول کر دکھائے تھے۔ قرآن حکیم میں حکم ہوتا ہے وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ اللہ کے بندے اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ خود وہ نادار ہوتے ہیں۔ کیا معترض اس کا ترجمہ سمجھ سکتا ہے۔ افسوس کہ خدا کے نیک بندوں سے اپنا منہ پیٹ کر بھی دکھاوے کی زہر خندگی کی جاتی ہے پہاڑ کی جلتی نظر آتی ہے، اپنے پاؤں کی نظر نہیں آتی۔ پیر صرف مسنون لباس پہنے تو معترض جل بھن کر کوئلہ ہو جائیں اور خود خزانے جمع کریں تو پاکباز اور نظروں سے اوجھل رہیں۔ "بریں عقل و دانش بباید گریست" مضمون لکھنا مقصود نہیں، ورنہ یہ حقیقت پوری طرح واضح کردی جاتی کہ یہ نافہم کہاں تک حق بجانب ہیں۔ اصل مطلب یہ ہے

کہ جب کسی دین کا آغاز ہوتا ہے تو اُس وقت پیغمبر کی حیثیت شیخ اور مُرشد کی ہوتی ہے۔ اور اُن کے تابعداروں کی حیثیت صحابہ و مریدین کی، پھر جب اپنا کام کر کے اُمت سے نبی واپس تشریف لے جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ ان کے صحابہ و مریدین بھی، اور دوسری نسل ظہور پذیر ہو جاتی ہے تو اس وقت ظاہر ہوتا ہے کہ اُمت میں دونوں (نبی وصحابہ) کی نمائندگی ہونی چاہیئے۔ زیادہ گروہ اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو صحابہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرتے ہوئے دین پر اپنے قدم مضبوط جمائے رہتے ہیں۔ لیکن ہر دس بیس ہزار مسلمانوں میں قطعاً ایک ایسی ہستی کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جو شیخ کی صورت میں پیغمبر علیہ السّلام کی نمائندگی بھی کرے۔ انہی حضرات کو ورثۃ الانبیاء کہا جاتا ہے فقیر یہ عرض کر چکا ہے کہ ممکن ہے ان وارث الانبیاء میں بعض باتیں ایسی بھی پائی جاتی ہوں، جو صحابہ میں نہ ہوں۔ لیکن اُن کے متعلق یہ چیز دیکھنے ہی کی نہیں ہوتی۔ بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السّلام کے خصوصیات کے ظلال اور ان کے عکوس ان میں پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ مغالطہ سارا یہ ہے کہ امت میں جن کو شیوخ یا عام اصطلاح میں پیر کہا جاتا ہے، ان کو لوگ صحابہ پر قیاس کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ صحابہ میں تجّار بھی تھے، صنّاع بھی تھے، کسان بھی تھے باغبان بھی تھے، سپاہی بھی تھے، سردار بھی تھے، عادل بھی تھے، والی بھی تھے، سب کچھ تھے اور ان شیوخ میں اکثر ہر چیز سے الگ ہو کر صرف دین ہی کے لئے ہو جاتے ہیں۔ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّار حاصل مطلب یہ ہے کہ ان کی زندگی کو صحابہ کی زندگی پر نہیں بلکہ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زندگی کے معیار پر جانچنا چاہیئے۔ اگر علمِ شریعت ہے تو اپنے دل سے پوچھئے کہ جب ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا انتقال ہو گیا تھا تو اُس کے بعد سرکارِ انبیاء، محمد الرسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کا ذریعۂ معاش قبل فتحِ خیبر کیا تھا؟ جو ۷ھ میں فتح ہوا تھا۔ کیا آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے اپنے پیغمبرانہ عہد میں کوئی معاشی ذریعہ اختیار کیا؟ کوئی کسب کیا؟ کوئی نوکری کی یا اور کیا کیا؟ آخر آپؐ کی زندگی کس طرح گزرتی تھی؟ حضرات مشائخ کرام رحمہم اللّٰہ کی عملی زندگی کے سوا اس کا اور کیا جواب ہو سکتا ہے۔ یعنی مریدوں سے جو پہنچا وہ قبول فرما لیا۔ اس کے علاوہ حضرت ام المومنین کی وفات کے بعد حضور کی معاش کی کوئی اور تشریح کیا ہو سکتی ہے؟ اظہارِ نبوت کے بعد آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی زندگی میں جہاں صوفیانہ معاش کا یہ بیّن ثبوت ملتا ہے۔ اس کے ساتھ صبح سے شام تک دربارِ رسالت میں حاجتمندوں کا دعا کے لیے حاضر ہونا، لوگوں کا اپنے خورد سال بچوں کو سامنے

دنا۔ ان کے سر پر ہاتھ رکھوانا۔ حضورؐ سے حضورؐ کے دہن مبارک میں چبائی ہوئی کھجوریں لے کر بچوں کو چٹانا۔ آپ کی استعمال شدہ ایک ایک چیز کو بطور تبرک حاصل کرنا اور برکت کے لئے اپنے پاس محفوظ رکھنا دُور دُور سے آئے ہوئے مہمانوں کی رہائش و خورد و نوش کا انتظام کرنا۔ کیا اسی نقشہ کو پیش نہیں کرتا۔ جو آج اور آج سے قبل ہم اور ہمارے متقدمین اسلامی خانقاہوں میں دیکھ چکے ہیں۔ یا دیکھتے چلے آئے ہیں۔ دربارِ رسالتؐ میں آنے والے وفود اور اُن کے حالات ہی اگر کوئی پڑھ لے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ سرکارِ انبیار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے شمال وجنوب، شرق و مغرب سے انہی ضرورتوں کے لئے لوگ آتے جاتے تھے۔ جن ضرورتوں کے ماتحت آج بھی بزرگانِ طریقت کے پاس فوج در فوج دُنیا چلی آ رہی ہے۔

مسلمانوں کے لئے جب یہ بات متحقق ہو گئی کہ ہم میں سے اللہ تعالےٰ کسی ایک کو یا دو کو رسول علیہ السلام کی نمائندگی کے لئے منتخب فرماتا ہے تو انہی لوگوں کا نام عرفِ عام میں شیخ یا پیر یا مرشد ہوتا ہے۔ الفاظ بدلتے رہیں گے۔ حقیقت یہی رہے گی۔ کہ ان سے رسول علیہ السلام کی نمائندگی کا کام ہو رہا ہے۔ اب شیخ وقت سے منصبِ تبلیغ و اصلاح کے کام میں جس قدر اور جس حد تک حضور علیہ السلام کی نمائندگی ظاہر ہو گی، اسی قدر اس کے ہم صحبت یا مرید بھی ایمان و عمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قریب ہوں گے۔ اور جس درجہ تک بیچارہ شیخ رسالت کی نمائندگی میں (نعوذ باللہ من ذٰلک) کمزور ہو گا، اس کے مرید بھی اسی قدر صحابہ کرام سے دور ہوتے جائیں گے۔ اللہ کریم رحم فرمائے جُوں جوں دوائے دل کے بیچنے والے اپنی دُکانوں کو بڑھاتے چلے گئے، توں توں یہ جنسِ نایاب نام نہاد مولویوں کی انشائی تحریروں کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ اس بحث سے عوام کو ایک اور مغالطہ بھی ہوتا ہے کہ جب اسلام کے مشائخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تو ان کا مرتبہ صحابہ کرام سے بھی بڑھ گیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ معترض کے خیال میں یہ کیوں لازم آیا۔ مسلمان بادشاہ بھی ہوتے ہیں، تاجر بھی ہوتے ہیں اور کسان بھی ہوتے ہیں۔ اور ان کو ہر قسم پر ہونا چاہئے۔ اب ہر ایک اپنے مشاغل کے ساتھ ساتھ ایمان و عمل کے جس مرتبہ کو حاصل کرے گا آخرت میں نجات و قرب کے اسی درجہ کا وہ مستحق ہو گا۔ مسلمان تاجر بھی مقامِ ولایت حاصل کر سکتا ہے اور بادشاہ بھی۔ سپاہی بھی اور کفش دوز بھی۔

یہ کس نے کہا کہ جنت فلاں فلاں بن باسی ہی کے لئے وقف ہے۔ مگر یہ یاد ہونا چاہئے کہ خود کو ظاہر بنانا کچھ اور ہے۔ مظہر ہونا کچھ اور۔ معاشی وسائل کی حقیقت کچھ اور ہے اور مدارِ کار ایمان و عمل کچھ اور ہے جن کی نگرانی کے لئے اپنے نفوس کا ہونا لازمی ہے اور یہ کام از خود زورِ بازو سے نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ہر لمحہ فضل ایزدی کے شاملِ حال ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی شخص نے حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ آجکل آپ کا کیا مشغلہ ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ انسانیت کے صحیفہ کی تصیح۔ غلطیوں کو کاٹتا ہوں اور صحیح کو درج کرتا ہوں۔ اور یہی رسالت کی نمائندگی ہے۔ یعنی ان بزرگوں نے دنیا کے تمام مشاغل میں سے اپنے لئے اسی مشغلہ کو پسند فرمایا۔ جو ہمارے آقا و مولا سیدِ انس و جان صلی اللہ علیہ وسلم کا حیاتِ طیبہ ظاہری میں تھا۔ حافظ شیرازیؒ نے کیا خوب لکھا ہے ؎

زاہدِ ظاہر پرست از حالِ ما آگاہ نیست
درحقِ ما ہرچہ گوید جائے ہیچ اکراہ نیست

تصوّف اور کتاب و سُنّت

یہ زمانہ بہت نازک زمانہ ہے۔ علومِ دینیہ کے متعلق لوگوں میں عجیب و غریب خیالات اور طرح طرح کے تصورات پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مغربی الحاد کی تند و تیز آندھیاں اُٹھ رہی ہیں جنہوں نے اس دُنیا میں ایک قیامت برپا کر رکھی ہے۔ اور ان کی بدولت ملک کے نوجوانوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے عقاید بالکل متزلزل ہو گئے ہیں۔ وہ نہایت بیباکی بلکہ دیدہ دلیری سے دین سے انکار اور دینی تعلیمات سے نفرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ کبھی وہ احادیث کی بے ضرورتی پر زور دیتے ہیں اور کبھی وہ تصوف کے وجود ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔ پھر ان ہی پر کیا منحصر ہے۔ پاکستان میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود ہے جو تصوّف کی اصل و اساس ہی کا سرے سے قائل نہیں۔ اور اعلانیہ کہتا ہے۔ کہ یہ جدید اختراع اور بدعت ہے۔ حالانکہ یہ سخت غلطی اور شدید مغالطہ ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے پیشتر ذکر کر چکے ہیں کہ تصوف کی ابتدا بھی دیگر علومِ دینیہ کی طرح حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کے عہدِ مُبارک سے ہوئی ہے اور یہ عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں بھی جلوہ گر رہا ہے۔

ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ اس صداقت پر مختلف قسم کی اختراعات کا ایک ہلکا سا غبار بیٹھ گیا ہے۔ اور تصوّف کی جو حالت قرنِ اوّل کے بزرگانِ دین میں جلوہ گر تھی عہدِ حاضر میں اس کی صورت اس سے کچھ متفاوت ہو گئی ہے۔ اس تغیّر کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اہلِ ہوا نے دُنیا طلبی کے لئے ہر زمانہ میں اپنے اغراض و مقاصد کی پیش بندی کے واسطے ایسی باتوں کو مذہبی پیرایہ میں پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ جن کی کتاب و سنّت میں کوئی اصل نہ تھی۔ اور رفتہ رفتہ وہی باتیں جزوِ دین سمجھ لی گئیں۔ چونکہ ان ماننے والوں میں اپنے جاہل پیشواؤں کی تقلید و حرمت کا جوش بے پناہ تھا۔ اور وہ ان کی ہر بات کو بمنزلہ وحی سمجھنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ اسلئے انہوں نے ان کی تحقیق کے لئے کتاب و سنّت کی طرف رجوع نہ کیا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ تصوّف کا چشمۂ صافی گدلا ہو گیا۔ یہ بھی حقیقت ہے۔ کہ تصوّف اس مبارک زمانہ میں اس نام کے ساتھ موجود نہ تھا

مگر اصحابِ صفہ میں یہ اپنی تمام حقیقت اندوزیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ اور انکے بعد تابعین و تبع تابعین یکے بعد دیگرے اس نعمت سے یکساں طور پر برابر مستفید ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دور آیا کہ یونانیوں کے فلسفۂ الٰہیات یا حکمت اشراق نے معشرِ اسلام میں ایک اختلال کی صورت پیدا کردی۔ عین اس وقت صوفیائے کرام کی توجہ اس طرف مرکوز ہوئی۔ مگر اس نازک دَور میں ایک نئی مصیبت یہ پھیل گئی تھی کہ بعض مصنفین کو یہ جنون لاحق ہو چکا تھا کہ وہ خواہ مخواہ اہلِ فلسفہ کی مصطلحات اور ان کے مفاہیم کو وحیِ الٰہی سے تطبیق دینے کی فکر کرنے لگے تھے۔ اور اس سعی میں ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتے چلے جا رہے تھے

(لفظ تصوّف کا اشتقاق نہ صُوف ہے نہ صُفہ۔ جیسا کہ حضور غوثِ اعظمؒ نے لکھا ہے اور حضرت امام غزالیؒ نے بھی بیان کیا ہے کہ یہ مشتق ہے لفظ صَفا سے۔ صوفی کی جو تعریف بزرگانِ دین نے کی ہے' وہ یہ ہے کہ جو اخلاق رذیلہ سے پاک اور اخلاق فاضلہ سے متصف ہو کر اپنے اوقات' طاعات' و عبادات میں گزارتے ہوئے آگے بڑھے وہی صُوفی ہوتا ہے)

لیکن ہم اپنے تجربہ کی بنا پر جو کچھ سمجھ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان شریعتِ اسلامیہ کی اساس پر قائم رہتے ہوئے روحانی ترقی کرے اور اس کا باطن نورِ الٰہی سے منور ہو جائے حقیقت یہ ہے کہ تصوف ایک ایسا علم باطنی ہے جس کی حقیقت لفظوں میں بیان ہی نہیں کی جا سکتی جو اس بزم نازمیں اترتا ہے، وہی اسکی سرشاریوں اور فائز المرامیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ جس طرح دنیا میں اور علوم بھی ہیں جیسے علوم عقلیہ' علومِ دینیہ' علومِ لطیفہ وغیرہ وغیرہ' جو بیشتر ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح علومِ باطنی بھی ہیں۔ جن کا تعلق باطنی ترقی سے ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ اس کی اساس شریعت ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا حقیقی صوفی وہی ہوتا ہے جو شریعت کا پورا پورا پابند ہو اور اسلام کی تعلیمات سے سرِمُو تجاوز نہ کرے، سنت کے جادہ کو تلاش کرکے اس پر گامزن ہو۔ ویسے تو مجذوبین بھی اس دنیا میں ہیں اور ان میں بھی بڑے بڑے باکمال اور صاحبِ حال بزرگ موجود ہیں جنہیں دنیا والے مجنون و دیوانے یا جو دل چاہے کہیں اور علمائے کرام بھی شریعت کی عدم پابندی کی بنا پر انہیں جو چاہیں لکھیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ انہیں دنیا اور اغراض دنیا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور یہی ان کے کمال کی دلیل ہے اور اسی سے ان کے علومِ مرتبہ کے متعلق کسی حد تک قیاس کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں تصوف بھی دیگر علوم کی طرح ایک علم ہے۔ جس طرح کوئی شخص موسیقی' ریاضی اور فلسفہ وغیرہ کو اسی صورت میں سمجھ سکتا ہے کہ وہ کم از کم ان علوم کی مبادیات سے واقف ہو۔ اسی طرح علم تصوف کی حقیقت سے آشنا ہونا آسان نہیں اسے وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو مجاہدات، ریاضیات تصفیۂ قلب، تزکیۂ نفس، مشاہدات، مراقبات، کیفیات اور واردات قلبی پر عبور رکھتا ہو۔ یہ مصطلحات بھی ایسی

ہیں کہ سائنس کی مصطلحات کی طرح محض ان کا نام معلوم ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

حیرت ہے کہ وہ علم جس کی اساس شریعت حقہ ہے اسے بھی لوگ اسلام سے الگ اور غیر بتانے میں باک نہیں کرتے اور یہ وہ لوگ ہیں جو نہ تو خود شریعت کی روح سے واقف ہیں۔ نہ ہی وہ اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں ہاں اعتراض کرنے میں وہ بڑے سرگرم ہوتے ہیں۔ حالانکہ علوم ظاہری قال سے اور علوم باطنی حال سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے یہ علم کسی عارف کامل کی صحبت و توجہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا دار و مدار اور تعلق محض اس کا علم حاصل کر لینے سے نہیں بلکہ عمل سے ہے۔ اور سچ پوچھو تو عمل اور فقط عمل ہی تصوف کا نظری اور عملی رُخ ہے۔ بغیر عمل کے تصوف بادۂ بے کیف، گل بے رنگ اور نغمۂ بے اثر ہے۔ عمل کے بغیر تصوف کی روح تک نہ کسی کو رسائی ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ رہا یہ امر کہ اس کی حقیقت عام طور پر عقول عامہ سے بالاتر ہے۔ تو یہ بھی کوئی بات نہیں۔ علم موسیقی کو لیجئے اسکی مصطلحات اور اس کے نغموں کے متعلق تصریحات پڑھکر اس وقت تک کسی کے پلّے کچھ نہیں پڑتا جب تک وہ اسے حاصل کرنے کے لئے عملی ریاضت نہ کرے کسی چیز کی حقیقت نہ سمجھنے سے اس کی نفی لازم نہیں آتی۔ معراج، نبوت، رسالت اور معاد وغیرہ وہ دینی مسائل ہیں جن پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لئے لازمی و لابدی ہے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان اپنی عقل سے کام لینا چاہے تو وہ قیامت تک بھی ان کی حقیقت معلوم نہیں کر سکے گا۔ البتہ علم تصوف ہی ایک ایسی چیز ہے جو ان سب کی گرہ کشائی بھی کر دیتا ہے۔ علامہ ابن جوزی جو بڑے پایہ کے بزرگ گزرے ہیں انہوں نے بھی بڑے شد و مد کے ساتھ تصوف سے انکار کیا ہے۔ مگر بے معنی جیسا کہ رشح الانوار میں امام عبدالوہاب شعرانی نے لکھا ہے کہ صوفیوں کے برخلاف ہر زمانہ میں اعتراض و انکار کئے جاتے رہے ہیں۔ جن کا سبب یہ رہا کہ جس مقام تک یہ بزرگ پہنچ چکے تھے عقول عامہ وہاں تک پہنچنے سے قاصر رہی تھیں مگر کبھی انہوں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ حضرت امام نے یہ بھی صاف صاف لکھا ہے کہ اہل تصوف کا طریق انبیاء علیہم السلام کے قدم بہ قدم چلنا ہے۔

تصوف سے مراد وہ حقیقی نور علم ہے جو کتاب و سنت پر بشدت تمام عمل کرنے سے اولیاء اللہ کے دلوں کو چمکا دیتا ہے۔ حضرت امام شافی رحمۃ اللہ علیہ کس رتبہ و شان کے بزرگ گزرے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مجتہدین شریعت اور مجتہدین طریقت سب راست باز ہیں جنہیں اللہ نے اپنی شریعت کی خدمت کے لئے منتخب فرمالیا ہے۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اہل تصوف کا علم کتاب و سنت ہی سے استوار و مستحکم ہوتا

ہے۔ لوگ حضرت شبلی کو دیوانہ سمجھتے تھے آخر انہیں اور ان کے ساتھ متعدد صوفیاء کو گرفتار کر لیا گیا۔ سوالات بھی انہیں سے کئے گئے جو نہایت فقہی سوالات تھے۔ لیکن انہوں نے ایسے واضح جوابات دیئے کہ سب لوگ دنگ رہ گئے آخر ان لوگوں کو انہیں رہا کرنا پڑا۔

حضرت امام ابو تراب بخشی نے فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے۔ تو اسکی پہلی علامت اور پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اولیاء اللہ کے متعلق زبانِ طعن دراز کرنی شروع کرتا ہے۔ حضرت شیخ محمد مغربی شاذلی فرمایا کرتے تھے۔ کہ اہلِ طریقت کی حقانیت پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ شاہد ہے۔ کیونکہ جیسا کہ خود قرآن کریم فرماتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا تھا کہ آیا میں اس شرط پر آپ کی پیروی کروں کہ آپ مجھے اپنے خداداد علم سے صلاح و تقوےٰ کی تعلیم کریں۔ گویا جس طرح شریعت کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ عین اسی طرح علم طریقت کا حصول بھی ضروری ہے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی نے حضرت امام فخر الدین رازی کو لکھا۔ کہ اگر آپ کسی اہل اللہ کی مجلس میں بیٹھ کر حقیقتِ شریعت سے آگاہی حاصل کریں تو وہ آپ کو بہت جلد شہود حق کے مرتبہ تک پہنچا دیگا۔ جس سے آپ کو بلا تکلف خدائے تعالےٰ کی طرف سے علومِ حقیقت معلوم ہونے لگیں گے۔ آپ کو واضح رہنا چاہئے کہ استدلال سے جو علم حاصل ہوتا ہے اسکو علمِ حقیقت کیساتھ کوئی نسبت ہی نہیں کیونکہ نظر و فکر چند عقلی ڈھکوسلوں کا نام ہے۔ وہ علم حاصل کیجئے جس سے آپ کی ذات کو حقیقی کمال حاصل ہو اور مرنے کے بعد بھی ساتھ جائے علوم وہی ہیں جو وہبی طریق پر اور بروئے مشاہدہ خدا تعالےٰ کی طرف سے عطا ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے علوم ہیں۔ ان کا فائدہ صرف انسان کی زندگی تک محدود ہے۔ لیکن یہ علوم خلوت و ریاضت مشاہدہ اور جذب الہیٰ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ اور اہلِ حقیقت کے علوم کا حصول ایمان اور تقوےٰ پر منحصر ہے۔ کیونکہ خود خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور اتقاء اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان سے برکات کے دروازے کھول دیتے۔ اس آیت میں ارضی و آسمانی برکات سے مراد ظاہری برکات کے علاوہ موجودات ارضی و سماوی کے اسرار و حقائق بھی ہیں اور ایسے علوم حقیقت کا انکشاف مراد ہے جو علویات، سفلیات اور عالم جبروت و ملکوت اور انوار و ملکوت کے متعلق ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ آیتِ کریمہ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ سے مراد جسمانی و روحانی دونوں رزق ہیں۔

فرمانِ نبویؐ ہے ان لکل آیۃ ظہر و بطناً وحدًا او مطلقا الیٰ سبعۃ البطن اس میں ظاہر سے مراد وہ احکامِ شرعیہ ہیں جن کی پابندی سے اعمال صالح بجا لائے جاتے ہیں اور باطن سے مراد وہ اسرار و معارف ہیں جو کمال ایمان و تقویٰ پر مترتب ہوتے ہیں۔ قرآن معارف و اسرار کا گنجینہ ہے۔ وہ ان لفظ پرستوں سے مخفی رکھا گیا ہے۔ جن کے حصے میں اہلِ حق کی تردید و تکذیب کے سوا اور کچھ نہیں آیا۔ یہ لوگ جب معارف و حقائق کو اہلِ حقائق کی زبان سے سن پاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی کم علمی کا اعتراف کریں کہہ اٹھتے ہیں کہ سلف میں سے تو کسی نے یہ بات نہ کہی تھی یہی وہ لوگ ہیں جو مشائخ عظام رحمہم اللہ کے فیضانِ باطنی سے محروم رہ جاتے ہیں۔

حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی فرماتے ہیں کہ ایک ولی اللہ اور اس کے کمالِ باطنی کا اندازہ کرنے کے لئے چشم بصیرت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ شیخ ابن تیمیہ نے ہمارے زمانہ میں اس امر کی نسبت بہت تجاوز کیا ہے اور بعض نے ان حقائق سے بھی انکار کیا ہے جن کی اصلیت مسلّم و محکم ہے لطف یہ کہ اختلاف ہے اور ایسے امور کے متعلق ہے جن کا تعلق مقامِ ولایت سے ہے۔ اس کا سمجھنا نہ نام نہاد محدثین کا کام ہے اور نہ علماء سو کا۔ اس لئے کہ یہ لوگ تو بجز معتقدات اور احکام جائز و ناجائز کے کچھ بتلا ہی نہیں سکتے

ان کے تو یہ امر ذہن نشین ہو چکا ہے کہ کتاب و سنّت کا سمجھنا صرف علماء ہی کا کام ہے۔ قرنِ اوّل میں بھی صوفیائے کرام موجود تھے اور وہ اس وقت تک کسی کو اپنے حلقۂ بیعت میں نہ لیتے جب تک یہ نہ دیکھ لیتے کہ اسے احکامِ شریعت کا پورا علم ہے۔ اور ان کی مجالس میں کتاب و سنّت ہی کے اذکار رہتے تھے۔ لیکن اسرار حقائق و معارف کے بیان کے لئے علیحدہ مجالس بھی ہوتی تھیں۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ قاصر الفہم لوگ بعض اعمال میں بد عقیدہ ہو کر متہم کرنے لگ جاتے تھے۔

بعض صحابہ کرام اور ائمہ اہل بیت مثلاً حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ، سے منقول ہے کہ سرچشمۂ نبوت سے ہم نے بعض ایسے علوم بھی حاصل کئے ہیں کہ اگر انہیں ہم تم پر ظاہر کر دیں تو کافر کہنے لگو۔

فی زمانہ بھی بعض لوگ بے تکلفی کے ساتھ کہہ دیا کرتے ہیں کہ محض شریعت کی پابندی تزکیۂ نفس کے لئے کافی ہے یہ ضرور ہے کہ انسان اس طرح ترقی کر سکتا ہے مگر مقامِ اعلیٰ پر پہنچنا صرف شیخ کامل کی بیعت پر منحصر ہے۔ علمائے ظاہر میں ہر زمانہ میں غرور، غضب، طلب جاہ۔ ریا اور حرص وغیرہ دیکھے گئے ہیں اور ان خصوص میں وہ عام دنیا داروں سے ممیز نہیں ہوتے

لیکن علمائے باطن میں پوری بے نفسی جلوہ گر ہوتی ہے۔ شیخ عزیز الدین ایک بڑے محدث گزرے ہیں جو کہا کرتے تھے کہ صوفیا بدعات پھیلانے والا ایک طبقہ ہے۔ بھلا کتاب و سنت کی پیروی کے علاوہ بھی کوئی اور طریق ہو سکتا ہے لیکن ایک موقعہ پر دمیاط کی ایک مجلس میں بڑے بڑے مجتہدین، محدثین و فقہا، شیخ مکین الدین اور شیخ تقی الدین وغیرہ جمع تھے۔ شیخ عزیز الدین بھی پہنچ گئے۔ حضرت امام قشیری سے رسالہ تصوف کی بعض عبارتوں کے متعلق گفتگو شروع ہو گئی۔ اس دوران میں شیخ وقت شیخ ابوالحسن شاذلی بھی تشریف لے آئے۔ ان سے بھی کچھ فرمانے کی استدعا کی گئی ان کے اصرار سے مجبور ہو کر شیخ نے جو تشریح شروع کی۔ تو شیخ عزیز الدین کی یہ حالت تھی کہ بے اختیارانہ پکار اُٹھے کہ سنو سنو یہ وہ کلام ہے جو ابھی ابھی بارگاہ خداوندی سے نازل ہوا ہے۔ اور جس سے حقانیت کے انوار چمکتے نظر آ رہے ہیں۔ حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ہمیشہ سے یہی طریق چلا آتا ہے۔ کہ کوئی فیض دیتا ہے اور کوئی لیتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کسی کو تربیت کے بغیر مقامات عالیہ تک نہیں پہنچاتا۔

حضرت امام حنبلؒ اور حضرت شیخ عزیز الدین کتنے بڑے اور یگانہ روزگار محدثین گزرے ہیں۔ مدت تک صوفیاء کا انکار کرنے کے بعد آخر انہیں سے فیض حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حالانکہ اوّل الذکر کی یہ حالت تھی کہ اپنے بیٹے کو زور و شور سے نصیحت فرماتے رہتے تھے۔ کہ کہیں ان صوفیاء کی صحبت میں نہ بیٹھنا کہ یہ لوگ احکام شریعت سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ لیکن حضرت ابوحمزہ کی صحبت میں کیا پہنچے کہ آنکھیں کھل گئیں۔ پھر بیٹے کو بھی نصیحت کرنے لگے کہ اُن کے متعلق کبھی سوءظنی سے کام نہ لینا۔ یہی صورت حضرت شیخ عزیز الدین کو حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی کی خدمت میں جا کر پیش آئی۔ کہا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر یہ علم اتنا ہی ضروری تھا تو صحابہ کرام نے علانیہ اس طرح تلقین کیوں نہ کی اور اس وقت ایسی صوفیانہ مصطلحات کیوں نہ پیدا ہو گئیں۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ وہ زمانہ مبارک تھا۔ علانیہ اس کی تبلیغ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ فیوض باطنی کا کام خاموشی کے ساتھ جاری تھا۔ لیکن جب زمانہ پُر آشوب ہوا۔ فتنہ پھیلا۔ لوگ دنیا کی طرف کثرت سے راغب ہونے لگے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔ کہ فلسفہ نے عقائد پر بجلیاں گرانی شروع کیں۔ انوار سنت کی چمک کم ہو چلی تو بہ اشارۂ غیبی علمائے باطنی جو حقیقت میں وارث علوم نبوی اور کا انبیائے بنی اسرائیل تھے۔ اس طرف متوجہ ہوئے۔ اور انہوں نے تزکیۂ نفوس اور تصفیۂ قلوب کے لئے سعی شروع کر دی۔ خود حضرت امام قشیری نے لکھا ہے۔ کہ امراض باطنیہ کے ظہور کا زمانہ تیسری جماعت یعنی

تبع تابعین کا آخری دور ہے۔

متاخرین میں حضرت حافظ ابن حجر کتنے بلند پایہ محدث گزرے ہیں۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری انہی کی لکھی ہوئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہر طالب خدا کو چاہئے کہ وہ اپنی رہنمائی کے لئے کسی شیخ کامل کو منتخب کرلے۔ اور منکرین کی تعصب آمیز باتوں میں ہرگز نہ آئے۔ یہ خیال رہے کہ جو شیخ بھی ہو اور عارف ہو۔ کامل ہو، احکام شریعت وحقیقت کا ماہر ہو۔ اس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ رسم وعادات کے اسلام سے برطرف ہوجائے اور اپنے شیخ ہی کے حکم پر چلے۔ اور جب کسی شخص کو ایسا رہبر مل جائے تو پھر اس کے لئے حرام ہے کہ وہ اس کا دامن چھوڑے۔ آپ نے یہ بھی لکھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں کتاب اللہ اور سنت نبوی، اجماع امت اور قیاس چاروں کی پوری پوری شہادت سے کہہ رہا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ چاروں آسمانی کتابیں اس دعویٰ پہ شاہد ہیں۔

الغرض بالفاظ مختصر تصوف یا طریقت نام ہے۔ راہ خاص کا جو بہت دشوار ہے۔ اور جس میں مجاہدات وریاضیات کی کٹھن منازل عبور کرنا پڑتی ہیں اور شریعت نام ہے راہ عام کا جو آسان ہے اور جسکی پابندی عوام وخواص دونوں کے لئے ضروری ہے۔

کتاب وسنت کے اتباع کامل میں جب تک نفس پر جبر وتشدد کا تعلق رہتا ہے۔ شریعت کہلاتی ہے۔ اور جب یہ اتباع ذوق وشوق کے ساتھ ہونے لگتا ہے۔ عبادات اور اعمال نیک میں لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ قال سے حال تک نوبت پہنچ جاتی ہے تو اسے طریقت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اتباع کتاب وسنت خواہ نفس پر جبر ہی سے ہو نجات اخروی کے لئے کافی ہے۔ اور اسی لئے تصوف وطریقت کو فرض قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ مستحب بتایا گیا ہے۔ لیکن پہلی حالت میں نفسانی مہالک کا خطرہ ضرور باقی رہتا ہے اور جب طاعت وعبادت میں لذت آنے لگتی ہے تو شیطان کی رخنہ اندازی اور نفس کی نیش زنی کا اندیشہ زائل ہوجاتا ہے۔ ایک پابند شریعت انسان کتاب وسنت کی پیروی تو کرے گا۔ مگر اسے اپنے نفس پر اس کے لئے کم وبیش جبر ضرور کرنا پڑتا ہے۔ کبھی جنت کے نعماء کے خیال سے اور کبھی عذاب جہنم کے خوف و دہشت سے۔ لیکن بخلاف ازیں ایک صاحب طریق جو کچھ کرے گا۔ پورے شوق ورغبت اور والہیت وشیفتگی کے ساتھ کرے گا۔ اسے نہ جنت کی پرواہ ہوگی اور نہ دوزخ کا اندیشہ ہوگا۔ جو کچھ اس سے صدور میں آئے گا

وہ عاشقانہ اور والہانہ نوعیت کا ہوگا۔ اور ایسے لوگوں کا کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حقیقتاً یہ اہلِ طریقت کی جماعت عشاق کی جماعت ہے ؎

چونکہ ان کا اتباع کامل ہوتا ہے۔ مرضیات الٰہیہ پر اپنی مرضیات قربان کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے خدا بھی انہیں برگزیدہ بنا لیتا ہے مستجاب الدعوات ہو جاتے ہیں۔ اور جو کہتے ہیں خداوند عالم پورا فرما دیتا ہے۔ جو خدا کا کہنا مانتے ہیں۔ خدا بھی ان کا کہنا مانتا ہے۔ کیونکہ ان کے سامنے صرف رضائے الٰہی ہوتی ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ کے مصداق ہوتے ہیں۔ اسی والہانہ طاعت و رضا جوئی میں ایک وہ وقت بھی آتا ہے۔ جیسا حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ خدائے قدوس فرماتا ہے کہ میں بندہ کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ کام کرتا ہے یہی وہ منزل ہے جس کو فنا فی اللہ کہتے ہیں۔ بندہ کی ہر حرکت خداوندی حرکت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ حدیث جبرئیل میں جو بخاری اور مسلم میں موجود ہے۔ اسلام اور ایمان کے بعد احسان کا ذکر ہے۔ جس کی تفسیر خود حضور نبی کریم ؐ نے فرمائی ہے۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ یعنی اخلاص اور احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر اس طرح عبادت کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

یہ "احسان" ہی جان تصوف اور روح طریقت ہے۔ اور یہ اشارہ اسی کی طرف ہے جس سے مراد صدق اور توجہ الی اللہ ہے۔ علماء کہتے رہے ہیں کہ مجاہدہ اور کثرت عبادات میں چونکہ نفس کو تکلیف مالایطاق ہوتی ہے اس لئے شرعاً جائز نہیں۔ ضرورت ہے کہ عبادت اتنی کی جائے کہ وہ باعث ملالِ خاطر نہ ہو۔ کوئی حق شرعی اس سے فوت نہ ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ صوفیاء کے مجاہدات شوق و لذات کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کی راتیں بیداری و عبادت کے لئے وقف اور دن رضا جوئی الٰہی کے لئے معین ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں ملالِ خاطر کا کوئی شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ رہی بیعت۔ تو یہ حضور نبی کریم ؐ کے عمل سے ثابت ہے۔ جس کی مفصل تشریح آگے آئے گی۔ جیسے کہ حضرت جریر بن عبداللہ رضؓ سے حضور نبی کریم علیہ السلام نے نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان سے خیر خواہی کرنے کی بیعت لی۔ اور کسی سے بیعت ہجرت، کسی سے ترک گناہ اور بہتان نہ باندھنے اور

چوری نہ کرنے کی بیعت لی ۔

اسی طرح اگر آج بھی کوئی بزرگ کسی سے کسی نیک کام ، ترک گناہ اور روحانی ترقی کی بیعت لے۔ تو یہ عین اتباعِ شریعت ہو گا۔ خلاصہ یہ کہ تصوف ایک نہایت مقدس اور شریف علم ہے۔ جس کا آغاز حضور نبی کریمؐ ہی سے ہوا۔ جنہیں شب معراج میں خرقہ عطا ہوا تھا چونکہ اب اس علم کے ورثا زیں جہال اور بے علم زیادہ ہیں جو صرف نام کے صوفی رہ گئے ہیں۔ اور اپنی جہالت کے باعث شریعت سے بھی دور جا پڑے ہیں۔ اس لئے لوگوں کو اور سوء ظنی کا موقع مل رہا ہے، ورنہ صوفی ہر حالت میں شریعت کا متبع اور کتاب وسنّت کا عامل ہوتا ہے۔



تبلیغ اسلام اور صوفیائے کرام

یہ مسئلہ کہ تصوف کیا چیز ہے اور عوام الناس کے سامنے اس کے مبادیات کے سوا اور کچھ بالتصریح بیان کرنا کیوں ناروا ہے۔ مشاہیر صوفیانِ کرام و درویشانِ عظام کے حالات و کمالات معلوم کرنے اور انکی معتبر تصانیف کے مطالعہ سے ہی پتہ چل سکتا ہے۔ جیسے شرع ظاہری میں رواجات کے متعلق گفتگو کرنے کی ممانعت ہے۔ ایسے ہی وہ ممانعت لاعلمی وظاہر پرستی میں روحانیت کی کسی شاخ سے بھی بحث کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

شرع ظاہر اور علمِ باطن کی تعلیم بھی جیسا کہ آگے آئے گا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ ساتھ ہی جاری فرمائی تھی۔ عوام الناس کیلئے علم ظاہر تھا۔ اور جو اہل تھے انہیں علمِ ظاہر کے ساتھ تعلیم علومِ باطنی بھی دی جاتی تھی جس کی مجالس جداگانہ ہوتی تھیں اور اسطرح اکابر اصحابِؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں صیغوں میں اسلامی یونیورسٹی سے باکمال ہو کر نکلتے تھے۔ سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آخر دورِ خلافت تک اکابرین اسلام میں علومِ ظاہری و باطنی ساتھ ساتھ تھے۔ لیکن اس کے بعد جب فتنہ و فساد کا زمانہ آیا اور یہ طوفان اپنا اثر چھوڑ کر گزر گیا۔ تو علوم باطن کے جاننے والوں کا گروہ الگ نظر آنے لگا۔ لیکن اس گروہ کے اولوالعزم حضرات نے اپنی سابقہ خدمات سے بھی پہلو تہی نہیں کی۔ جہاں شرع ظاہر کے پھیلانے والے اور کفر کے تودوں کو ہموار کرنے والے مسلح ہو کر صف آرائی کرتے تھے۔ وہاں اہل باطن بھی اپنے اوزار حمائل کئے اور مصلے ساتھ لئے ہوئے برابر موجود رہتے تھے۔ جہاں پہلا مجاہدین کا گروہ اسلامی تہذیب سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ کرتا تھا۔ وہاں پچھلا گروہ بھی نورِ معرفتِ الٰہی سے سینوں کو منور فرماتا تھا۔ اسلام کی خوبیوں کا ڈنکا جن باتوں سے تمام عالم میں بجا۔ ان میں دونوں گروہوں کی مساعی جمیلہ مشترک ہیں۔ بلکہ پچھلا گروہ شریک غالب ہے۔ رفتہ رفتہ پچھلے گروہ نے اپنے عمّال کے درجے قائم کئے۔ اور ان عمّال نے اپنی خفیہ کوششوں سے اسلام کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں وہ کارہائے نمایاں دکھائے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ پہلا گروہ نہ صرف گروہِ ثانی کا احسانمند رہا۔ بلکہ اس کا ادب و احترام کرنا اپنے لئے فلاحِ دارین تصور کرتا تھا

یہی وجہ تھی کہ خانقاہیں دارالامارت پر حکمران تھیں۔ جن کا کچھ کچھ پتہ عام پسند حکایات سے بھی چلتا ہے یعنی جہاں دارالامارت کے مفتیوں اور قاضیوں کی مضحکہ آمیز حکایات زبان زدِ خلائق ہیں۔ وہاں خانقاہی درویشوں کے قصہ جات اس مبالغہ سے بیان کئے جاتے ہیں کہ حد نہیں رہتی۔ گو یہ مبالغہ کا حسن پسندیدہ نہیں۔ تاہم یہ بتانا مقصود ہے کہ سکنائے خانقاہ سے بوجہ ان کے محاسن کے عوام کو جن میں غیر مسلم بھی شامل رہے کس درجہ خوش عقیدتی تھی۔ اور یہی خوش عقیدگی بڑی حد تک اسلام کے پھیلنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ مثلاً شاہ قطب الدین ایبک اور حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ہی زمانہ ہے۔ قطب الدین ایبک کو اس کے آقا نے ہندوستان پر مامور کیا۔ اور خواجہ صاحب کو ان کے پیشوا نے اجمیر بھیجا۔ مگر قطب الدین ایبک سے وہ خدمتِ اسلام انجام نہ پائی جس کا ظہور خواجہ صاحب کی ذاتِ گرامی سے ہوا۔ لوگ مسلم شاہانِ ہند پر یہ اتہام لگاتے ہیں کہ انہوں نے بزورِ شمشیر اسلام پھیلایا ہے۔ حالانکہ قطب الدین ایبک کو ملکی فتوحات کا شوق تھا۔ اشاعتِ اسلام سے اسکو واسطہ تک نہ تھا۔ اور اسلام کی خوبیاں بذریعہ درویشانہ کمالات کے دکھا کر دلوں کا مسخر کرنا خواجہ صاحب کا کام تھا اور اسلام کی جو روشنی ہندوستان میں پھیلی اس کا اکثر حصہ خواجہ صاحب ہی کے باطنی کمالات کا مرہونِ منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقراء کی اصطلاح میں خواجہ صاحب کو سلطان الہند لکھتے ہیں۔ یہ غیر مناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں پر صوفیائے کرام کی تبلیغی خدمات مجمل طور پر بیان کر دیں۔

برِصغیر ہند و پاکستان میں فریضۂ تبلیغِ اسلام جس جماعت نے باحسن الوجوہ ادا کیا وہ صوفیاء ہی کی جماعت ہے انہوں نے اپنے فرض کو سمجھا اور اسے پورے طور پر ادا کیا۔ یہ ان کے نفوسِ قدسیہ کا اثر ہے کہ آج اس برِصغیر میں دس کروڑ کے قریب مسلمان موجود ہیں۔ اگر وہ بھی دوسری جماعتوں کی طرح تغافل و تساہل سے کام لیتے اور اس فریضہ کی جانب توجہ نہ دیتے تو اس کفرستان میں نہ توحید کا چراغ روشن ہوتا اور نہ ہی فرزندانِ اسلام نظر آتے۔

مرکزِ لاہور

تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں سب سے پہلا مبلّغ جو یہاں وارد ہوا وہ شیخ اسمٰعیل محدّث بخاری تھے۔ وہ یہاں اس زمانے میں وارد ہوئے۔ جب سرزمین پنجاب ہندو راجاؤں کے زیرِ نگین تھی۔ اور محمود غزنوی اور اس کے جانباز سپاہی اس خطہ کو روند رہے تھے۔ شیخ محمد اسمٰعیل بخارا کے سیّد تھے۔ اور علومِ ظاہری و باطنی میں کامل دسترس رکھتے تھے

وہ ۱۰۰۵ء کو لاہور وارد ہوئے۔ اور وعظ و تذکیر کے ذریعہ تبلیغ اسلام شروع کی۔ آپ کا وعظ اتنا پُر تاثیر ہوتا تھا کہ ایک ایک مجلس میں صدہا لوگ مشرف باسلام ہوتے تھے۔ چنانچہ مفتی غلام سرور لاہوری اپنی مشہور کتاب خزینۃ الاصفیا میں فرماتے ہیں: "چوں شیخ اسمٰعیل در لاہور تشریف آورد۔ بروز جمعہ ثانی پان صد و پنجاہ و بروز جمعہ ثالث یک ہزار کس در زمرۂ اہلِ توحید داخل گشتند" نیز صاحب تذکرہ علمائے ہند انکی شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں "از علمائے محدثین و مفسرین بود۔ اول کسے است کہ علمِ تفسیر و حدیث در لاہور آورد۔ ہزارہا مردم در مجلس وعظ وی مشرف باسلام شدند در سالِ چہار صد چہل و ہشت ہجری در لاہور در گذشت"

تبلیغ اسلام کے سلسلے میں جس بزرگ نے شیخ اسلام سے زیادہ کام کیا اور جس کا نام آج بھی ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔ وہ غزنین کے مشہور صاحب دل بزرگ شیخ علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جنھیں زبانِ خلق حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ آپ ۱۰۰۹ء کے قریب پیدا ہوئے اور مختلف اسلامی ممالک میں سفر کرنے اور بہت سے پیرانِ طریقت سے فیض حاصل کرنے کے بعد آپ لاہور تشریف لائے۔ آپ کے ہمراہ آپ کے دو اور ساتھی بھی تھے۔ اور یہ زمانہ سلطان مسعود ابنِ سلطان محمود غزنوی کا تھا۔ یہاں آپ نے ایک مسجد اور ایک خانقاہ تعمیر کی۔ درس و تدریس کے ساتھ آپ نے تبلیغ اسلام کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ بہت سے لوگ آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ ان میں ممتاز شخصیت رائے راجو کی تھی۔ وہ سلطان مودود ابن مسعود غزنوی کی جانب سے لاہور کا نائب تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ شیخ ہندی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی اولاد سے آج تک حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار کے خادم اور مجاور چلے آئے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ہند و پاکستان کے اکابر صوفیا میں ہوتا ہے۔ آپ کی مشہور کتاب "کشف المحجوب" فارسی زبان میں تصوّف کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اور اکثر صوفیائے کبار آپ کے روحانی فیض سے بہرہ یاب ہوئے ان سب میں سلطان الہند خواجہ غریب نواز معین الدین اجمیریؒ کا نام خاص طور پہ قابل ذکر ہے۔ انہوں نے آپ کے مزار پر چلہ کشی کی۔ اور جب وہ آپ کے روحانی فیض و برکات سے بہرہ اندوز ہوئے۔ تو اس روحانی سکر و مستی کے عالم میں یہ شعر بے اختیار ان کی زبان پر جاری ہو گیا ؎

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

آپ ۱۰۷۲ء (۴۶۵ھ) میں فوت ہوئے۔

حضرت داتا گنج بخش کے بعد پنجاب میں رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا کام سلطان سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے شدّ و مد سے کیا۔ آپ ملتان کے قرب و جوار میں ایک گاؤں موضع کرسی کوٹ میں پیدا ہوئے۔ سید احمد نام۔ سلطان سخی سرور یا لکھ داتا آپ کا لقب تھا۔ علوم ظاہری آپ نے لاہور آکر مولانا محمد اسحاق لاہوری سے حاصل کئے علوم باطنی آپ نے اپنے والد بزرگوار اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے حاصل کئے۔ ریاضت و عبادت کے لئے آپ نے اپنا پہلا مرکز موضع سودہرہ کو قرار دیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں آپ کو وہ مقبولیت حاصل ہوگئی کہ ہر وقت خلقت کا ہجوم آپ کے گرد رہتا۔ اور جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ دلی مراد پا لیتا۔ اس بنا پر آپ کا لقب سخی سرور مشہور ہوگیا۔

سودہرہ سے آپ دھونکل تشریف لائے۔ اور ہدایت خلق میں مشغول ہوگئے۔ یہاں سے اٹھے تو ڈیرہ غازی خان کے ایک گاؤں شاہ کوٹ کو اپنا تبلیغی مرکز قرار دیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد آپ اپنے وطن تشریف لے گئے۔ وہاں سے پھر شاہ کوٹ واپس آگئے۔ اور کبھی بھی فریضۂ تبلیغ سے غافل نہ ہوئے۔ بلکہ پورے انہماک اور کامل سرگرمی سے ادا کرتے رہے۔ آخر میں آپ کے بہت سے حاسد پیدا ہو گئے۔ انہوں نے موقعہ پاکر آپ کو ۵۷۷ھ میں شہید کر ڈالا۔ سلطان سخی سرور بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ کے معتقد نہ صرف مسلمان ہی تھے۔ بلکہ دوآبہ کے اکثر ہندو، سکھ بھی آپ کے عقیدت مند تھے۔ انہیں سلطانی کہتے ہیں۔ یہ لوگ ہر سال وسط فروری میں آپ کے مزار کی زیارت کے لئے قافلے بنا کر اپنے اپنے گاؤں سے نکلتے ہیں۔ اور ڈیرہ غازی خاں کا رُخ کرتے ہیں۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں ملتان کے گورنر دیوان ساون مل نے تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر یہ سلسلہ روکنا چاہا۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔ آخر جل کر اس نے ہر ایک یاتری سے سوا روپیہ یاترا ٹیکس وصول کیا۔ مگر یہ بھی بے اثر ثابت ہوا۔ زیارت کا یہ سلسلہ تقسیم ہندوستان تک بدستور جاری رہا۔

سید احمد توختہ جو ترمذ کے رہنے والے تھے۔ وہ بھی لاہور میں مقیم ہوئے۔ جہاں وہ ۶۰۲ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار چوک نواب صاحب محلہ چہل بیبیاں میں ہے۔ آپ کی تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے مفتی غلام سرور خزینۃ الاصفیاء میں یوں رقم طراز ہیں کہ "ہزار ہا طالبانِ حق را بحق رسانید و خلق کثیر ازاں پیر روشن ضمیر بہرہ مند دنیا و آخرت شدند"

سید احمد توختہ سے کچھ عرصہ پیشتر سید یعقوب زنجانی مبلغ کی حیثیت سے یہاں وارد ہوئے۔ اور فریضہ تبلیغ میں مشغول ہو گئے۔ آپ ۵۳۵ھ میں لاہور پہنچے۔ یہ سید السلاطین بہرام شاہ غزنوی کا دور حکومت تھا۔ اور لاہور میں طغرل بیگ گورنر تھا۔ وہ آپ کے اخلاق اور علم وفضل سے بے حد متاثر ہوا۔ اور آپ کے ارادت مندوں کی صف میں شریک ہو گیا آپ جب لاہور میں مقیم تھے تو خواجہ معین الدین اجمیریؒ یہاں وارد ہوئے۔ اور مزار حضرت داتا گنج بخشؒ پر معتکف ہوئے اس قیام کے موقعہ پر ان دونوں بزرگوں میں گہری دوستی پیدا ہو گئی۔ دونوں بزرگ لوگوں کی ہدایت کے ساتھ ساتھ گرد و نواح کے علاقوں میں اشاعت اسلام کا کام بھی کرتے رہے۔ سید یعقوب زنجانی کا انتقال ۶۰۴ھ میں ہوا۔ آپ کا مزار لاہور میں آج تک مرجع خلائق ہے۔

ان ہی ایام میں ایک اور بزرگ شیخ عزیز الدین مکّی بھی لاہور آئے۔ آپ سید تھے۔ اور بغداد آپ کا وطن تھا۔ چونکہ آپ ۱۲ برس تک مکہ مکرمہ میں تحصیل علوم وفنون میں مشغول رہے۔ اس لئے لوگ آپ کو شیخ عزیز مکّی کہتے تھے۔ لاہور والے آپ کو پیر مکّی کہتے ہیں۔

پیر مکّی ۵۷۴ھ کو وارد لاہور ہوئے۔ یہ زمانہ بھی غزنویوں کی حکومت کا تھا۔ یہاں پر خسرو ملک حکمران تھا۔ جب سلطان شہاب الدین محمد غوری لاہور پر حملہ آور ہوا۔ تو آپ لاہور ہی میں تھے۔ خسرو ملک مقابلہ کی تاب نہ لا کر قلعہ بند ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر طالب دعا ہوا۔ آپ نے مراقبہ کیا اور فرمایا کہ جاؤ تمہیں ابھی چند برس تک کوئی خطرہ نہیں۔ مگر چند برس کے بعد یہ شہر غوریوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سلطان شہاب الدین غوری نے کچھ عرصہ بعد لاہور کا محاصرہ اٹھا لیا۔ اور سیالکوٹ کی جانب روانہ ہوا۔ کیونکہ وہاں شورش پیدا ہو گئی تھی۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے بعد وہ غور چلا گیا۔ اور چھ برس کے بعد پھر لاہور پر حملہ آور ہوا۔ اور معمولی سی جھڑپ کے بعد شہر لاہور فتح ہو گیا۔ اور خسرو ملک اس کے قبضہ میں آ گیا ؛

پیر مکّی نے کامل ۳۶ برس تک تبلیغ واشاعت دین کا کام کیا۔ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مخلوق آپ کے فیضان روحانی وعلمی سے سیراب ہوئی۔ اور بعض بڑے بڑے قبائل نے آپ کے ہاتھ سے اسلام قبول کیا۔ ۶۱۲ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

جن دنوں لاہور علم وعرفان کا مرکز تھا۔ دُنیائے اسلام تاتاریوں کی لگدکوب سے پامال ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے عالم

اور مشائخ ایران و توران سے نکل نکل کر ہندوستان اور پنجاب تشریف لا رہے تھے۔ جو بزرگ تاتاری درندوں کے ہاتھوں سے بچ کر لاہور پہنچے۔ ان میں سید مٹھہ بھی تھے۔ وہ نہایت شیریں کلام تھے۔ اس لئے عوام انہیں سید مٹھہ کہتے تھے کیونکہ ان کا حقیقی نام سید ابی عقا تھا۔ آپ کے نام پر لاہور میں بازار سید مٹھہ اب تک موجود ہے۔ آپ کی وفات ۶۶۱ھ میں ہوئی۔ آپ بہت بڑے واعظ اور مبلغ تھے۔

لاہور میں علوم و فنون کا خوب چرچا تھا۔ کیونکہ یہاں پر دیگر مقامات کی نسبت زیادہ سکون و اطمینان تھا۔ اور ویسے بھی دنیائے اسلام کے اکثر خانوادے جو سکون و طمانیت کے طالب تھے وہ تاتاریوں اور منگولوں کے ہاتھ سے بھاگ بھاگ کر لاہور میں آباد ہو رہے تھے۔ ان میں ایک ماوراء النہری خاندان یہاں آباد ہوا۔ اس گھرانے میں ۵۷۷ھ ۱۱۸۲ء میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جو تاریخ میں شیخ حسن صنعانی کے نام سے مشہور ہوا۔ آپ نے حدیث، تفسیر اور دیگر علوم میں بڑا نام پیدا کیا۔ علم باطنی بھی کئی بزرگوں سے حاصل کیا۔ آپ بعض حالات سے مجبور ہو کر ۶۱۵ھ میں بغداد ہجرت کر گئے۔ جہاں آپ ۶۵۰ھ میں فوت ہو گئے اور وصیت کی کہ انہیں مکہ مکرمہ میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ملتان و سندھ کی فتح کے بعد فتوحات کا سلسلہ بہت حد تک رک گیا تھا۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ جن پر بحث یہاں مطلوب نہیں۔ مگر صوفیائے کرام نے تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں جو قدم آگے بڑھایا۔ وہ بڑی سرعت سے بڑھتا ہی گیا۔ البتہ سندھ میں اسلام کی اشاعت بہت بعد میں شروع ہوئی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا۔ کہ وہاں قرامطہ کا اثر تھا۔ ان کی وجہ سے غالباً صوفیائے کرام نے ادھر کا رخ نہ کیا۔ مگر جب یہ اثر زائل ہوا تو وہاں اسلام بڑی سرعت اور تیزی سے پھیل گیا۔ کیونکہ وہاں زمین پہلے سے تیار تھی۔ فقط تھوڑی سی کوشش کی ضرورت تھی ؛

لاہور دہلی کی فتح سے بہت پہلے اسلام کا روحانی مرکز بن چکا تھا۔ کیونکہ وہاں پر بڑے بڑے صوفیاء اور علماء مقیم ہو چکے تھے۔ لیکن دہلی کی فتح کے بعد حالات یک قلم بدل گئے۔ اشاعت اسلام کے سلسلہ میں بے حد جوش و خروش اور مستعدی و سرگرمی نظر آئی۔ یہ کیونکر ہوا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ مگر سب سے بڑا اور اہم سبب یہ تھا کہ دہلی کے تخت پر مسلمان بادشاہ متمکن ہو چکے تھے۔ جو اپنی مجاہدانہ سعی سے اس کی سلطنت کا دائرہ روز بروز وسیع تر کر رہے تھے۔ جس کی وجہ سے صوفیائے کرام بلا روک ٹوک سلطنت کے ہر حصے میں آ جا سکتے تھے۔ انہیں

نہ توکسی کا ڈر تھا اور نہ ہی کسی قسم کی رکاوٹ باقی تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا۔ اسلئے وہ اپنے فریضہ کو زیادہ انہماک اور پُرجوش طور پر ادا کرنے لگے۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ یورش تاتار اور حملۂ مغول نے دنیائے اسلام میں ہر قسم کے نظم ونسق کو درہم برہم کر دیا۔ زندگی کے تمام ضابطے توڑ پھوڑ دیئے۔ اور طمانیت وسکون کا سر رشتہ اتنا پریشان کر دیا۔ کہ وہاں سانس لینا دشوار ہوگیا۔ ان حالات میں مشائخ اور علماء ہندوستان چلے آئے۔ یہاں انہیں زندہ رہنے کے لئے امن وامان اور کام کرنے کے لئے زمین کا ایک وسیع وعریض خطہ مل گیا۔ مشائخ وعلماء کی اس مہاجرت اور تاتاریوں کی تاخت وتاراج سے دنیائے اسلام کو بے حد نقصان پہنچا۔ مگر ان نفوس قدسیہ کی آمد سے ہندوستان کو فائدہ حاصل ہوا۔ کیونکہ ان بزرگوں کی کوشش سے اسلام کو بڑی رونق اور ترقی حاصل ہوئی۔

اس دور کی تبلیغی سرگرمیوں میں یہ بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ کہ جس طرح مغلوں اور تاتاریوں کی سفاکی اور مظالم کی داستانیں تمام تاریخ عالم میں اپنی مثال نہیں رکھتی ہیں۔ اسی طرح اس دور کی تبلیغی اور اشاعتی جدوجہد بالکل بے نظیر ہے۔ اوراق تاریخ کی ورق گردانی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان یہ سمجھ رہے تھے۔ کہ سدِ سکندری ٹوٹ پھوٹ کر بالکل منہدم ہوگئی ہے۔ اور یاجوج ماجوج بچے کھچے آثاروں کو پھاند کر دنیائے اسلام پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اب ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے متاع عزیز یعنی اسلام کو ان وحشیوں کی دست برد سے بچانے کے لئے ان کے خلاف ڈٹ جائیں۔ تاکہ انکا یہ مقدس ترین سرمایہ محفوظ ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر مسلمان اپنے اپنے مقام پر اس فرض کی بجاآوری کے لئے کمربستہ ہوگیا۔ اور اسلام کی ترقی کے لئے اس قدر شاندار کوشش کی۔ کہ یہ دور تاریخ اسلام کا زریں دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اسی دور میں اسلام ان علاقوں میں جا پہنچا۔ جو اب تک اسلام کے نام تک سے ناآشنا تھے۔

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا مقام ہندوستان کے صوفیائے کبار میں یکتا ہے۔ انہیں یہ شرف حاصل ہوا کہ انہوں نے تبلیغ اسلام کے عَلَم کو سب سے پہلے اس کفرستان میں بلند کیا ان کی کتاب فارسی زبان میں تصوّف کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ جسے اہلِ تصوّف اور اہلِ علم سر آنکھوں پر اٹھاتے ہیں۔ ان خصوصیات کے باوجود انہیں ہندوستان کے صوفیائے کبار میں وہ مقام اور درجہ حاصل

نہیں جو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے۔ کیونکہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے اجمیر میں بیٹھ کر جو بیج بویا، وہ اُگا، تناور درخت بنا۔ پھلا پھولا اور تمام ہندوستان پر چھا گیا۔

حضرت خواجہ معین الدین سیستان کے رہنے والے تھے۔ ابھی بہت چھوٹے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے باپ نے ایک باغ اور پن چکی ترکہ میں چھوڑی۔ جن کی آمدنی سے آپ بسر اوقات کرتے۔ اسی باغ میں شیخ ابراہیم قندوزی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے آپ کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ چنانچہ آپ سب کچھ چھوڑ کر تحصیل علم میں مشغول ہو گئے۔ سمرقند، بخارا سے ہوتے ہوئے عازمِ عراق ہوئے۔ مگر راستے میں نیشاپور کے قریب قصبہ ہارون میں شیخ عثمان سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے آپ کی روحانی اور باطنی تربیت فرمائی۔ آخر انہیں خرقۂ خلافت عطا کیا۔ اور آپ کو تبلیغ اسلام کی تلقین فرمائی۔ اب خواجہ غریب نوازؒ نے بلادِ اسلامیہ کی سیر و سیاحت کی۔ اس دوران میں بہت سے مشائخ اور صلحاء سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان میں شیخ شہاب الدین سہروردی، نجم الدین کبریٰ خواجہ اوحدالدین کرمانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جب آپ مدینہ منورہ پہنچے تو آپ کو خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ارشاد ہوا کہ اجمیر جاؤ اور اللہ تعالےٰ کا نام بلند کرو۔ چنانچہ جب آپ بیدار ہوئے۔ تو اس سفر کے لئے فی الفور آمادہ ہو گئے۔ اس سفر میں آپ کا سارا اثاثہ ایک عصا، ایک لکڑی کا پیالہ اور ایک چادر اور تن کے کپڑے تھے۔ آپ اسی حالت میں ۵۵۶ھ کو لاہور اور دس محرم ۵۶۱ھ کو اجمیر پہنچے۔ رائے پتھورا والئے اجمیر نے آپ کے راستے میں بڑی رکاوٹیں پیدا کیں اور طرح طرح سے ستایا۔ تاکہ آپ تنگ آ کر وہاں سے چلے جائیں۔ مگر آپ نے سب آزمائشوں کا بڑی خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ اور تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر وہ وقت آ گیا۔ کہ رائے پتھورا تباہ ہو گیا۔ اور آپ کے گرد ارادتمندوں کا ایک حلقہ قائم ہو گیا۔ اور راجپوتانے کے کفر زار سے توحید کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اجمیر میں آپ نے مسجد اور خانقاہ تعمیر کی اور وہاں بیٹھ کر آپ نے ہندوستان کو اسلام کے نام پر مسخر کرنے کے لئے منصوبہ بندی کی۔ اور اپنے خلفاء کو ہندوستان کے مختلف حصوں میں تبلیغ کے لئے روانہ کیا۔ اور خود دلجمعی کے ساتھ یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ آخر ۹۷ برس کی عمر پا کر ۶۳۳ھ میں فوت ہو گئے۔

آپ کا مزار اجمیر میں ہے۔ اور اس وقت تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ سچ ہے کہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آج پاک وہند کا بچہ بچہ آپ کے نام سے واقف ہے۔ آپ کی پاکیزہ زندگی، مبلّغانہ سعی، اور مصلحانہ کوششوں کا دل وجان سے معترف ہے۔ وہ آپ کو پاک و ہندوستان میں سب سے بڑا مبلغ اسلام تسلیم کرتا ہے کیونکہ انہی کی جدوجہد سے آج اس برصغیر میں دس کروڑ مسلمان موجود ہیں۔

خواجہ معین الدین کے معاصرین میں پیر سید حسین خنگ سوار اور سید علاؤالدین نذرباری بہت زیادہ شہرت کے مالک ہیں۔ موخرالذکر نے خاندیش کے علاقہ نند باریں تبلیغ کا فریضہ ادا کیا۔ آپ کفّار کا مقابلہ کرتے ہوئے سنہ ۶۱۲ھ میں شہید ہوئے۔

اس وقت ملتان پنجاب کا روحانی مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں سلسلہ سہروردیہ کے نامور شیخ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ مقیم تھے۔ اور تمام مغربی پنجاب کو اپنی زبردست شخصیت سے متاثر کر رہے تھے۔ ۵۷۸ھ / ۱۱۸۲ء کو پیدا ہوئے حصول تعلیم کے لئے بلخ، بخارا، بیت المقدس اور بغداد کا سفر کیا۔ اور بڑے بڑے مشائخ اور علمائے سے فیض حاصل کیا آخر آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور ان کی خدمت میں رہ کر روحانی تربیت اور باطنی تعلیم حاصل کی۔ آخر خلعت خلافت حاصل کیا۔ اسوقت آپ کو شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے حکم دیا کہ ملتان واپس جاؤ۔ وہ تمہارا وطن ہے۔ وہاں کی ہدایت تمہارے ذمہ ہے۔ آپ اپنے شیخ کے حکم سے ملتان آئے۔ اور درس وتدریس شروع کیا۔ مغربی پنجاب اور سندھ کا علاقہ آپ کا گرویدہ ہوگیا۔ اور آپ کی شہرت دور ونزدیک پھیل گئی۔ کبھی کبھی آپ دہلی میں تشریف لے جاتے۔ وہاں کے لوگ بھی آپ کو سرآنکھوں پر جگہ دیتے اور بڑے ادب سے پیش آتے۔

عام تذکروں میں ہے کہ جب آپ اپنے پیرِ طریقت کے حکم سے ملتان پہنچے تو وہاں کے علماء، ومشائخ کو آپ کا وہاں آنا شاق گزرا۔ ان کے دلوں میں انقباض پیدا ہوا۔ چنانچہ اسی بات کے اظہار کے لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ کہ ایک پیالہ دودھ سے لبالب بھرا اور اسے آپ کی خدمت میں ارسال کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ ملتان کے شہر میں اہل اللہ اس کثرت سے موجود ہیں کہ یہاں اب کسی اور کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ آپ ایک ہی نظر میں انکا مطلب بھانپ گئے۔ اور نہایت لطیف پیرائے میں اپنا مطلب ادا کیا۔ کہ گلاب کا ایک پھول لے کر دودھ کے پیالہ میں رکھدیا

جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں تم میں اس طرح رہوں گا جس طرح یہ پھول دودھ کے پیالہ میں ہے۔ آپ کے اس جواب سے ساری کدورت دور ہو گئی۔ اور آپ کی ذہانت اور نکتہ آفرینی پر سب عش عش کرنے لگے۔

اب آپ نے اطمینان سے تبلیغ اسلام کا سلسلہ شروع کیا۔ اور دور و نزدیک سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے شروع ہوئے۔ ان میں شیخ فخرالدین عراقی بھی تھے۔ جو فارسی زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ آپ کی نظر کیمیا اثر نے چند ایام میں انہیں ولایت کے مقام پر پہنچا دیا۔ یہاں پر بحوالہ کتاب آب کوثر یہ ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ کہ

تصوف کے ہندوستانی سلسلوں میں سب سے زیادہ شہرت چشتیہ خاندان کو ہے [اور فی الواقع اس میں کئی خصوصیتیں ایسی تھیں جنہیں ہندوستانی حالات خاص طور پر سازگار تھے۔ (مثلاً موسیقی اور سماع کا رواج، ادبیت اور شعروشاعری سے اُنس، ملائمت، غیرمسلموں کے ساتھ غیرمعمولی رواداری) جنہوں نے اس کی مقبولیت اور اشاعت میں بڑی مدد کی مسلمانوں کی روحانی تربیت میں بھی اس سلسلہ کے بزرگان کبار نے بڑا حصہ لیا) لیکن سہروردیہ سلسلہ بھی چشتیہ کی طرح بہت پرانا ہے۔ اور ٹھوس تبلیغی کاموں میں تو شاید اس کا پلہ چشتیہ سے بھی بہت بھاری ہے۔ کشمیر میں اسلام کبرویہ سلسلہ کے بزرگوں (مثلاً امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ اور ان کے صاحبزادے میر محمد ہمدانیؒ) نے پھیلایا۔ جو سہروردیوں ہی کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ بنگال کے پہلے کامیاب مبلغ شیخ جلال الدین تبریزیؒ تھے۔ جو شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ اس وقت مشرقی بنگال کی سب سے بڑی زیارت گاہ سلہٹ میں ایک سہروردی (شاہ جلال مینیؒ) کا مزار ہے۔ گجرات کے قدیمی دارالخلافہ پٹن میں حضرت سلطان المشائخ اور حضرت چراغ دہلیؒ نے بھی اپنے خلفاء بھیجے، لیکن دارالخلافہ یعنی شہر احمد آباد کی سب سے بڑی زیارتیں حضرت قطب عالمؒ اور حضرت شاہ عالمؒ کے سربفلک روضے سہروردی یادگار ہیں۔ اور پاک پٹن سے مغرب کے علاقے یعنی سندھ مغربی اور بلوچستان کو تو بابا فریدؒ بھی بہاؤالدین ذکریا سہروردیؒ کی ولایت کا جزو مانتے تھے۔ جس کا ذکر بابا صاحب نے سیرالعارفین کے صفحہ ۱۱۵ میں کیا ہے۔

چشتیوں اور سہروردیوں میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں اور اس امر کا بھی رواج تھا۔ کہ ایک شخص دونوں سلسلوں کے بزرگوں سے فیضیاب ہو لیکن اگر ان بزرگوں کے حالات زندگی اور کارناموں کو بہ نگاہ غائر دیکھیں تو ان کا امتیازی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے تو یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ بیعت کے وقت چاروں خاندانوں

(چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ) بزرگوں کے نام لیتے تاکہ ان سب سے فیض حاصل ہو۔ اور ان کی خصوصیات اخذ ہوں، ان رجحانات کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ مختلف سلسلوں کے ماننے والوں کے درمیان وہ حد فاصل نہ رہی، لیکن پھر بھی ان کے طریق ذکر و عبادت میں کئی امتیازات ہیں۔

چشتیہ:۔ ان کے ہاں کلمۂ شہادت پڑھتے وقت الا اللہ پر خاص طور پر زور دیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ عموماً ان الفاظ کو دہراتے وقت سر اور جسم کے بالائی حصے کو ہلاتے ہیں، ان میں شیعہ حضرات کثرت سے ہیں۔ اور اس سلسلے کی امتیازی خصوصیت سماع کا رواج ہے۔ حضرات چشت پر سماع کے وقت ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بسا اوقات اس سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں۔ چشتی درویش بالعموم رنگ دار کپڑے پہنتے ہیں۔ اور ان میں زیادہ تر ہلکے بادامی رنگ کو ترجیح دیتے ہیں۔

سہروردیہ۔ ان کے ہاں سانس بند کر کے اللہ ھُو کا ورد کرنے کا بڑا رواج ہے، وہ ذکر جلی اور ذکر خفی دونوں کے قائل ہیں، سماع سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اور تلاوت قرآن پر خاص طور پر زور دیتے ہیں۔

قادریہ۔ پنجاب کے بیشتر سنی مولوی اس سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قادری سماع بالمزامیر کے خلاف ہیں۔ اور ان کے حلقوں میں موسیقی کو (خواہ وہ بالمزامیر ہے یا ان کے بغیر) بہت کم بار ملتا ہے۔ قادری درویش بالعموم سبز پگڑی پہنتے ہیں اور ان کے لباس کا کوئی نہ کوئی حصہ ہلکے بادامی رنگ کا ہوتا ہے۔ وہ درود شریف کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے عمل میں ذکر خفی اور ذکر جلی دونوں جائز ہیں۔

نقشبندیہ۔ وہ ذکر جلی کے خلاف ہیں۔ فقط ذکر خفی کو جائز سمجھتے ہیں، وہ بالعموم مراقبہ میں سر کو جھکائے، آنکھوں کو بند کئے یا زمین پر لگا کر بیٹھتے ہیں۔ موسیقی اور سماع کے خلاف ہیں اور احکام شریعت پر سختی سے عامل ہیں۔ ان کے ہاں مرشد اپنے مریدوں سے الگ نہیں بیٹھتا۔ بلکہ حلقہ میں ان کا شریک ہوتا ہے۔ اور توجہ الی الباطن سے ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

چشتیوں کی خصوصیات تو اوپر بیان ہو چکیں۔ سہروردی امور شرعی میں ان سے زیادہ محتاط تھے۔ ان کے ہاں سماع بہت کم تھا۔ خلاف شرع امور میں وہ فوراً ناپسندیدگی کا اظہار کرتے، دوسرے مذہبوں کے ساتھ ان کا برتاؤ غیر معمولی رواداری کا نہ تھا۔ تبلیغ کا جوش بھی ان میں زیادہ۔ سیر و سفر کا شوق بھی انہیں چشتیوں سے کہیں

بڑھ کر تھا۔ بالعموم چشتیوں کا رنگ جمالی تھا، سہروردیوں کا جلالی، ان سب باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ اگرچہ دارالخلافہ کی نازک مزاج اور حساس ہستیوں کو سہروردی کسی بڑی حد تک مسخر نہ کر سکے۔ لیکن اطراف ملک میں انہوں نے اسلام کا ڈنکا خوب بجایا۔ اور اسلام کی بڑے پرجوش طریقہ سے اشاعت کی۔

افسوس ہے کہ سہروردیوں کی مکمل تاریخ مرتب نہیں ہوئی اور آج تو اس کے لئے مواد نہیں ملتا۔ سہروردیوں نے کام زیادہ تر اسلامی ہندوستان کے سیاسی اور ثقافتی مرکزوں سے دور رہ کر کیا ہے۔ ان کی روحانی کوششوں کو دارالخلافے کی تیز برقی روشنی نے اجاگر نہیں کیا۔ اور اتفاق سے ان میں اہلِ قلم حضرات کی بھی بہتات نہیں ہوئی۔ چشتیوں میں سے اکثر اصحاب سجادہ (مثلاً حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت سلطان المشائخؒ سید گیسو درازؒ) ایک خوشگوار ادبی رنگ کے حامل بلکہ شاعر تھے۔ ان کے مریدوں میں امیر خسروؒ، امیر حسن سنجریؒ، ضیاء الدین برنی مورخ جیسے کامل الفن ادیب اور شاعر موجود تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کارنامے بڑی آب و تاب سے بیان ہو کر ہماری روحانی زندگی کا جزو ہو گئے۔ لیکن سہروردیوں کی ٹھوس مذہبی خدمات سے (جن کی بدولت مشرقی اور مغربی پاکستان میں اسلام کا بول بالا ہوا) ایک عام بے خبری ہے۔

شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے معاصرین میں بابا فریدالدین گنج شکرؒ اور شیخ حمیدالدین ناگوریؒ ایک خاص مقام کے مالک ہیں۔ بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی وجہ سے بھٹی راجپوتوں نے اسلام قبول کیا اور شیخ حمیدالدین ناگوریؒ نے راجپوتانہ میں تبلیغ کی اور راجپوتوں کو اسلام کا پرستار بنایا۔

شیخ فریدالدینؒ اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ ان دونوں بزرگوں میں اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ ایک مرتبہ آپ نے انہیں خط لکھا۔ جس میں یہ فقرہ بھی تھا کہ "میانِ ما و شما عشق بازی است" بابا فرید گنج شکرؒ نے لکھا کہ "میانِ ما و شما عشق است بازی نیست" اس واقعہ سے ان بزرگوں کے باہمی تعلقات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

آپ کے زمانہ میں ناصرالدین قباچہ ملتان کا حاکم تھا۔ وہ سلطان محمد غوری کا غلام تھا۔ جب شمس الدین التمش دہلی کا بادشاہ ہوا تو ناصرالدین قباچہ کے دماغ میں ایک آزادانہ خود مختار حکومت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور وہ منصوبے تیار کرنے لگا۔ شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو جب اس کے ارادوں کا علم ہوا تو انہوں نے بلاکم و کاست سارا

واقعہ التتمش کو لکھا۔ اتفاقاً یہ خط قباچہ کو مل گیا۔ وہ اُسے پڑھ کر بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ شیخ کو حاضر کیا جائے جب آپ حاضر ہوئے تو اس نے شیخ سے باز پرس شروع کی۔ شیخ نے یہ اعتراف کیا کہ خط انہوں نے لکھا ہے کیونکہ وہ پسند نہیں کرتے کہ جنگ و جدال ہو اور مسلمانوں کا خون بہایا جائے۔ قباچہ اس جواب سے خاموش ہو گیا۔

آپ کی وفات ۶۶۱ھ میں ہوئی۔ آپ کا مزار ملتان میں ہے۔ جہاں ہر سال عرس منایا جاتا ہے اور ہزاروں آدمی اس میں شریک ہوتے ہیں۔

آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے شیخ صدر الدینؒ آپ کے جانشین ہوئے۔ انہوں نے رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ تبلیغ و دعوتِ اسلام کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ ان کے بعد شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ اپنے باپ کے جانشین ہوئے وہ اپنے دادا شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مرید تھے۔ دہلی کا شہنشاہ علاؤالدین خلجی آپ کا بے حد معتقد تھا۔ جب آپ کو ایک دو مرتبہ دہلی جانا پڑا تو خود علاؤالدین خلجی آپ کے استقبال کے لئے آیا۔ اور رخصت کے وقت دو لاکھ سکّے آپ کی نذر کئے۔ آپ نے یہ سب رقم غریبوں، محتاجوں اور مستحقوں میں تقسیم کر دی۔

جب علاؤالدین خلجی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مبارک خلجی بادشاہ ہوا تو دہلی میں شیخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ تبلیغ میں مشغول تھے۔ مبارک کے تعلقات ان سے خوشگوار نہ رہے۔ اس نے شیخ رکن الدینؒ کو دہلی طلب کیا۔ تاکہ وہ شیخ نظام الدینؒ کو نیچا دکھائیں۔ مگر آپ بادشاہ کے روبرو حضرت محبوب الٰہی سے اس تپاک اور گرم جوشی سے ملے کہ بادشاہ کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور وہ بالکل مایوس ہو گیا۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے آپ سے دریافت کیا کہ جب آپ دہلی تشریف لائے تھے تو اہلِ شہر میں سے سب سے پہلے کون آپ کے استقبال کے لئے آیا تھا۔ تو آپ نے فرمایا۔ جو شہر میں سب سے بہتر ہے۔ بادشاہ اس جواب سے اور جل گیا۔ اب آپ نے دہلی میں مستقل قیام اختیار کیا۔ اور حضرت محبوب الٰہی سے پُرلطف صحبتیں رہنے لگیں۔ اور جب محبوب الٰہیؒ کا انتقال ہوا تو آپ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آپ نے بڑی لمبی عمر پائی۔ اور بہت سے بادشاہوں کو تخت پر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ آخر ۷۳۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا آپ کے خلفاء میں شیخ وجیہ الدین عثمانؒ اور مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے آپ کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی۔

خواجہ معین الدینؒ (سلطان الہند) کا قیام اکثر و بیشتر اجمیر ہی رہا۔ مگر آپ نے دہلی کا مشن خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

کے سپرد کیا۔ وہ آپ کے مُرید اور خلیفہ تھے۔ جن ایام میں حضرت خواجہ غریب نوازؒ اجمیر میں تھے۔ آپ بغداد میں قیام پذیر تھے۔ حضرت خواجہ کی ارادتمندی کا حلقہ وہیں پر آپ اپنی گردن میں ڈال چکے تھے۔ اور مریدوں میں شامل ہو چکے تھے۔ وہ آپ کے ساتھ ہی اجمیر آنا چاہتے تھے۔ مگر آپ نے تکمیل تعلیم کو اپنی ہمرکابی پر مقدم سمجھا اور انہیں بغداد میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا۔ جب آپ نے سندِ فراغت حاصل کر لی تو پھر عازم اجمیر ہوئے۔ کچھ دن ملتان میں ٹھہرے اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی صحبت سے مستفیض ہوئے اور خواجہ غریب نوازؒ سے حاضری کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا کہ قربِ روحانی کے آگے بُعدِ مکانی بے حقیقت چیز ہے۔ اس لئے تم دہلی کو اپنا مرکز بناؤ۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دہلی میں اقامت اختیار کی۔ ان ایام میں سلطان شمس الدین التمش ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔ اس نے شیخ الاسلام کا عہدہ آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ مگر آپ نے قبول نہ کیا۔ اور آپ کی سفارش پر یہ عہدہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے ایک عزیز شیخ نجم الدین صغراء کے سپرد ہوا۔ مگر ان میں بہت جلد ان بن ہو گئی۔ چنانچہ سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ خود دہلی تشریف لائے۔ ان کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا۔ تو انہوں نے فرمایا۔ کہ علماء مشائخ میں یہ جھگڑا کیوں ہو۔ دوسروں کو وعظ و تلقین کرنے والوں کا اگر یہی کردار ہے تو پھر عوام کا کیا بنے گا؟ انہوں نے خواجہ قطب الدینؒ کو ساتھ چلنے کیلئے کہا، انہوں نے واپس جانے کی تیاری شروع کی۔ مگر دہلی والوں نے خواجہ قطب الدینؒ کے قیام دہلی پر اصرار کیا۔ آپ نے انکی درخواست قبول کر لی۔ اور خواجہ قطب الدین کو دہلی رہنے کی اجازت دے دی۔

سلطان التمش آپ کا بے حد معتقد تھا۔ وہ آپ کے قیام دہلی پر اکثر خداوندِ کریم کا شکریہ بجا لاتا تھا۔ اور آپ کی صحبت کو اپنے لئے از بس غنیمت سمجھتا تھا۔ آپ نے دہلی کے گرد و نواح میں تبلیغ اسلام کی۔ آخر آپ ۱۴ ربیع الاول ۶۳۴ھ مطابق ۱۲۳۶ء کو فوت ہوئے اور دہلی میں مدفون ہوئے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی وفات کے بعد آپ کی جانشینی کا قرعہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے نام نکلا۔ آپ کا اصل نام مسعود تھا اور آپ بمقام کھوتووال (ضلع ملتان) میں پیدا ہوئے۔ آپ کی طالب علمی کا زمانہ تھا کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا گزر ملتان سے ہوا۔ آپ کی ملاقات ان سے ہوئی۔ آپ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ اور دہلی پہنچ کر اپنی روحانی تربیت میں مشغول ہوئے۔ دہلی میں چونکہ حضرت خواجہ کے عقیدتمندوں کا بہت بڑا ہجوم رہتا تھا۔ اس لئے آپ کو یکسوئی حاصل نہ ہوتی تھی۔ آپ اپنے پیر طریقت کی اجازت سے ہانسی چلے گئے۔ مگر دہلی اکثر آنا جانا رہتا تھا۔

اپنے مرشد کی وفات کے بعد آپ دہلی آئے۔ پھر اپنے وطن مالوف گئے اور آخر اجودھن (پاک پٹن) آئے جہاں آپ کا انتقال ۱۲۶۵ء کو ہوا۔ آپ نے اشاعت اسلام کا بہت زیادہ کام کیا۔ مغربی پنجاب کے بہت سے قبائل خاص کر سیال، وٹو، بھٹی راجپوت آپ کے ہاتھ پر ہی مسلمان ہوئے۔ آپ کے دامن تربیت میں مخدوم علاؤالدین صابرؒ (کلیر) المتوفی ۱۲۹۱ء ۶۹۰ھ، قطب جمال الدین ہانسویؒ المتوفی ۶۵۹ھ، حضرت سلطان المشائخؒ امام علی الحق (سیالکوٹ) المتوفی ۶۸۶ھ نے روحانی تعلیم حاصل کر کے ہندوستان کے مختلف مقامات پر اپنے اپنے مرکز قائم کئے۔ اور تبلیغ واشاعت اسلام کا فریضہ ادا کیا۔

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء، محبوب الٰہی علیہ الرحمۃ۔ بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اعظم تھے۔ آپ ۶۳۶ھ کو بمقام بدایوں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام سید محمد تھا۔ آپ نے دہلی پہنچ کر حدیث، تفسیر، ادب اور فلسفہ میں سندِ فضیلت حاصل کی۔ آپ کے کمالات کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا۔ اس لئے حکومت نے آپ کی خدمت میں شیخ الاسلامی کا عہدہ پیش کیا۔ جسے آپ نے ٹھکرا دیا۔ کیونکہ آپ کے دل میں یہ لگن تھی کہ بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر روحانی فیوض وبرکات حاصل کریں۔ چنانچہ ۶۵۵ھ کو آپ اجودھن پہنچے۔ اور آپ کے ہاتھ پر بعیت کی۔ اور کامل چار برس آپ کی خدمت میں حاضر رہے۔ بابا فریدالدینؒ نے آپ کی زندگی کی رو بدل دی۔ جب آپ کو علومِ باطنی میں بھی کمال حاصل ہوا۔ تو حضرت بابا نے حکم دیا۔ کہ آپ دہلی تشریف لے جائیں۔ اور عوام کی اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ روحانی تربیت بھی کریں۔ رخصت کے وقت آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں سلطان الہند کرتا ہوں۔ سلطان کے لئے تلوار کا ہونا ضروری ہے۔ یہ لو، یہ قرآنِ مجید ہے۔ یہ تمہاری تلوار ہے۔ اسے محورِ عمل بنانا اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو تمہاری سلطانی ختم ہو جائے گی۔ آپ دہلی آئے۔ اپنے پیرِ طریقت کی ہدایت پر عمل شروع کیا۔ آپ شروع شروع میں شہر میں رہتے تھے۔ مگر آخر کار موضع غیاث پور کو اپنا مسکن قرار دیا۔

حضرت محبوب الٰہی کا آستانہ ایسا تھا کہ بڑے بڑے بادشاہ اس پر جبہ سائی کرنا فخر سمجھتے تھے۔ چنانچہ علاؤالدین خلجی اور اس کے جانشین اکثر آپ کی خانقاہ میں حاضر ہؤا کرتے تھے۔ ہندوستان کے مشائخ میں آپ ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ آپ نے منظم طور پر تبلیغ اسلام کا بندوبست کیا۔ ہر علاقہ میں باقاعدہ اشاعت اسلام کا کام کیا۔ اور وہاں کے لئے اپنے نائب اور خلیفے مقرر کئے۔ چنانچہ بوعلی قلندر پانی پت میں، شیخ نصیرالدین شاہ چراغ دہلی میں، شیخ

برہان الدین غریب دکن میں، شیخ سراج الدین عثمان بنگال میں، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہار میں تبلیغ اسلام کے لئے نامزد ہوئے۔ اس طرح تمام ہندوستان تعلیماتِ اسلامی سے روشناس ہوا۔ اور آپ واقعی روحانی ہندوستان کے سلطان الہند ہو گئے۔

ملتان کے بعد پنجاب میں اوچ ایک ایسا مقام تھا۔ جو اسلامی حکومت کے ابتدائی ایام میں تبلیغ اسلام کا زبردست مرکز تھا یہاں سے اسلام کی کرنیں راجپوتانہ، سندھ اور پنجاب میں پھیل گئیں۔

اوچ ایک قدیم قصبہ ہے اور پنج ند کے قریب واقع ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ محلہ گیلانیہ اور محلہ قادریاں، اوّل الذکر میں سلسلۂ قادریہ کے بزرگ رہتے تھے اور موخر الذکر میں سہروردی سلسلہ کے مشائخ کبار اقامت پذیر تھے۔

سب سے اوّل ۶۴۳ھ میں یہاں پر شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے خلیفہ سید جلال الدین منیر شاہ میر سرخ بخاری تبلیغ کے لئے وارد ہوئے۔ اور محلہ بخاریاں کی بنیاد ڈالی۔ یہ زمانہ تھا جب یہاں ہندو اور غیر مسلم ہی آباد تھے۔ اس لئے اسے دیو گڈھ کہتے تھے۔ آپ نے اپنے قیام کے دوران میں سینکڑوں راجپوت قبیلوں کو مسلمان کیا۔ آپ ۹۵ برس کی عمر میں سنہ ۶۹۰ھ میں فوت ہوئے۔

آپ کے بعد شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ کے ایک اور خلیفہ شیخ موسیٰ نواب اوچ آئے۔ ان کے ہاتھ پر دو راجپوت قبیلے مسلمان ہوئے۔ آپ کے بعد سدراجو قتال اور ان کے برادر محترم جہانیاں جہاں گشت نے اسلام کی اشاعت کا فریضہ باحسن الوجوہ ادا کیا۔ نون مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ مخدوم لال شہباز قلندر نے سندھ کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کی جولانگاہ بنایا۔ آپ سلسلہ سہروردیہ سے وابستہ تھے۔ شیخ بہاؤ الدین زکریا کے مرید تھے۔ آپ کا قیام زیادہ سیوستان میں رہا۔ جہاں آپ کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ سرخ لباس پہنتے تھے۔ اسلئے آپ کے ارادت مند اور عوام آپ کو لال شہباز کہتے تھے۔ سسں نما، پر آپ کے وابستگان دامن بھی لال شہبازیہ کہلائے یہ بالکل مجمل کیفیت ہے۔ ان سرگرمیوں کی جو حضرات صوفیاء اور مشائخ نے تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں اختیار کیں اور جن کی بدولت ہندوستان توحید و مساوات سے آشنا ہوا اور انسانیت کے بلند مرتبہ پر پہنچا۔

بزرگان دین کی ان تبلیغی سرگرمیوں سے اس اعتراض کا بھی قلع قمع ہو جاتا ہے۔ جو اغیار نے یہ کہہ کر گڑھ لیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی تردید میں ۲۱ نومبر سنہ ۱۹۴۷ء کو شام کے وقت ایک پنجابی تجدیدیہ

میں ہندو وزیر ترقیات پنجاب سر چھوٹو رام نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ موجودہ ہندو مسلم سکھ کشیدگی تاریخی واقعات کی دانستہ تحریف کا نتیجہ ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں کو جو باتیں کہہ کہہ کر مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک فرضی داستان یہ بھی ہے۔ کہ ایک مسلمان فرمانروا اس وقت تک کھانا نہیں کھایا کرتا تھا جب تک کہ ہندوؤں کی اتنی تعداد روزانہ مسلمان نہ کر لیا کرتا۔ جن کے جنیو یک وقت سوا من بھاری ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں کی کل تعداد پانچ چھ کروڑ سے زیادہ نہیں تھی۔ اور سوا من وزنی جنیو انداز اً چالیس پچاس ہزار ہندوؤں کے گلے سے ہی اُتر سکتے ہیں۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ اگر یہ الزام درست ہوتا۔ تو ہندو آج تک بالکل مٹ گئے ہوتے۔ اس من گھڑت قصے کے من گھڑت ہونے کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے عام طور پر دہلی اور آگرہ سے تمام ہندوستان پر حکومت کی۔ لیکن ان دارالخلافوں کے اردگرد ہندو آبادی علے الترتیب پچھتّر اور پچاسی فیصدی کے قریب ہے۔ اگر کھانا کھانے سے پہلے اتنے ہندوؤں کا مسلمان کر لینا ضروری سمجھا جاتا تھا تو مسلمان فرمانرواؤں کی یہ خواہش آگرہ اور دہلی کے نواحی علاقوں میں تو بسرعت اور نہایت اچھی طرح پوری ہو سکتی تھی۔ حالانکہ انہی علاقوں میں ہندوؤں کی بھاری سے بھاری تعداد اب بھی اس بے حقیقت افسانے کی زندہ اور دائمی تردید موجود ہے۔ یہ سفید جھوٹ ہے جو خود غرض انسانوں نے ہندوستان کی اقوام کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور ابدی منافرت کا بیج بونے کے لئے تراش رکھا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں حقیقت یہی ہے کہ اسلام بزور شمشیر ہرگز نہیں پھیلا۔ بلکہ اس کی ترقی اور عام تبلیغ مسلمان صوفیا، اور بزرگوں کے بے مثل اخلاق اور درویشوں کی پاکیزہ سیرت کی مرہونِ منت ہے

الغرض صوفیائے عظام کا گروہ جو سیّدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد یا سیّدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سانحۂ ارتحال کے پیچھے حکومتِ ظاہری سے کنارہ کش ہوا وہ اسلامی دنیا سے الگ نہیں ہوا۔ بلکہ حکومت کی رفتار بے ڈھنگی اور اقربا نوازی سے الگ ہو کر بھی روحانی اثر سے خدمتِ اسلام کرتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ تمام بلادِ اسلامیہ میں ان کی خدمات مسلسل طور پر منظم ہو گئیں۔ عوام الناس ان کے مذہبی اثر میں تھے۔ جن کو انہوں نے علومِ باطنی کے سوا علومِ ظاہری کی تعلیم بھی دینا اپنا فرضِ منصبی سمجھا۔ امرائے سلطنت ان سے فیضیاب ہو کر شاہی خاندان کو جادۂ اعتدال سے منحرف نہ ہونے دیتے تھے۔ شروع شروع میں بنو امیہ اور بنو عباس کے ایوانِ خلافت میں اس گروہ کی وہ قدر و منزلت نہ ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔ بعد کے سلاطین نے اس جماعت کی کماحقہٗ قدر افزائی کی۔ لیکن ان کا ازحد احترام نہ صرف عوام میں بلکہ ان لوگوں میں بھی رہتا تھا جن سے اراکینِ سلطنت منتخب کئے جاتے تھے اور جتنے درباری اور لشکری

ہوتے تھے۔ ان کے حسنِ اخلاق اسی طبقہ کے حضرات کی حسنِ سعی سے قائم رہتے تھے۔ یہ بات مشہور ہے اور بجا طور پر مشہور ہے کہ ترکوں اور مغلوں کی فوج میں سپاہیوں اور سواروں کے بھیس میں اولیاء اللہ رہا کرتے تھے۔ اور انکا یوں رہنا اپنے پیشواؤں کی ہدایات کے مطابق اس خفیہ انتظامِ روحانیت کی تبعیت میں ہوتا تھا۔ جس کے ذریعہ سے اغیاث، اقطاب، ابدال، اوتاد کی خدمتیں تفویض ہوتی تھیں۔ انتظام خاص اور نظام عسکریت کو اس سے کوئی تعلق بھی نہ ہو۔ جب بھی یہ بات بہت قرینِ قیاس ہے کہ فوائد جہاد بتلانے اور شہادت کی بلندیٔ درجات پر وعظ کہنے والے لشکرِ اسلام میں اگر موجود نہ ہوتے تو معمولی سپہ سالاروں کی ہدایات سپاہیوں کو جان پر کھیلنے کی ترغیب نہیں دلاسکتی تھیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ نے شاہی دربار کی شان و شوکت کو ناپسند کر کے کنارہ تو کر لیا۔ لیکن تحریصِ جہاد کیلئے سپاہیوں کی سیدھی سادھی زندگی سے انس قائم رکھا۔ اور لباس کی تھوڑی سی تبدیلی میں اپنا کام کرتے رہے۔

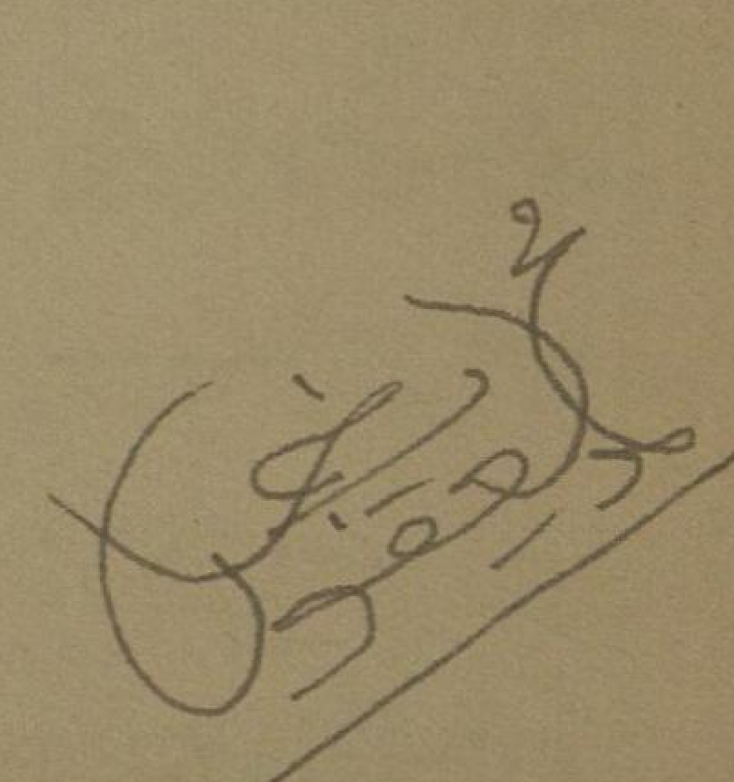
لوگ کہتے ہیں کہ عیش پسندی نے مسلمانوں سے سپاہیانہ زندگی ترک کرادی۔ جس سے اسبابِ زوال پیدا ہوئے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ بندگانِ خدا نے جب فوج سے کنارہ کیا۔ تو ان کی کنارہ کشی فوجِ اسلام کو ناکارہ کر گئی اور فوج کی ناکارگی سے سلاطین کے دل بیٹھ گئے۔ کیونکہ جب تک جہاد کی صحیح سپرٹ اور کفر کو مٹانے کا پاکیزہ جذبہ سپاہی میں پیدا نہ ہو۔ محض تنخواہ دار فوج پر بھروسہ کرنا ایک بیہودہ نظریہ ہے۔ اب رہا یہ امر کہ اولیاء کرام نے فوجی خدمات سے کیوں بے تعلقی اختیار کی۔ اس کا سیدھا اور درویشانہ جواب تو یہ ہے کہ مشیتِ ایزدی یوں ہی تھی۔ لیکن دنیا دارالاسباب ہے۔ اس لئے یوں بھی کہنا پڑے گا کہ مسلمانوں نے حکومت پانے پر بہت جلد خود فراموشی اختیار کر لی۔ لیکن بایں ہمہ دنیا سے بظاہر قطع تعلق کرنے والے درویش عرصہ تک دنیا داروں کی اصلاح کرتے رہے۔ اور اس سے اسلامی عمارت عرصہ تک قائم رہی۔ بعد ازاں باطنی گروہ میں نااہل اور ریاکار و بد باطن لوگوں نے گھسنا شروع کیا۔ تو جھوٹوں نے سچے موتیوں کی بھی بے قدری کر دی اور کچھ دنوں بعد فرقہ عباسیہ کی جو حالت ہوئی۔ سب پر ظاہر ہے۔ با اثر جماعتیں دو ہی تھیں۔ درویش یا مالدار۔ مالداروں کو تو عیش و عشرت نے برباد کیا اور درویشوں کو ریاکاری اور دریوزہ گری نے بیکار کر دیا۔ چھت بوسیدہ تھی۔ مگر ستون جب تک قائم رہا ہے تعمیر کھڑی رہی۔ جب پیشوائے مذہب ہی نہ رہے تو تعمیر بھی قائم نہ رہ سکی۔

اسلام محض بحیثیت مذہب رونق نہیں پکڑ سکتا۔ جب تک ہماری مسجدیں آباد۔ خانقاہیں پُر رونق اور علماء باعمل کے زیر اثر نہ ہوں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے علماء میں محدثین ہیں۔ مفسرین ہیں۔ فقہاء ہیں۔ اور کتنے حضرات ایسے بھی ہیں کہ فقہ، حدیث، تفسیر سب میں ماہر ہیں۔ لیکن عملی حیثیت سے سرتا پا سنتِ نبوی علیہ السلام کے خلاف، عمل تو انکا انکی ہوسِ نفس کے ماتحت اتنا بھی نہیں، جس قدر ان کی تقاریر و مواعظ میں بناوٹی جذبہ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ محض اقوال سے کہیں زیادہ سنتِ نبوی کا اتباع اعمال میں ہونا چاہئے۔ تاکہ اسلام کی پوری پوری محاسن و برکات عوام میں ظاہر ہوں اور اغیار بھی اسلام سے محبت کرنے لگیں۔ علوم ظاہری کا حصول اس امر کا ضامن نہیں ہوتا کہ اعمال بھی صالح ہوں گے عمل صالح کی ضمانت تعلیم باطن سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے زمانہ میں علوم ظاہر سے فراغت حاصل کرنے پر باطن کی بھی تحصیل کی جاتی تھی۔ اور یہی علماء اس وقت پیشوایانِ مذہب اور جانشینانِ رسول علیہ السلام تصور کئے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں خرابیوں کا باعث ایک اور چیز بھی پیدا ہوئی اور وہ یہ تھی کہ علوم ظاہر تحصیل کئے بغیر تعلیم باطن کا رواج پھیلا اور عوام الناس نے ان ناقص پیشواؤں کی متابعت شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ خود نامردی اور مردوں کی رہزنی پر منتج ہوا۔ یہاں تک بھی کچھ نقل سے اصل کی ہمنوائی کا گمان تھا۔ مگر غضب یہ ہوا کہ یہ ناقصین کا گروہ جس نے بزعمِ خود کاملین کا جُبّہ پہنا۔ حصول زر کو اپنا نصب العین بنا کر میدان میں آئے اور متلاشئ حق طبقہ میں ذلیل و رسوا ہوئے کیونکہ ان کا دعوائے باطن و حق پرستی بے دلیل تھا۔ اثر یہ پڑا کہ وہ طبقۂ عالیہ جس پر اہلِ اسلام کو ناز تھا۔ باعثِ تخریب ٹھہرا دیا گیا۔ اور اسکی وجہ سے تصوف اور اہل اللہ پر وہ نکتہ چینیاں ہوئیں کہ اہلِ جہاں نے اس گروہ کو رہزنِ الٹیرا اور قوم پر بار ہونے کا فتوٰے دے دیا۔

گو دُنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں۔ اور حسب ارشاد سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نہ خالی رہے گی۔ کیونکہ فرمایا گیا ہے۔ ہر زمانہ میں وہ ساٹھ وجود ہائے مقدس موجود رہتے ہیں۔ اور رہیں گے۔ جنکی طفیل تم پر مینہ برسائے جاتے ہیں جن کی طفیل تم پر سے دبائیں دور کی جاتی ہیں۔ اور جن کی طفیل تم رزق دیئے جاتے ہو۔ مگر بنظرِ ظاہر آج اچھے لوگ تعداد میں اتنے کم ہیں کہ اَلنَّادِرُ کَالمَعدُوم کا مقولہ صادق آتا ہے۔ خداوند عالم جلّشانہٗ مقلب القلوب ہے۔ ہمیں ناامید نہ ہونا چاہئے۔ ممکن ہے کہ وہ زمانہ آجائے کہ خاکستر کی چنگاریوں سے آتش اسلام پھر روشن ہو۔ ہر مسلمان کے نزدیک یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ اہلِ اسلام اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے۔ جب تک احیائے سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ان کا نصب العین نہ ہو۔ ہمیں اپنے ہی بزرگانِ دین اور پیشوایانِ دین متین کی تقلید کرنی چاہیئے۔ اغیار کی تقلید ہمیں کبھی ترقی کے زینہ پر نہیں چڑھا سکتی۔ ہمارے لئے ہمارا دین بس ہے۔ ہمیں اپنی بھولی ہوئی چیزوں کو اپنی ہی مسجدوں اور خانقاہوں میں تلاش کرنا چاہیئے۔ انہی کھنڈروں سے ہم اپنی گذشتہ عظمت کا سبق لے سکتے ہیں۔ اور انہی سے وہ راہ نکلے گی جو ہمیں ساحلِ مراد پر پہنچا دے گی۔ موجودہ زمانہ سے بہتر زمانہ شاید ہی ہمیں روحانیت میں ترقی کا مل سکے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اس پر معودت سے قائم ہو جائیں اور اسی ریت کے ذرّوں سے پھر سونا تلاش کریں۔ جہاں سے اسلامی برکات کا دریا پوری تیزی سے بہ چکا ہے۔ جب تک ہم قرونِ اولیٰ کا اسلام سیکھنے کیلئے متوجہ نہ ہوں گے۔ اور آگے جانیکی بجائے تیرہ چودہ سو سال پیچھے ہٹ کر یہ جاننے کی کوشش نہ کریں گے۔ کہ متقدمین کا طرزِ عمل کیا تھا۔ اپنی دنیا میں کبھی بھی نمود حاصل نہ کر سکیں گے۔ وَ بِاللّٰہِ التوفیق۔





صوفیائے عظام اور سیاسیات

عوام کا یہ نظریہ کہ درویش یا صوفی جو ترک ماسوا کیئے ہوئے بیکرانِ قدس اور بے نیازانِ عالم ہوتے ہیں۔ انکو کب فراغت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی الجھنوں کو نظر اٹھا کر بھی دیکھیں کس قدر بے معنی ہے۔ اگر وہ اسباب دنیا اور اہل دنیا سے متمتع ہوتے ہیں تو نفرت پسند لوگ یوں زبان طعن کھول دیتے ہیں۔ اور اگر جہاں والوں سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ تو جھٹ رہبانیت کے تیروں کا ہدف بنتے ہیں۔ کاش یہ سمجھا جاتا کہ ان سرشارانِ عشق کی مدہوشیاں بھی ہم جیسے بے بصروں کی ہوشیاریوں سے بدرجہا فائق ہوتی ہیں۔ اور ان کو نہ صرف سیاسیات بلکہ جملہ امورِ عالم سے ہر دور اور ہر زمانہ میں تعلق رہا ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ جمیع انبیاء علیہم السلام ظاہری و باطنی علوم کے ماہر رہے ہیں اور ان کی روحانی بلند پروازیوں اور باطنی عظمتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بعثت ہر عہد میں کس مقصدِ عظیم کی تکمیل کیلئے ہوئی اور ان کا تعلق اقوام و ممالک کی اصلاح سے کس قدر رہا۔ مگر غور کیا جائے تو یہی حقیقت عین سیاست نظر آئے گی۔ اور اسی سلسلہ اصلاح میں ان کی چپقلش برابر فرمانروایان وقت اور فراعنۂ اقوام سے ہوتی رہی اور اس تصادم میں وہ اپنی روحانی قوتوں کی بدولت ہمیشہ کامیاب بھی ہوئے اور انہی کا اتباع صوفیائے عظام کے سیاسی اعمال کا پیش لفظ ہوتا ہے۔

سرورِ کائنات فخرِ موجودات خاتم النبیین نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت و رسالت کا سلسلہ بند ہو کر قیامت تک کی اصلاحی خدمات علمائے اسلام و اولیائے کرام و صوفیائے عظام کی تفویض میں دے دی گئیں۔ یہی وہ جماعت ہے جو اصولاً اپنے مرشدین کرام سے ہمیشہ تربیت یافتہ ہوتی رہی ہے۔

جہاں تک ہمارا علم ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام کے بعد یہ سلسلہ حضرت صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ عثمان ذی النورینؓ اور علی المرتضیٰؓ، بلالؓ، ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہم اجمعین سے چلا ہے۔ اور اپنے بعد والوں کو سجادہ نشینی اور خلافت کا منصب عطا کرتا چلا گیا ہے۔ عہد صحابہ اکرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں اصلاح نبوت

کا اثر باقی تھا۔ اس کے بعد زمانہ بدلا اور حرصِ دنیا نے غلبہ پایا۔ تو خود صحابہ اکرام تابعین، تبع تابعین میں سے بزرگ اور عارف جماعت الگ ہوگئی۔ چونکہ عہدِ عثمانی کے فتنہ کے وقت جیسا کہ پیچھے ذکر ہو چکا ہے، بزرگ بالکل سکوت کر گئے اور جوں جوں زمانہ متغیر ہوتا گیا کلیۃً انقطاع کرتے رہے۔ اور ایک عرصہ تک ترکِ دنیا کی تعلیم پر وعظ فرمانا اُن کا شیوہ رہا۔ اس لئے کہ انتہائی دنیا پسندی اور امارت پرستی کے زمانہ میں اسی کی ضرورت تھی جلیل القدر اولیاء اللہ اپنے معتقدین اور متبعین کو دنیا پرستی سے نفرت دلاتے اور خود بھی انتہائی ترک و تجرید کی زندگی بسر فرماتے۔ ان کا صحیح مفہوم یہ تھا کہ جس دنیا کے پیچھے اہلِ دنیا دیوانہ وار دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ حقیقتاً ایک بے اصل شئے ہے۔

حضرت حسن بصری، حبیب عجمی، داؤد طائی، معروف کرخی، سری سقطی اور شبلی و بایزید رحمہم اللہ اسی عقیدے کے تارک الدنیا بزرگ تھے۔

یہ حضرات جب کافی اثر پیدا کر چکے تو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بدلے ہوئے حالات میں بدلی ہوئی دنیا لے کر سامنے آئے۔ علم تصوف مدون کر کے راہ سلوک پیش کی اور عالمانہ رنگ و روپ میں روحانی تعلیم اور اخلاقی درس دینے لگے۔ لوگوں میں باہمی افتراق کے جو جراثیم پیدا ہو رہے تھے ان کو مٹانے کے لئے سلسلۂ پیری مریدی کو وسعت دے کر ان میں یکجہتی اور یک رنگی کی روح پھونکی تاکہ منظم ہو جائیں۔ اور مرکز کی ایک آواز پر حرکت کر سکیں۔

حجاج کے سیلاب ظلم و ستم کو حضرت عبداللہ بن عمر اور حسن بصری رض نے روکا اور بنو اُمیہ آگے بڑھے تو حضرات ابن مسیب اور طاؤس یمنی نے پوری تلخ نوائی کے ساتھ ان کی بے راہ رویوں کو عریاں کیا۔ عہد منصور میں حضرت سیدنا امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ کی بے ریایانہ روش اور حق گوئی آڑے آئی۔ اور عہد ہارون رشید میں حضرات فضیل و سفیان ثوری و شفیق بلخی اس معاملہ میں مصروف کار رہے۔ عہد مامون رشید میں خلق قرآن کا فتنہ آندھی بن کر تمام افق کو ڈھانپنے لگا۔ تو بڑے بڑے علماء بھی جان کے خوف سے اس کے اقرار میں گھر گئے۔ مگر اولیاء کرام نے قدم آگے رکھا اور جمہور عوام کو گمراہی سے بچا لیا۔ خلیفہ متوکل عباسی کے دربار میں حضرت ذوالنون مصری قید ہو کر پہنچتے ہیں۔ تو سوالات کے جوابات میں ایک تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ اور بڑے رعب و داب کا

فرمانروا اتنا متاثر ہوتا ہے کہ رقت طاری ہو جاتی ہے۔ اور تخت سے اُتر کر قدم بوسی کرتا ہے۔ اور بیعت ہو جاتا ہے کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی جہادی روح کا کرشمۂ کمال حضرت ابوالحسن خرقانی کی ہی توجہ تھی اور محمود نے جو خدمات اس سلسلہ میں انجام دیں ان میں آپ ہی کا ہاتھ کارفرما تھا۔ کیا یہ ماننے سے کسی کو عذر ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستان میں آزاد اسلامی حکومت کا قیام حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی سعی مشکور ہی کا مرہون منت ہے گو بظاہر رائے پتھورا کی راجدھانی میں غوری متحرک نظر آتا ہو۔ غریب نواز اجمیری دہلی پہنچتے ہیں۔ تو تمام فضا میں کفر کی بجلیاں کوندرہی تھیں، رفقاء کے ساتھ نمازیں پڑھنی شروع کر دیں۔ کفار نہایت برہم ہوئے لیکن ان مٹھی بھر غیر مسلح نفوس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ ایک مخالف بغل میں چھری لیکر قتل کو سامنے آتا ہے اور لرز کر منہ کے بل گر جاتا ہے اور معافی مانگنے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء اور اُن کے جانشینوں اولیاء اکرام سے کفار کے جو مقابلے ہوئے ان میں ہاتھ سے کہیں زیادہ ان کی روحانیت کارفرمائی کرتی تھی۔ اجمیر تشریف لے گئے، تنہا ایک درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ وہاں سرکاری شترخانہ تھا۔ ملازمین نے کہا۔ یہاں سے اٹھ جاؤ۔ یہاں سرکاری اونٹ بیٹھیں گے۔ آپ یہ کہہ کر اُٹھے اور اناساگر پر چلے گئے۔ کہ لو اونٹ بیٹھے رہیں۔ پھر کیا تھا۔ اونٹ ایسے بیٹھے کہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیا آخر ملازمین نے معافی مانگی تو اونٹوں کو زمین نے چھوڑا۔ راجہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ یہ لوگ ہمارے ملک میں کیوں آئے ہیں۔ پکڑ کر نکال دو۔ مگر یہاں گرفتاری سے پولیس خود لرزہ براندام تھی۔ روحانیت نے پولیس والوں کو خود حواس باختہ بنا دیا۔ اور افسر پولیس خود مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ راجہ نے سنا تو گھبرا کر جادوگروں کو بلوایا۔ جو سحر کی آگ جلاتے چکر چلاتے اور شیر و سانپ بناتے۔ مقابلہ کو چلے آئے۔ زمین ہل رہی تھی اور عوام میں ان کے کمال کے چرچے ہو رہے تھے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ روحانیت کیا ہے اور ان جادوگروں کا کیا حشر ہو گا۔ ادھر سے ایک مٹھی خاک پھینکنے کی دیر تھی کہ میدان صاف ہو گیا۔ اور سب سے بڑے جادوگر نے اسلام قبول کر لیا۔ کفار ہر سمت سے مسلمانوں کو تنگ کرنے پر اُتر آئے اور اپنی ظاہری طاقت کا مظاہرہ کرنے لگے۔ جس کے جواب میں غریب نواز اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے متوجہ ہو کر فرمایا کہ

"اگر ازیں تشدد بازنمی آئی۔ من ترا زندہ بہ لشکر اسلام سپردم"

ادھر غوری کو خواب میں ارشاد فرمایا کہ فوراً ہندوستان پر حملہ کر دو۔ اللہ تعالیٰ مظفر و کامیاب فرمائے گا۔ اس کا چرچا ہوا۔ تو پرتھوی راج نے بھی سنا اور ہنسا کہ غوری پہلے کیا کر چکا ہے، جو اب کرے گا۔ کیونکہ واقعی اس کی قوت بے پناہ تھی

مگر آخر کار وہی ہُوا، جو غریب نوازؒ نے فرمایا تھا۔ کہ پرتھوی راج زندہ گرفتار ہو کر مارا گیا۔ اور سلطان غوری فتح کے بعد حاضر دربار ہُوا اور قدمبوسی کی۔ اور ایک اپنا جانشین معین کر کے واپس لوٹ گیا۔ یہ کتنا بڑا انقلاب تھا اور اس کے اثرات کتنے ہمہ گیر ہوئے کہ ہر فرمانروا عقیدت کی آنکھیں بچھاتا اور سلطنت ہند کو غریب نواز اجمیریؒ کی عطا سمجھتا رہا ہے۔ یہی وہ انقلاب ہے جسکی بدولت ہندوستان میں مسلمان موجود ہیں۔ اسی انقلاب کی برکت تھی کہ اس کے فوراً بعد آپ نے ایک عظیم الشان خانقاہ مبلّغین اسلام تیار کرنے کے لئے تعمیر کرائی۔ مسجد اور لنگر خانہ بھی بنا کر تمام فقرا و طلبا کے قیام و طعام کا کامل انتظام فرما دیا۔ اور جس کے اخراجات کے خود حضور ہی کفیل رہے۔

آپکی خانقاہ معلّٰی سے بکثرت اولیاء اللہ بن کر نکلے۔ جن کو آپ نے کفرستان ہند کے اہم گوشوں میں مامور فرمایا۔ خواجہ قطب الاقطاب کو دارالسلطنت دہلی میں مامور کیا۔ جو براہِ راست فرمانروایان سیاست پر اثر ڈالتے رہے۔ اور اس کو دوسرا اہم مرکز بنا دیا۔ دور دراز سے فقراء آ آ کر جمع ہوئے اور خانقاہ دہلی نے ایک عالمگیر اہمیت حاصل کر لی۔ حضرت قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور اللہ کا بندہ کفرستان راجوڑ میں مامور کر دیا۔ جن کی سعی جمیلہ سے ایک غیر معروف قصبہ جس کے باشندے کفر و ضلالت میں پھنسے ہوئے تھے اور جس میں ایک بڑا جادوگر بھی رہتا تھا۔ مع اپنے جادوگروں اور چیلے چانٹوں کے ایسا پاک ہوگیا۔ کہ راجوڑ میں سحر و ساحری ایک معدوم شئے نظر آنے لگی۔ یہ تھیں اللہ کے بندوں کی خدمات دین اور جوش عمل کہ بے فوج و اسلحہ ملکوں کے ملک اور علاقوں کے علاقے فتح کرتے چلے جاتے تھے۔ انہیں نہ روپے کی ضرورت تھی نہ فوج کی نہ تکلّف غذا اور نہ ضرورتِ بستر کی۔ زمین بچھونا، درختوں کے سائے چھت اور پھول پتے غذا تھے۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر پاکپٹنی نے عرصہ تک جنگلی پھول پتوں پر گذر کی۔ اس کے بعد مسجد اور لنگر خانے بھی تیار ہو گئے۔ ہزاروں اولیاء اللہ تیار کر کے اِدھر اُدھر ملک میں بھیج دیئے۔ جن کی خدمات کی روشنی دکن تک پھیل گئی۔ کفرزار دیوگری میں بحکم شیخ خواجہ منتخب الدین چشتی کو مامور فرمایا۔ جنہوں نے نورِ اسلام کی روشنی سے پورا علاقہ منوّر کر دیا۔ مزاج میں جلالیت تھی۔ جدھر کو منہ کیا۔ بیسیوں میل کا سفر کر کے کسی مقام پر پہنچ جاتے اور تبلیغ فرماتے۔ جس نے انکار کیا۔ نگاہ غضب آلود سے دیکھا اور سر سے پاؤں تک پتھر کر دیا۔ سلطان بلبن کو آپ ہی کے بدولت تخت سلطنت نصیب ہُوا۔ اور سلطان التمش آپ ہی کا پیر بھائی تھا۔ سلطان بلبن نے اپنی صاحبزادی آپ کے عقد میں دے دی۔ پوری سیاست ہند کی مشینری آپ کے ہاتھ میں تھی۔ شاہانِ ہند مرید تھے اور فرمانبردار

اشاروں پر متحرک ہوتے تھے۔

کلیر شریف میں حضرت علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کو مامور فرمایا۔ جہاں مسلمان بڑی گمراہی میں پڑ چکے تھے طبیعت میں جلال آ گیا اور پورے کا پورا شہر کھنڈر کر کے رکھ دیا۔

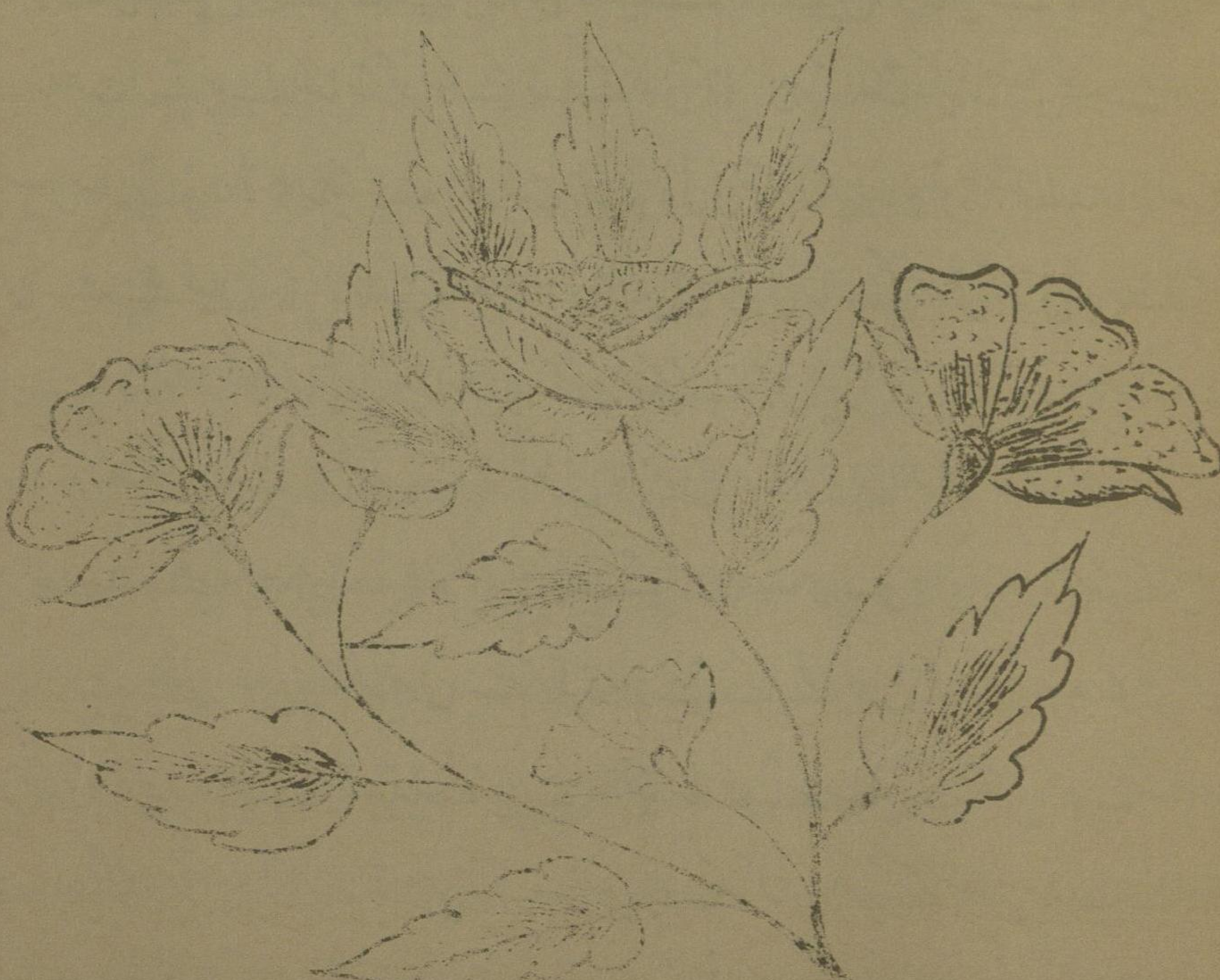
حضرت سلطان المشائخ کو دہلی مقیم فرمایا۔ جنہوں نے دہلی کو اسلام کا گہوارہ بنا دیا۔ حالت یہ تھی کہ ایک کونے میں اقامت فرماتے ہوئے بھی دارالسلطنت کی سیاسیات پر اس طرح اثر انداز تھے کہ پورا ہندوستان آپ سے متاثر ہو رہا تھا۔ اور علاؤالدین خلجی جیسا پُر شکوہ فرماں روا غلام بنا ہوا تھا۔ اور اس کے اراکین سلطنت قلبی ارادتمند تھے عظیم الشان مسجد، عظیم الشان مدرسہ، عظیم الشان لنگر خانہ آپ کی بلندی و اولو العزمی کے ظاہری شواہد موجود تھے۔ دریائے فیض باطنی یوں اُمنڈ رہا تھا کہ دہلی کی پنہاریاں بھی قرآن و حدیث کے تذکار میں غرق تھیں۔ چار آدمی بھی کہیں جمع ہو جاتے، تو تقویٰ و طہارت ہی کا ذکر کرتے۔ دکن کی بادشاہت اسی آستانہ کی عطیہ لونڈی تھی۔ جسے چاہا تخت نشین فرما دیا۔ جسکو چاہا محروم بنا دیا۔ علاؤالدین غلام بن کر سربلند رہا۔ اور تغلق و مبارک شاہ سرکش ہو کر ہمیشہ کیلئے ٹھنڈے ہو گئے تاتاریوں نے محاصرہ کر کے ہمیشہ کی نامرادی خریدی اور خوف زدہ ہو کر ایسے بھاگے کہ پھر رُخ کرنے کی جرأت نہ ہوئی آپ نے شیخ وجیہ الدین یوسف کو چندیری میں تبلیغ دین کے لئے مامور فرمایا اور شیخ برہان الدین کو دیوگری بھیجا۔ جن کی تبلیغی سعی کے نتائج اظہر من الشمس ہوئے۔ آپ ہی کے خلفاء سے شیخ اخی سراج الدین بھی ہیں جن کی خدمات دینی نے بدایوں کو بقعۂ نور بنا دیا۔ ان حضرات کی خدمات سے ایک علاقہ جو خالی رہا۔ وہ بنگال تھا۔ جہاں کفر و شرک کی تاریکیاں پوری طرح چھائی ہوئی تھیں۔ جن کے چھٹنے کا کوئی امکان ہی نظر نہ آتا تھا۔ لیکن جتنے بلند تودے ہوں اتنی ہی زیادہ طاقت کی مشینری کام کرتی ہے۔ چنانچہ اس کفر زار کے تودوں کو ہموار کرنے کے لئے حضرت جلال الدین تبریزی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ بنگال میں داخل ہوتے ہیں۔ جنہوں نے سلطنت چھوڑ کر درویشی اختیار کی تھی۔ تمام دنیا کے معاملات میں دخل تھا۔ بڑے بلند پایہ بزرگ تھے۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بغداد، دہلی، ملتان، اجمیر ہوتے ہوئے بدایوں تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے بنگال کے مرکزی شہر پنڈوہ پہنچے۔ پنڈوہ کفر کی گھٹا ٹوپ اندھیری میں گھرا ہوا تھا۔ ہر طرف ناقوس کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ خدائے واحد و قہار کی بجائے کالی دیوی کی پوجا ہوتی تھی۔ سحر بنگال زوروں پر تھا۔ جادو اور جادوگروں کی حکومت تھی۔ لیکن یہ شان عاشقانِ اسلام اور غلامانِ رسول انام کے سوا کہیں بھی نظر نہ

آئے گی کہ ایک مردِ خدا تن تنہا کفر کے سینہ میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی آواز بلند کرتا ہے۔ ہندو کا سب سے بڑا مندر مع اپنے بتوں کے آپ کی ایک نگاہِ پاک سے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں میں شور ہوتا ہے۔ کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ جادوگری ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اور پجاری اسلام لے آتے ہیں۔ علاقے کی مخلوق درشنوں کے لئے ٹوٹ پڑتی ہے۔ اسلام پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ ان ہی پجاریوں کے ہاتھوں جو اسلام لا چکے ہیں مندر اور بت خانہ کے کھنڈروں پر مسجد تعمیر کرائی جاتی ہے۔ خانقاہ اور لنگر خانے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ اور لاکھوں ہندو خدائے قدوس کے پرستار دکھائی دیتے ہیں۔ اور یہی وہ جگہ ہے۔ جسکو آپ کے بعد حضرات اخی سراج الحقؒ اور قطب عالمؒ رونق بخشتے ہیں۔ غرضیکہ جہاں دیکھئے ہندوستان کا چپہ چپہ انہی صوفیاء اکرام کی تنویر سے منور نظر آئے گا۔ اور ارضِ ہند کا کوئی مسلم فرماں روا شاید ہی ایسا ہو جو بہادر شاہ تک کسی نہ کسی بزرگ سے ارادت نہ رکھتا ہو۔ تمام پٹھان، تمام مغل اور بہمنی فرمانروا انہیں بندگانِ خدا کے غلام اور ارادتمند رہے ہیں۔ قطب الدین التمش، بہلول، سکندر، بلبن، علاؤ الدین شیر شاہ، اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب وغیرہم کسی نہ کسی بزرگ کے حلقۂ مریدی میں داخل تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے۔ کہ ان حضرات کی ارادت وتربیت نے التمش ناصر الدین اور شاہ اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کو صاحبِ معرفت بادشاہ بنا دیا تھا۔

یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ کہ بڑی بڑی ملکی فتوحات میں انہی حضرات کا ہاتھ کام کرتا تھا۔ اجمیر و سومنات کی فتوحات انہی کے تصرفات کا کرشمہ تھیں۔ اور سلطان نور الدین اور صلاح الدین کا عرفانی عروج انہیں کی صحیح اسلامی تعلیمات کا نتیجہ تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس شکوہ وطنطنہ کے شہنشاہ جب حلقۂ ارادت میں منسلک ہوں تو ان کی لیاقت حقیقت میں ان کی سیاست ہی کی ترجمان ہوگی۔ اور بالفاظ دیگر یہ کہنے والا حق بجانب ہوگا کہ ملکی سیاسیات میں ہمیشہ ان بزرگوں کا اثر رہا ہے۔ ہندوستان میں کسی فرماں روا کی جانب سے اشاعتِ اسلام کی کوئی سعی نہیں کی گئی۔ اور اگر کی گئی ہے تو انہی حضرات کے نقشِ قدم کی اتباع میں کی گئی ہے۔ اور آج اس ملک میں جتنے مسلمان نظر آرہے ہیں۔ وہ انہی صوفیائے عظام اور اولیائے اکرام کی سعی مشکور کا نتیجہ ہیں۔

اس وقت جبکہ تاتاری سیلاب اسلامی دنیا کے بہت بڑے حصہ میں مصروف غارتگری تھا۔ اور اپنی رَو میں اسے بہائے لئے جا رہا تھا مسلمان خوف زدہ تھے کہ کب تبدیلی مذہب کا حکم صادر ہوتا ہے۔ پھر کیا تھا۔ یہی صوفیائے اکرام تھے جنہوں

نے تاتاری وحشیوں کو روشناس اسلام کرا کے حلقہ بگوش اسلام بنا دیا۔ یہ مقدس حضرات جہاں پہنچے کفار کو اسلام بتاتے اور مسلمانوں کا انتشار مٹاتے رہے۔ پیری مریدی کے سلسلہ کو آج کچھ کہہ لیا جائے اور کچھ سمجھ لیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اتحاد و وحدتِ اسلامی کے احیاء، و ارتقاء کی یہ ایک بہترین صورت تھی کہ ایک بلند مرتبہ پیر کے ہزاروں مرید دست ارادت بڑھاتے ہی، خواہ ان میں رنگ و نسل اور امارت و غربت کے کتنے ہی امتیازات ہوں باہم بھائی بھائی ہو جاتے ہیں ان کے نزدیک مخلوق پروری و مخلوق نوازی بہترین اتقاء، اور بہترین دینداری تھی۔ تعصب و دلآزاری حرام اور نیکی و سلوک ایک قابلِ عمل عبادت تھے۔ کسی انسان کی دلجوئی اور حاجت روائی ان کے نزدیک حج بیت اللہ کے ثواب کے مرادف تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان فرمانرواؤں نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ انتہائی رواداری و نرمی کا سلوک روا رکھا اور عفو و درگذر سے کام لیا۔ کاش کہ مسلمان غور کریں کہ ہمارے بزرگوں نے کس اسلام کے ماتحت ایک پوری کائنات کو موردِ کرم بنایا تھا:



اقتباسات

(آر۔ اے۔ نکلسن)

کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہُوا۔ جب مس انڈرہل کی کتاب تصوف میرے زیرِ مطالعہ تھی۔ تو میری نظر سے دو اقتباس گزرے۔ جن میں سے ایک تو قرونِ وسطیٰ کے ایک جرمن صوفی کی کتاب سے لیا گیا تھا۔ اور دوسرا ایک انگریزی مصنف کی تصنیف ہے (اس انگریز کی موت حال ہی میں واقع ہوئی ہے) تو اس وقت مجھے خیال ہُوا کہ ان اقتباسات سے ملتے جُلتے مُسلم صوفیاء کے اقوال بھی مجھے یاد ہیں۔ ان سب کو عوام کے فائدہ کے لئے یکجا ترتیب دے دینا چاہئے۔ "الیکرٹ" کے مشہور قول (کہ لفظ "انا" یا "کل" کسی مخلوق کے شایان شان نہیں۔ بلکہ خالص خدا کے ساتھ مختص ہے۔ کیونکہ مخلوق کی شان اسی میں ہے کہ وہ "جزو" ہونے کی تصدیق کرے) نے مجھے یاد دلایا کہ اب سے ساڑھے تین سو سال پہلے بغداد میں ابونصر سراج نے مسئلہ توحید کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ "سوائے خدا کے کوئی "انا" نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ حقیقی شخصیت صرف خدا ہی کا حصّہ ہے"۔ اسی مسئلہ پر "ایڈورڈ کارپنٹر" نے اس طرح رائے زنی کی تھی۔ کہ "یہ نظریہ تمام شعورات اور مدرکات کا مل معلوم ہوتا ہے"۔ اس سے مجھے خیال آیا۔ کہ مصری شاعر اور ولی اللہ ابن فرید کی کتاب کی ورق گردانی کی جائے۔ جس میں اس نے لکھا ہے "میرے متصوفانہ شعور کو ایک ایسا مشاہدہ کہا جا سکتا ہے۔ جس میں کل ادراکات و احساسات ایک ساتھ شامل ہوں۔ اور جو ایک ہی وقت میں ایک ساتھ مشغولِ کار ہوں"۔ "میری آنکھ محوِ تکلم تھی اور میری زبان مشغول دید۔ میرے کان دیکھ رہے تھے۔ اور میرے ہاتھ سُن رہے تھے۔ اور جب میرے کان ہر مرئی چیز کے حق میں آنکھ کا کام سرانجام دے رہے تھے، تو میری آنکھ نغموں سے محظوظ ہونے کے لئے کان کا کام دے رہی تھی" خیالات کا یہ توارد۔ شاہد و مشہود کا درجہ رکھتا ہے۔ متصوفیانہ نفسیات اور قیاسات کے مسائل کے متعلق مغرب اسلام سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ اور اگرچہ ہم تفصیل کے ساتھ ابھی تک یہ نہیں بتلا سکے کہ ان امور کے متعلق مغرب نے ازمنہ وسطیٰ میں اسلام سے کیا سیکھا۔ جبکہ اسلامی علوم و فلسفہ کا آفتابِ عالمتاب افقِ اسپین سے طلوع ہو کر تمام عیسائی ممالک

یورپ پر نور افشانی کر رہا تھا۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ سرچشمۂ اسلام سے ہر کہ ومہ کو حصۂ وافر ملا۔ یہ امر بعید از قیاس نہیں ہے کہ پس اکیوتاکس، ایکرٹ اور دانتے جیسے اشخاص کو اسی تصوف کے سرچشمۂ فیض سے فائدہ پہنچا ہو۔ کیونکہ تصوف ہی ایک ایسا مشترک مقام ہے۔ جہاں ازمنۂ وسطےٰ کا عیسائی مذہب اور اسلام آپس میں مس کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اور یہ واقعہ درحقیقت تواریخی شواہد پر بھی مبنی ہے۔ جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ کیوں رومن کیتھولک اور اسلام کے صوفیائے کرام کے خیالات۔ طریقہ ہائے کار اور نظام ایک ہی قسم کی روحانی اختراعی قابلیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ لیکن جب کہ کیتھولک مذہب نے اپنی روایات کو برقرار رکھا۔ اسلام میں تیرھویں صدی کے بعد کے خیالات کے دھارے نے ایک نئے مذہبی فلسفہ کی صورت اختیار کر لی۔ جو کٹر قسم کے تنگ خیال مسلمانوں کے نزدیک کفریات سے تعبیر کیا جانے لگا۔

دوسری صدی ہجری کے خاتمہ پر عراق عرب میں سب سے پہلے لفظ "صوفی" سے ہم روشناس ہوتے ہیں۔ اور جس سے بعد میں مُسلم صوفیاء مشہور ہوئے۔ یہ لفظ مشتق ہے "صُوف" سے جس سے مراد رنگی ہوئی اُون کی وہ موٹی پوشاک ہے۔ جو کہ عیسائی زاہد پہنا کرتے تھے۔ اور یہ امر اس حقیقت پر دال ہے کہ ازمنۂ وسطےٰ کے عیسائی اور مسلمان صوفیائے کا زاویہ نگاہ ایک ہی تھا۔ اور ان کے خیالات کی بنیاد بھی ایک ہی تھی۔ اس موقعہ پر مشرب صوفیاء کی ابتدا کے مشکل سوال پر بحث نہیں کی جاسکتی۔ مسلم صوفیاء کا یہ دعوےٰ کہ ان کے عقائد خود رسول اکرم صلعم سے ارث کے طور پر انہیں ملے۔ ہر طرح قابل اعتناء ہے۔ قرآن پاک میں رسول کریمؐ کی ذات گرامی کے متعلق جو ریکارڈ ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں زاہدانہ اور متصوفانہ عناصر کے ساتھ ایک اور قسم کا شخص بھی پایا جاتا ہے۔ مگر صوفیائے کرام نے اوّل الذکر عناصر کو موخرُ الذکر شخص کی نسبت کہیں زیادہ شوخ رنگ میں پیش کیا ہے۔ اور اُسے اس سے کہیں زیادہ اہمیت دی ہے۔ جتنی کہ خود رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نہیں دینا چاہتے تھے لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ صوفیاء کا مذہب قرآنِ کریم کا مرہونِ منّت نہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک جو کہ قرآن پاک کو ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھتے اور ایام طفلی میں اسے ازبر کر ڈالتے اور اس قدر ذوق و شوق کے ساتھ اس کا مطالعہ صرف اس لیئے کرتے ہیں۔ کہ ان کے نزدیک کل علوم انسانی کا منبع اور سرچشمہ صرف یہی ایک کتاب مقدس ہے۔ اس قسم کا خیال مضحکہ انگیز اور حماقت آمیز ہے۔ بلکہ تاریخی نقطہ نگاہ سے بھی یہ حقیقت سے بہت بعید

ہے۔ اور اگرچہ رسول پاکؐ نے صوفیاء کے مذہب کے متعلق کوئی اصلی نظام اپنے پیچھے نہیں چھوڑا۔ مگر تاہم قرآن پاک میں کئی آیات موجود ہیں۔ جن پر ان کے عقائد کا دارو مدار ہے۔ ذاتِ باری کے متعلق رسولِ خدا کے ارشادات میں تواتر و توالی نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ وہ غور و خوض کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ کیفیاتِ قلبی کا مظہر ہیں اور اگرچہ علمائے کرام کے مذاہب میں باری تعالیٰ کی لامحدودیت اور ماورائیت کو پورا پورا دخل حاصل ہے۔ صوفیائے کرام نے رسولِ خدا کی پیروی کرتے ہوئے ماورائیت اور لامحدودیت کے ساتھ ساتھ اس کے محیطِ کُل ہونے کی جُزی بھی لگا دی ہے۔ مگر قرآنِ کریم اس عقیدہ پر اتنا زور نہیں دیتا۔ جتنا انہیں خود مقصود ہے۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالْبَاطِنُ وَالظَّاهِرُ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ وغیرہ۔ یقیناً ان آیات بنیات میں تصوّف کی روح موجود ہے۔ عہد سلف کے صوفیائے کرام کے نزدیک قرآنِ کریم محض خدا کا کلام ہی نہیں بلکہ اس تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ بھی ہے خلوص دل کے ساتھ اس کی یاد میں محو رہنے، قرآن پاک کے متن پر غور و خوض کرنے اور خاص کر "اسرٰی" اور "معراج" سے متعلق آیات پر فکر کرنے کے بعد انہوں نے رسولِ خدا کے متصوفانہ مشاہدات کو اپنے اندر متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ذرا وقت اور مقام کے مقتضیات ملاحظہ ہوں۔ جس سیاسی انقلاب نے دارالخلافہ کو دمشق سے بغداد میں منتقل کرایا۔ اسی نے اسلام کو قدیم تہذیب کے خیالات کے ساتھ روشناسی اور آویزش کا موقعہ بھی دیا۔ اگرچہ بالآخر یہ خیالات کالعدم ہو گئے۔ تاریخ اس بات پر شاہد عادل ہے کہ ان آویزشوں میں فتح کامل کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ ہم ایک ایسی سرزمین میں ایک عالمگیر تحریک کا ذکر کر رہے ہیں۔ جہاں یونانیت کا دور دورہ تھا۔ اور جہاں مذہبی مباحث اگر ایک طرف مسلمانوں میں زوروں پر تھے۔ تو دوسری طرف عیسائیوں اور منوچہریوں اور زرتشت کے پیروؤں میں بھی ان کا چرچا تھا۔ اور جہاں محکوم اقوام کے افراد جنہوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا۔ اور جو اس نئے مذہب کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی فکر میں رہتے تھے۔ بعض اوقات نہایت نیکدلی کے ساتھ اپنے مخصوص عقائد اور رسومات کے جواز میں جو انہیں خاص طور پر مطبوع تھے۔ رسول اللہ کے اقوال اور اسوہ کو دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے۔ یہ کہنا تو درست ہے کہ صوفیاء قرآن پاک سے از خود اخذ کردہ معانی و مطالب اپنے ہی حلقۂ اثر کے رہنے والے احباب تک محدود رکھتے تھے۔ مگر یہ کہنا درست نہیں۔ کہ

ان کے عقائد قرآنِ پاک کے صحیح مطالعہ کا نتیجہ نہ تھے۔ ہزار صدی عیسوی کے بعد اسلامی تصوّف نے اپنے اندر یونانی فلسفہ کو جذب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس امر کے شواہد موجود ہیں۔ اور اس ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں اس پر عیسائیت کے زُہد اور یونانیوں کے تصوف کا بہت بھاری اثر پایا جاتا تھا۔ ہمیں اس امر کا بھی یقین ہے کہ لفظ "راہب" نے جس سے رسولِ اکرمؐ بخوبی واقف تھے۔ آپ کے پیروؤں کے لئے زندگی کا نمونہ پیش کیا۔ آپ سے منسوب مشہور الفاظ "لا رھبانیۃ فی الاسلام" دراصل عیسائی نظریہ کے خلاف بعد میں احتجاج کے طور پر استعمال کئے گئے۔ اور یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ عیسائیت کے اس نظریہ کو کس قدر فروغ و اثر حاصل ہو چکا تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ رسولِ خدا نے قرآن میں رہبانیت کو جس میں تجرّد بھی شامل ہے۔ بُرے الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔ لیکن سورہ الانشراح کی تفسیر جو تیسری صدی ہجری تک جاری و ساری رہی۔ حضورؐ نے اسے ایک ایسا ادارہ قرار دیا ہے جو مشیت ایزدی کے عین مطابق تھا۔ اور اس کی زجر و توبیخ اسوقت ضروری قرار دی جب کہ لوگوں نے اپنے نازیبا افعال سے اُسے بدنام کر دیا۔

اسلام کے ابتدائی زُہد نے جو کہ آنے والے عذاب کے خوفناک تخیلات۔ محسوسات، عبادات اور مغفرت کیلئے غیر مختتم دعاؤں پر مشتمل تھا۔ تصوّف کے لئے میدان تیار کر دیا۔ چونکہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا اقرار، اور جنت میں انعام پانے اور دوزخ کے عذاب سے بچنے کے خیال سے عبادت کرنے کا خیال ہمیں خوف و رجا کے سلسلہ سے مربوط کر دیتا ہے۔ اس لئے ایک زاہد اپنے آپ کو ایک اللہ پر توکل کرنے اور اس کی رضا جوئی پر مجبور پاتا ہے۔ لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ جوں جوں ہم خوف و رجا کے خیال سے مستغنی ہوتے جائیں گے۔ توں توں خدا کے ساتھ ہماری محویت بڑھتی جائے گی۔ یا صوفیاء کی زبان میں یوں کہیئے کہ محبت کے وسیلہ سے ہم اس سے قرب حاصل کر سکیں گے۔ یہی ایک عقیدہ ہے جو تصوف کی روحِ رواں ہے۔ جیسا کہ رابعہ بصریؒ جنہیں ہم اپنی دعاوی کے جواز میں نمایاں طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ ایک کنیز تھیں اور ان کا حسب نسب ہمیں معلوم نہیں۔ کہتی ہیں کہ متصوفین کا پیش کردہ وصل باللہ نصِ قرآنی سے پوری طرح ثابت نہیں۔ لیکن صحیح احادیث کی رو سے قطعیت کے ساتھ مسلّم ہے۔ خدا نے کہا "میرا بندہ اپنی مرضی سے نیکی کرنے میں اقدام کر کے میرے نزدیک ہوتا جاتا ہے۔ اور میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں۔ کہ وہ

میرے کانوں سے سننے لگ جاتا ہے۔ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں کہ وہ میری آنکھ سے دیکھتا ہے۔ میں اس کی زبان بن جاتا ہوں کہ وہ میری زبان سے گویا ہوتا ہے۔ میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ میرے ہاتھ سے پکڑتا ہے" ریاضیات کی مدد سے جن میں اوراد اور وظائف بھی شامل ہیں۔ ایک نفسانی طریقہ کے ماتحت روح کو اس طرح رجوع اور مائل کر لیا جاتا ہے کہ صوفی کے قلب صافی پر لقائے ربانی کے معارف از خود منکشف ہونے لگ جاتے ہیں۔

سب سے پہلا مسلمان جس نے ایک صوفیٔ صافی کی قلبی کیفیات کا تجزیہ کیا بصرہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے ایک رسالہ لکھا۔ جس کا ایک بے نظیر قلمی نسخہ جو کہ قابل مصنّف کی نزہت خیال اور اختراعی قابلیت کا نمونہ ہے۔ اس وقت بھی آکسفورڈ میں موجود ہے۔ اگرچہ اس میں مصنّف موصوف نے وضاحت مقصد کے لئے یہودیوں اور عیسائیوں کے اقوال پیش کئے ہیں۔ تاہم بعد کے مصنّفین اور صوفیاء نے صوفیوں کے طریقہ (مسلک) کے متعلق لکھا ہے کہ یہ مقامات و احوال پر مشتمل ہے۔ جس کی پہلی منزل انابت و انفعال کی ہے۔ اس کے بعد ترکِ دنیا، غربت، صبر، توکل کی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں۔ ہر ایک منزل اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے زینہ کا کام دیتی ہے۔ تفصیلات مختلف ہیں۔ لیکن عام طور پر سب کے خصائص ایک ہی ہیں۔ مرید افعال بدنی پر کیفیات قلبی کو ترجیح دینا سیکھتا ہے نیت کو فعل پر فوقیت دیتا ہے۔ اور کسی وقت بھی جب کہ وہ کسی مذہبی قانون کی پابندی کر رہا ہو ظاہری فعل کو اندرونی سچائی کا مظہر اور آئینہ خیال کرتا ہے۔ یہ اصول اپنے قلندرانہ انداز کے باوجود "مسلم شریعت پسندی" میں سمو گئے ہیں۔ اور انہی اصول پر اخلاق کا مدار ہے۔ جیسے ماہر دینیات "الغزالی" نے پیش کیا تھا۔ اور جسے ماہر اخلاقیات سعدیؒ نے با وضاحت بیان فرمایا۔ اگرچہ صوفیاء پر خود پسندی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ بعض اوقات انہوں نے اپنے پڑوسیوں کو اور خاص کر وہ پڑوسی (جو اُن کے اپنے بھائی بند نہ تھے) پس پشت ڈال کر خدا سے محبت کا ادعا کیا۔ لیکن آخر کار "وحدت وجود" کے مسئلہ نے ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ وہ بنی نوع انسان سے محبت کئے بغیر خدا کے ساتھ محبت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

تصوف کے ایک مکمل نظری اور عملی ضابطہ کی بنیاد تیسری صدی ہجری کے صوفیاء نے رکھی۔ مصری متصوف ذوالنون نے حالتِ وجد میں روحانی اور باطنی علم کے القاء کے خیال کو اسلام میں جاری کیا۔ جو کہ دوسرے روائتی اور عقلی علم سے بالکل مختلف ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا۔ کہ اُس نے خدا کو کیسے جانا تو اس نے جواب دیا۔ کہ خود خدا کے

توسل سے۔ عین اسی طرح جس طرح کہ ڈائی نوسس (ایک یونانی بادشاہ) نے کہا تھا۔ کہ خدا ہر اس چیز کے برعکس ہے جس کا تخیل قائم کیا جاسکے۔ اور جوں جوں معرفت خدا ہم میں ترقی پکڑتی جاتی ہے۔ توں توں ہم اس میں جذب ہوتے جاتے اور محو ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ عقائد کے سلسلہ میں جو کہ چند مخصوص اصحاب کے لئے مختص کر دیئے گئے تھے۔ اصطلاحات اور کنایات کا رواج عام کر دیا گیا۔ کیونکہ یہ محسوس کیا جا رہا تھا۔ کہ تصوف کے رازہائے سربستہ عام لوگوں تک نہیں پہنچنے چاہئیں۔ بایزید بسطامیؒ نے ہندوستان کے مسئلہ وحدت وجود کے ماتحت مسئلۂ فنا کو تکمیل تک پہنچایا۔ اور بعد میں اس کے ضروری جزو مسئلہ بقا، کو اس کے ساتھ اضافہ کیا۔ اگرچہ تنقیضی عمل کے ذریعۂ وحدت کُلّی تک پہنچنے کیلئے اس کی تمام کوششیں اس کے اپنے اقرار کے مطابق خواب وخیال ثابت ہوئیں۔ پھر بھی بسطامیؒ نے آنے والے صوفیاء میں ایک روائتی "ہیرو" کی حیثیت حاصل کر لی۔ جو اس کے وجدانیات سبحانی اور تخت خداوندی پر بیٹھنے کے واقعہ کو جو کہ نیند کی حالت میں پیش آیا۔ بیان کرنے سے کبھی نہیں تھکتے۔ اس کے اقوال میں سے مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں مخلوق کو احوال میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن علم باطن کے جاننے والے کے لئے کسی احوال میں سے گزرنے کی ضرورت نہیں اس کا وجود ایک دوسرے کے وجود کے باعث بیکار ہو جاتا ہے۔ اور اس کے آثار ایک دوسرے کے آثار میں گم ہو جاتے ہیں۔ تیس سال تک لامحدود خدا میرا آئینہ بنا رہا۔ مگر اب میں خود اپنا مظہر اور آئینہ ہوں۔ جو کچھ میں پہلے تھا۔ اب نہیں ہوں۔ کیونکہ میں اور خدا میں فرق جاننا وحدت خدا کا منکر ہونا ہے۔ کیونکہ میں اب کچھ نہیں ہوں۔ اس لئے لامحدود خدا خود اپنا مظہر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں خود اپنا مظہر ہوں۔ کیونکہ خدا نے میری زبان سے کلام کیا اور میری ہستی کالعدم ہو گئی۔

میں بایزید کی ہستی میں سے اس طرح برآمد ہوا ہوں۔ جس طرح ایک سانپ اپنی کینچلی کو پھاڑ کر نکلتا ہے۔ تب میں نے غور کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ شاہد و مشہود اور محبت سب ایک ہیں۔ کیونکہ وحدت وجود کی دنیا میں سب اسی ایک میں مدغم ہیں۔ جب کہ ہوشیاری پرستی کو ترجیح دینے والے صوفیاء بایزید کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اس کے مخالفین جنید بغدادی کے مقلدین ہیں۔ جس کے نظریہ وحدت وجود کو اس کے شاگرد حلاج نے صحیح ترین حقیقت نگاہی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہمیں کوئی حیرانی نہیں ہوتی جب ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت حلاج کو کفریات بکنے کے جرم میں گرفتار کر کے قید کیا گیا۔ تو جنید نے نہایت دُور اندیشی کے ساتھ کام لیتے ہوئے کہا کہ میرا اس کے ساتھ کوئی

تعلق نہیں۔ اگر انا الحق کے انتہائی برانگیختہ کرنے والے عقیدہ کو نظر انداز بھی کر دیا جائے۔ تو بھی وہ عقائد جن کا ذکر حلاج نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ مسلمانوں کو لرزہ براندام کر دینے کیلئے کافی ہیں۔ لیکن اس کے عقائد اس قدر انوکھے۔ عمیق اور مورخانہ حیثیت سے اس قدر اہم ہیں۔ کہ اس کے نمایاں خیالات کا خاکہ کھینچنا اور اس سے متعلق مسائل کی طرف توجہ مبذول کرانا از بس ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اور پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر میگنان نے بڑے عمیق مطالعہ کے بعد حلاج کے پراگندہ اقوال کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیں اس کے کل عقائد کا پتہ چلتا ہے۔

حلاج کے عقیدہ کے مطابق خدا کا جوہر اصلی محبت ہے۔ اور اس نے انسان کو اپنے ہی نقش پر پیدا کیا۔ اور اس کی تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ اس کا بندہ صرف ایک اسی کے ساتھ محبت کرے۔ اس کا روحانی ارتقاء اس کی ماہیت کو تبدیل کر دے۔ وہ اپنے اندر خدا کا مشاہدہ کرے۔ اور اپنے آپ کو مشیت ایزدی میں فنا کر دے۔ ظاہر ہے کہ وحدت باری جس کا ذکر حلاج نے کیا ہے۔ اور جسے اس نے ذاتی طور پر مشاہدہ اور محسوس کیا ہے۔ اسے مسئلہ وحدت وجود کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اگرچہ یورپین اور مسلم مصنفین نے اسے اس نوع میں شمار کیا ہے۔ لفظ حلول جس کے ساتھ اس نے وحدت باری کی تعبیر کی ہے۔ اس کے ہم مذہبوں کے خیال میں عیسائیت کے مسئلہ تجسیم (باپ۔ بیٹا روح القدس) سے خاص مناسبت رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے اپنی ذات کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ لیکن غیر معمولی قسم کی کئی ایک تمثیلات موجود ہیں۔ جن کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ تمام مسلم متصوفین میں سے حلاج ہی ایک ایسا انسان ہے۔ جس میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ نزدیک ترین مناسبت پائی جاتی ہے۔ اس کے نزدیک ایک واصل باللہ ولی اللہ ایک مقدس ترین تبلیغی زندگی کا نمونہ ہوتا ہے۔ جس میں خود خدا جلوہ نما ہو جاتا ہے۔ اور اس کی روح حق حق پکارتی ہے۔ اور جو راز تخلیق یعنی خدا کی ہستی میں مدغم ہے۔ پروفیسر موصوف کا بیان ہے۔ کہ حلاج کے خیال کے مطابق صوفیاء کی پیش کردہ وحدت باری کو لفظ کن کے ساتھ ایک خاص علاقہ ہے۔ اور یہ لفظ کن ایک ایسا لفظ ہے۔ جسے قرآن کریم میں ولادت مسیح اور یوم النشور کے متعلق خاص طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ایسی وحدت باری جس سے ملاقی ہونے کے لئے احکام خداوندی کی تفہیم اور ان پر عمل درآمد ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ جس کے بعد ایک صوفی کی روح حق میں حلول ہو جاتی ہے۔ جو کہ امر من امر اللہ ہے اس کے بعد انسان کا ہر فعل امر من امر اللہ کا درجہ رکھتا ہے۔ حلاج کو دار پر

کھینچنے کا واقعہ بغداد میں ۳۰۹ھ ہجری میں پیش آیا۔ جب اس کو مصلوب کرنے کے لئے سولی پر چڑھا دیا گیا۔ تو اس نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر ایک دعا کی جس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "اے خدا اپنے ان بندوں کو جو تیرے دین کی خدمت کے جذبہ سے معمور ہو کر اور تیری عنایات سے ہم کنار ہونے کی غرض سے مجھے قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ معاف کر دے اور ان پر رحم فرما۔ کیونکہ اگر تو نے ان پر وہ حقائق ظاہر کر دیے ہوتے۔ جن کا انکشاف تو نے میری ذات پر کیا ہے۔ تو آج ان سے وہ حرکت سرزد نہ ہوتی جو اب ہو رہی ہے۔ اور اگر تو نے وہ بات مجھ سے پوشیدہ رکھی ہوتی۔ جو تو نے ان سے پوشیدہ رکھی ہے۔ تو مجھے ان مصائب کا شکار نہ ہونا پڑتا۔ تیرے ہر کام میں اور تیری ہر رضا میں بھلائی ہی بھلائی ہے"

اسلام انسان کو اعمال کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اور ایک انسان کو محض اس کی آزاد خیالی کی بناء پر سزاوار تعزیر نہیں گردانتا۔ ایک صوفی کے خیالات قوانین اسلام کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں۔ اس وقت تک اس کی ذات سے کسی اندیشہ کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ عبادت گزاری میں مشغول ہے۔ اور یہ ایک امر مسلّم ہے کہ حلاج اپنے مذہبی فرائض کی ادا کاری میں خاص طور پر محتاط واقع ہوا تھا۔ اور اگرچہ حقارت کی نظر سے تو نہیں مگر یقیناً ان چھبر مدارج کو التفات کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا جن میں سے گزر کر ایک انسان کو اس حقیقی مذہب کی بلندیوں تک پہنچنا مقصود ہوتا ہے۔ جو کہ صحیح معنوں میں ایک پُر از خلوص دل کی نیازمندانہ عبادت پر مشتمل ہے۔ فرائض اسلامی کی ادا کاری کے متعلق بیشتر صوفیائے کا یہی رویہ رہا ہے اور وہ آقاؤں کے ساتھ عقیدت مندی کے اظہار کا یہی ایک بہترین طریقہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن حلاج کو ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی تھی کہ کوئی کام اس کے ضمیر کے خلاف سرزد نہ ہو۔ اسلامیات اور اسلامی ریاست کی الم نشرح سیادت کے خلاف وہ اپنی ذات کی پسند کو جو کہ خدائی طاقتوں کے اخذ کردہ ہے پیش کرنے کی جرأت کرتا تھا۔ اور وہ جنیدؒ کی طرح نظریات پیش کرنے پر ہی بس نہ کرتا تھا۔ اس پر کارِ میتھن کے ساتھ مل کر کام کرنے اور معاملات رکھنے کا شبہ تھا اس نے اپنے عقائد کی تبلیغ کافروں اور مومنین کے درمیان یکساں طور پر کی۔ اور کرامات کے ذریعے لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی انتہائی کوشش کی۔ ان وجوہات کی بناء پر اسے بجا طور پر قابلِ نفرت سمجھا گیا۔ متاخرین صوفیاء کے قول کے مطابق اس کا جرم یہ نہ تھا کہ اس نے آسمانی بادشاہت کے راز کو افشاء کر دیا۔ بلکہ اس کا قصور یہ تھا

کہ اس نے ایک اندرونی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ایک ایسی حقیقت کے اظہار کا اعلان کیا۔ جس سے مذہبی، سیاسی معاشرتی بدنظمی کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ حلاج کی زندگی اور موت اس کام میں ختم ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار میں قربت اور شفقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مثلاً کہتا ہے۔ کہ "تیرے اور میرے درمیان ابھی اَنا کی آڑ پائی جاتی ہے۔ جو مجھے از حد تکلیف دہ ہے۔ اپنے فضل و کرم سے اس آڑ کو ہٹا دے۔ میں وہ ہوں جس سے مجھے محبت ہے۔ اور وہ جسے میں محبت کرتا ہوں۔ میں ہے۔ ہم یک جان دو قالب ہیں۔ اگر تو مجھے دیکھتا ہے۔ تو تو اسے دیکھتا ہے۔ اور اگر تو اُسے دیکھتا ہے۔ تو مجھے بھی دیکھ رہا ہے" اور جیلی نے اس مطلب کے کئی اشعار بھی کہے ہیں۔

ہم دونوں کی روح ایک ہے اگرچہ جسم دو ہیں اور مولانا رومی کے الفاظ میں ہے خوشا آں وقت جب تم اور ہم ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ تم اور ہم

ہم ایک تھے۔ ہماری شکلیں تو دو ہونگی مگر روح ایک حلاج نے کسی خاص رنگ میں اور کسی خاص مقام پر خدا ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ وہ خدا جس کی ماورائیت کو وہ محکم طور پر تسلیم کرتا ہے۔ اور یہ بات کسی ایسے شخص کیلئے باعث حیرانی نہیں ہو سکتی۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ منطق کے متناقض خیالات تصّوف کے حقائق بن جایا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کے انوکھے عقائد اس کی وفات کے بعد زندہ نہ رہ سکے۔ مگر وہ کئی قسم کے قیاسات کی آماجگاہ ضرور بن گئے۔ مثلاً یہ کہ ایک مکمل ترین انسان کی ماہیت کیا ہے۔ جو ابن العرابی کی تصانیف اور ایرانی صوفی شاعری میں نمایاں خط و خال کے ساتھ موجود ہیں۔ حلاج کی وفات کے بعد کی اگلی صدی نے اگرچہ دنیائے تصوف میں کوئی جدّت پیدا نہیں کی مگر اس میں نصر السراج کی تصنیف کتاب اللمعہ اور ابو طالبؒ کی تصنیف قطع القلوب میں صوفیائے عظام کے جملہ عقائد کو پہلی دفعہ ایک منظم اور منضبط صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ وہ کتب ہیں جن میں صوفیاء کے مذہب کے متعلق وہ تمام قیمتی مواد موجود ہے جو کہ ایسے مواخذ سے حاصل کیا گیا تھا۔ جو اب ضائع ہو چکے ہیں۔ تصوف اب اسلام سے کٹ کر وحدت وجود اور قلندری کی پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اور اس کی وجہ یونانی فلسفہ کا اثر تھا۔ اور خاص کر اس کے فلسفۂ رموز اور تصوّف کا یہ رنگ ایرانی صُوفی و شاعر ابو سعید کی زندگی اور اقوال میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے بعض لحاظ سے اس کی تعلیمات قابلِ تعریف ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ صحیح معنوں میں نیک انسان یا "زندہ ولی" وہ ہے جو ہم ہی لوگوں کے درمیان رہتا سہتا ہے۔ ہم ہی میں سوتا اور کھاتا پیتا ہے۔ خرید و فروخت کرتا ہے۔ شادی کرتا ہے معاشرتی معاملات میں حصہ لیتا ہے۔ اور پھر بھی خدا کو ایک لحظہ کے لئے نہیں بھولتا۔ وہ تمام مخلوق کو خالق کی

نگاہ سے دیکھنے کا متمنی تھا۔ اور رحم اور تلطف کا اس درجہ دلدادہ تھا۔ کہ اس کے نزدیک ایک مسلمان کے دل کو مسخر کرنے سے بہتر کوئی اور ذریعہ قربِ خدا کا بعید از فہم تھا۔ جہاں حلاج ایک طرف مذہبی قوانین کی پابندی کا قائل تھا دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ اندرونی کشمکش کے ماتحت ان کی اطاعت گزاری کو چھوڑ کر اپنے آپ کو ایک اعلےٰ طاقت کے سامنے جھکنے پر مجبور پاتا تھا۔ وہاں ابوسعید کے نزدیک مذہبی قوانین کی پابندی ایک غیر ضروری چیز تھی۔ اور صرف ان لوگوں کے لئے ضروری تھی۔ جو ابھی راستے میں آرہے ہوں۔ ورنہ منزل مقصود پر پہنچ چکنے کے بعد ان کی اطاعت لازمی نہیں رہتی۔ اس کے خیال کے مطابق وصلِ باری کوئی عارضی اور ہنگامی شے نہیں بلکہ وہ نفس کے مارنے اور مشیت ایزدی کے تابع ہوجانے کا ایک مستقل نتیجہ ہے۔ اس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے مریدوں کو حج کعبہ ادا کرنے سے روک دیا تھا۔ جسے وہ "بیت الحجر" کے نام سے پکارتا تھا۔ اس طرح یہ بھی مرقوم ہے کہ ایک دفعہ موذن کی اذان کی آواز سن کر اپنے درویشوں کے رقص کو بند کردینے سے انکار کردیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے کہ ہماری ادائیگی نماز کا طریقہ یہی ہے" یہ حکایات اگرچہ کلیتہً درست نہ ہوں لیکن ابوسعید کے نکتۂ خیال کو بہ احسن وجوہ ظاہر کرتی ہیں۔ مکتوبات کشا دری میں صوفیائے اوّلین کے تقدس اور سنتِ نبوی کے تتبع کا موازنہ صوفیائے متاخرین کی بے راہ روی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ تیس سال بعد کشف المحجوب کے مصنف حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری ؒ نے لکھا تھا کہ اس کے ہم عصر اپنے شہوانی جذبات کو فقہ کے نام سے بے ہنگام تخیلات کو روحانی علم حرکاتِ قلب اور حیوانی روح کی شفقت کو آسمانی محبت، کفریات کو غیریت۔ تشکک کو خلوص قلبی اور مذہب صحیح میں اشکال پیدا کرنے کو ترکِ دنیا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب کہ ایک طرف اولیائے کرام اپنے مریدین اور اندھا دھند مقلدین کی فوج کے ساتھ روائتی اور تاریخی اسلام کے لئے مصیبت کا باعث بن رہے تھے۔ دوسری طرف تشدد کے ساتھ مذہبی احکام کی پابندی کرنے والے علمائے کرام کے درمیان آپس میں پھوٹ پڑگئی تھی۔ اور وہ آیات قرآنی کی حرف بحرف تعمیل پر زور دیتے۔ بیرونی رسوم اور تکلفات پر مباحث کرنے یا تعقل کی بے لطف روشنی میں مذہبی اصولوں کا تجزیہ کرنے کی وجہ سے زندگی کے اندرونی لوازم سے جو مذہب کی روح رواں ہیں محروم ہوگئے تھے۔

سچے مسلمان ضرور دل میں کہتے ہوں گے کہ یہ صورتِ حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ کیا ملتِ اسلامیہ کے شیرازہ کو پراگندہ کئے بغیر مذہب کو مامون و مصئون رکھنے کا کوئی طریقہ نہیں رہا تھا۔ اس سوال کا جواب عام برادرانِ اسلام میں سے ایک بہت بڑے انسان کے منصۂ شہود پہ ظاہر ہونے سے حل ہوگیا۔ جس کا نام ابوحمید الغزالی تھا

جسے ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ والے ابوہمت الغزالی کے نام سے یاد کرتے تھے۔

اقتباس دوئم

الغزالی کے صوفیانہ مذہب اختیار کرنے کا واقعہ ادبی روایات کا حامل ہے۔ یہاں صرف اس قدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ اپنی جوانی کے ایام میں وہ متشکک واقع ہوا تھا۔ اور ایک متصوفانہ مشاہدہ سے دوچار ہونے کے بعد اس کی یہ روحانی بیماری رفع ہو گئی۔ ازاں بعد اس نے اپنی تمام تر توجہ حقیقی صداقت کی تلاش کی طرف منعطف کر دی۔ منطق اور مکتبی دینیات کے مطالعہ نے اس کو یقین دلایا کہ ان میں روشنی کی تلاش عبث ہے۔ ایسی روشنی جو ہدایت کی طرف رہنمائی کر سکے۔ اور جب طیلیس کے عقائد اپنے اٹل مذہبی اسناد کے باوجود بھی آزمائش کی بھٹی میں سے گذرنے کے بعد اس پہ کوئی اچھا اثر نہ پیدا کر سکے۔ تب اس نے تیسری صدی ہجری کے قدیم اساتذہ اور محاسبی کی تصانیف کے بتائے ہوئے مسلک کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا سچائی اس پر منکشف ہوتی گئی۔ وہ لکھتا ہے۔ میں نے صاف طور پر دیکھ لیا تھا کہ جو چیز صوفیوں میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ کتابوں کا اکتسابی علم نہیں بلکہ اندرونی وجدانی کیفیت ہے۔ جو زبردست مشاہدہ کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں متصوفانہ زندگی بسر کرنے سے میسر آسکتی ہے۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ اس کی اپنی نجات خطرہ میں ہے۔ اس کا دنیاوی مستقبل نہایت شاندار تھا۔ اور ایک زبردست کش مکش کے بعد اسے اس شاندار مستقبل سے عملی طور پر متمتع ہونے کے مواقع کو خیرباد کہنا پڑا۔ اس بوجھ کے تلے اس کی صحت خراب ہو گئی۔ اور آخر کار اس نے مکمل طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ اور خدا تعالیٰ کو اپنی پشت پناہ بنایا۔ عین اسی طرح جیسے کوئی انسان آلام کے درمیان ذرائع کے مفقود ہو جانے پر کیا کرتا ہے۔ اس کی عمر بمشکل چالیس سال کی ہو گی کہ اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بغداد چھوڑ دیا۔ پس اس پر ظاہر ہو چکا تھا کہ صوفیائے کرام کا مذہب سچا ہے۔ اور صداقت کے ساتھ ذاتی طور پر روشناس ہونے کے بعد احیائے مذہب کی وہ تحریک شروع ہوئی۔ جس کو اس نے ذاتی مثال اور خاص کر اس کی تصنیف (احیا) نے صوفیائے کرام کے مذہب کو ان حلقوں میں ترویج کیا۔ جن کا رویہ اس کے متعلق پہلے سے معاندانہ تھا۔ اب صوفیائے کرام قطعی طور پر اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ کیونکہ غزالی اور اسکے بعد مسلمانوں کی اکثریت کے خیال کے مطابق وہ الہامات جو اولیاء اللہ پر نازل ہوتے ہیں۔ پیغامبروں کے الہامات میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور رجوکل علوم کا ماخذ اور بڑ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات پر بھی زور

دیتا ہے۔ کہ ولایت پیغمبری سے ماخذ ہے۔ اور متواتر رسول اکرم صلعم کی عظیم الشان سند کا حوالہ دیتا جاتا ہے۔ جس کے احکام کی حرف بحرف تعمیل کی جانا ضروری ہے۔ روح کے متعلق اس کا عقیدہ تھا کہ یہ ایک ایسا جوہر ہے۔ جس میں خداوند کریم اپنے جوہر اصلی اور صفات عالیہ کو معکوس کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ روح بمنزلہ ایک آئینہ کے ہے، جو کہ "آسمانی انگارے" سے جلا حاصل کرتی ہے۔ ہو سکتا تھا کہ یہ عقیدہ جدت پسند صوفیاء کو قیاسات کی طرف ہانک کرلے جاتا ہے۔ مگر غزالی اس قسم کے تمام خطرات سے مامون تھا۔ اگرچہ غزالیؒ نے مسئلۂ توحید پر غیر معمولی شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے۔ مگر وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ کہ خدا خلاق ہے۔ اور اس کے مضبوط اور اٹل ارادے کے ماتحت دنیا کتم عدم سے عالم وجود میں آئی۔ اس کے عقائد بہت حد تک تصوف کے مرہون منت تھے! اور اس نے اس کے حلقۂ انقیاد سے سر مو انحراف نہیں کیا۔ پھر بھی اکثر صوفیائے کرام کسی حد تک یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اپنے عقائد کی بنا پر اسے تصوف کے ساتھ اتنی مرافست نہیں جتنی کہ راسخ العقیدہ مومنین کی جماعت کے ساتھ ہے۔ جس کے ساتھ اس کے مخلصانہ اتقاء، اخلاقی جوش اور علم الحدیث کے ساتھ راسخ العقیدگی اور سب سے بڑھکر اس کے انتقادانہ اور موضوعی طریقۂ خیال نے اس کی دھاک بٹھادی۔ وہ مروجہ مقلدانہ اسلام میں صوفیانہ رنگ بھرنے میں بہت حد تک کامیاب ہو گیا۔ اگرچہ وہ مساویانہ کامیابی کے ساتھ تصوف میں مروجہ مقلدانہ اسلام کا رنگ نہ بھر سکا۔ تاہم محروم بھی نہیں رہا۔ اس نے اپنی متصوفیانہ تحریک میں رواداری کی دلدادہ مگر قدامت پسندانہ رائے رکھنے والے اصحاب کی ایک خاص جماعت کو داخل کر لیا۔ جس نے آنے والے طوفانی ایام میں ایک بریک (آئینہ بندش) کا کام دیا۔ مگر اب اس کی محرکانہ اور عاملانہ قوت کا رُخ دوسری جانب منتقل ہو چکا تھا۔ اور وہ خیالات جنہوں نے ناقابلِ تسخیر انداز کے ساتھ اس تحریک کو آگے کی طرف بڑھایا اور جو مستقبل میں اس پر چھا جانے والے تھے۔ اس کے اپنے خیالات کے ساتھ بہت کم مناسبت رکھتے تھے۔ اس نئی تحریک کے دلدادگان نے جس انداز میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی ہے۔ اس سے یہ حقیقت الم نشرح ہو جاتی ہے۔ کہ اب ان کی روحانیات کا ماخذ مکہ نہیں بلکہ سکندریہ اور ایتھنز ہے۔ غزالی کے ساتھ تاریخ تصوف کا ایک دَور گزر جاتا ہے۔ اس وقت تک صوفیائے کرام خاص طور پر خدا اور انسانی روح کے درمیان ایک استوار تعلق کا مظہر بنے ہوئے تھے۔ برعکس اس رسمی طریقہ عبادت کے جس کا دار و مدار حدیث اور فقہ پر تھا۔ اور جس کے ساتھ انہوں نے ایسے مذہبی عقائد کو ملا لیا تھا۔ جن کی تعمیر یا تو قرآن پاک پر رکھی گئی تھی۔ اور یا ان

کا ماخذ وہ خیالات تھے جو انہوں نے ارسطو اور افلاطون سے اخذ کیے تھے۔ جوں جوں اسلام کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔ اجنبی عناصر زور پکڑتے گئے۔ حتیٰ کہ خلافت کے کمزور پڑ جانے پر انہوں نے میدان کو اپنی جولانگاہ بنانے کے لئے بالکل خالی پایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفہ محیط کل آج بھی سات سو سال کے بعد دنیائے اسلام کے تخیّل پر پوری طرح حاوی ہے۔ اور جس نے جلال الدین رومی، حافظ اور کئی ایک بلند پایہ صوفیانہ خیالات کے شعراء کے رنگ میں ظاہر ہو کر لوگوں کو اس طرح مسحور کر لیا ہے کہ ان کے نزدیک ابن العربی (جو درحقیقت صوفیائے کرام کے مذہب کا موجد ہے) کا کلام بالکل ناقابلِ اعتناء بن کر رہ گیا ہے۔

اس سے پیشتر کہ ہم پھر سے اس موضوع کی طرف رجوع کریں۔ ہمیں اس دور کے ایک امرِ مخصوص کو ذہن نشین کرنا ہے بارہویں صدی عیسوی میں مسلم مذہبی زندگی کے ایک ایسے نظام کا آغاز ہوا جو ازمنۂ وسطیٰ کی عیسائی خانقاہی تنظیم کے بالکل مشابہ تھا۔ شروع شروع میں تو یہ طریقہ رہا کہ مشائخ کے گرد مریدین کا ایک حلقہ جمع ہو جاتا۔ بعد ازیں مریدین خانقاہوں میں رہنے سہنے لگ گئے اور تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مگر یہ نئے مکاتیب انجذابی عناصر کے فقدان کی وجہ سے جلد ہی کالعدم ہو گئے۔ سالکانِ راہِ حقیقت کی ان مجالس کی جگہ (جن میں شیخ کی ذات کے ساتھ عقیدت کارفرما ہوتی تھی) فقراء کی مستقل تنظیم نے لے لی۔ جن میں سے ہر ایک کئی ایک اولیائے کرام کے سلسلۂ علائق کے ذریعہ اپنا شجرہ نسب خود رسول اکرمؐ تک جا ملاتا تھا۔ مختلف سلسلہ ہائے فقراء کا طریقہ کار ان کے عقائد اور مذہبی احکام کے متعلق ان کے رجحانات کے بارہ میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ فقرا کے ان سلسلوں کے ارکان بننے کے لئے تجرد کی شرط لازمی نہ تھی۔ یہ ارکان جو کہ سوسائٹی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جن میں سے اکثر غرباء کے طبقہ سے متعلق تھے۔ اوامر و نواہی کی تعمیل اور عدم تعمیل کے سلسلہ میں بہت مفید کام کر سکتے تھے۔ بعض یورپین مفکرین کے نزدیک مسئلہ محیط کل عملی بد اخلاقی کا دوسرا نام ہے۔ مگر مشرقی دماغ اس درجہ ذلیل اور حقیر نہیں کہ اس پر اس قسم کا اتہام چسپاں کیا جا سکے مسئلہ محیط کل، جہاں تک اس کا تعلق تصوّف سے ہے ایک روحانی مشیخیت اور اخلاقی مقتضیات کا حامل ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چونکہ اسلام میں احکام کی پابندی کرانے والی جماعت کا فقدان ہے۔ اس لئے یہ صوفی آزادی کا غلط مطلب سمجھ کر اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

محی الدین ابن العربی صوفیائے کرام میں بہترین شخصیت اور بہترین قیاساتی اور اجتہادی دماغ کا مالک تھا۔ ۵۵

ترکیا (واقع اسپین) میں پیدا ہوا اور ۱۲۴۰ء میں دمشق کے مقام پر فوت ہوا۔ اس کے عالمگیر فلسفہ کے کل مسائل اس کی کثیر التعداد تصانیف میں محفوظ ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم ہیں۔ ان میں سے اکثر عسیر الفہم اور نوعیت کے لحاظ سے نادر الوجود ہیں اور کوئی شخص ان کے مطالعہ کے بعد مصنف کی دماغی اور تخیلی صلاحیتوں کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ دوسرے اصحاب اور خاص کر عبدالکریم جیلی نے ان تصانیف کو خود مصنف کی نسبت زیادہ واضح اور مدلل طور پر بیان کیا ہے۔ ذیل میں کچھ نہایت نمایاں دقائق بیان کئے جاتے ہیں۔ ابن عربی پکا توحید پرست ہے۔ جیسا کہ اس کے عقیدہ وحدت الوجود سے ظاہر ہے۔ اس کا یقین ہے کہ تمام اشیاء کی تخلیق کا خیال خدا کے علم میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ تمام مخلوق ذات باری کا بیرونی عکس ہے اور خود ذات باری ان کا اندرونی عکس ہے۔ جب کہ ہر مظہر قدرت حقیقت کی کسی نہ کسی صفت کا ظاہر کرنے والا ہے۔ اور انسان خلاصۂ تخلیق ہے۔ جس میں ذات باری کی تمام صفات عالیہ ایک جگہ مجتمع ہیں۔ اور انسان ہی وہ مخلوق ہے جس میں خداوند کریم کے کل معارف مشاہدہ ہو سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ جس میں عرفانی، افلاطونی اور عیسائیت سے اخذ کردہ تمام عناصر ایک ساتھ موجود پائے جاتے ہیں۔ ابن عربی کے نظام فلسفہ میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عقیدہ مخصوص طور پر عیسائیت کے مسئلہ تثلیث کی نوعیت لئے ہوئے ہے۔ اور ذات باری کی تجسیم کا قائل ہے۔ جس کا صحیح تخیل بنی نوع انسان میں ظاہر و باہر ہے۔ اور جس کا سب سے پہلا مظہر آدم علیہ السلام ہیں۔

انسان کامل فطرت کا نقش اول اور ذات باری کا مظہر ہونے کی حیثیت سے فضل ربانی اور فلسفہ کائنات کے اصول کے درمیان جو کہ دنیا میں سمویا ہوا اور اس کے لئے سنبھلنے کا کام دیتا ہے۔ واسطہ اور وسیلہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اور یہ انسان کامل حضور سرور کائنات کی ذات بابرکات ہے۔ ابن عربی سے بہت پہلے یہ عقیدہ کہ حضرت رسول پاکؐ کی روح مطہرہ کل مخلوق عالم سے پہلے پیدا کی گئی تھی۔ عام طور پر اسلام میں فروغ پا چکا تھا رسول پاکؐ کی روح مطہرہ یا جوہر اصلی سب سے پہلے عالم وجود میں آئی جو کہ نور محمدؐ کے نام سے آدم علیہ السلام کے جسم پاک میں نمودار ہو کر پھر نسلاً بعد نسلاً تمام پیغمبروں میں منتقل ہوتی رہی۔ آخر قطعی صورت میں خود رسول پاکؐ کی ہستی مبارک میں ظاہر ہوئی۔ اہل تشیع کے عقیدہ کے مطابق یہ رسول اکرمؐ کے بعد علی المرتضیٰ میں منتقل ہو کر جملہ امامان علیہم السلام کی بابرکت ذاتوں میں منتقل ہوئی۔ مگر صوفیائے کرام کے عقیدہ کے مطابق

اولیائے کرام کی ذاتِ گرامی میں اب بھی محیطِ عالم ہے۔ ابن عربی نے رسول پاکؐ کی ذاتِ اقدس کو حقیقت الحقائق کے ساتھ بالکل ملا دیا ہے۔ اور یہ ایک ایسا نظریہ ہے۔ جسے اریجن (انگریز پروفیسر) نے ارسطو کے عامل اور موثر تعقل اور مسئلہ تثلیث کے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس لحاظ سے آنحضرت کی ذات مبارکہ دنیا کی تخلیق میں ایک عامل محرّک یا خلیفۃ اللہ کا درجہ رکھتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ آپ کی ہستی دنیا کو برقرار رکھنے کے لئے مدار کا کام کرتی ہے۔ جن کی خاطر یہ دنیا عالمِ ظہور میں آئی اور جو الہامات ربانی کا لاثانی ماخذ اور منبع ہے کیونکہ آپ اس وقت بھی پیغمبر تھے۔ جب کہ آدم علیہ السلام ابھی کیچڑ مٹی میں تھے۔ یہ عقیدہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے چار حواریوں کے لکھے ہوئے حالات مسیح کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال ابنِ عربی کو عیسائیت کے ساتھ خاص طور پر ہمدردی تھی۔ اور وہ لفظ کلمہ کو حضرت مسیح اور رسول کریمؐ کے لئے خاص طور پر استعمال کرتا ہے۔ موحدانہ تصوّف ناگزیر طور پر یا تو ہمیں مسئلہ وحدت وجود یا ہمہ اوست پسندی کی طرف مائل کرتا ہے اور یا جیسا کہ اسلام میں پایا گیا ہے۔ دونوں طرف مائل کرتا ہے۔ مجرد فطرتِ ربانی سے قطع نظر کرتے ہوئے ذاتی عقیدت کے قابل یا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہے' یا اولیائے کرام کی۔ جن کے وسیلہ سے خداوندِ کریم کے معارف انسان پر منکشف ہو سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ کہ ذاتِ باری اور رسولِ پاکؐ کی ہستی مبارکہ میں سر مُو تفاوت نہیں، اس وقت پیدا ہوا جب کہ خداوندِ تعالیٰ کی ہستی کو برقرار رکھتے ہوئے مذہبی مقتضیات کی پذیرائی کا سوال درپیش تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے رسول کریمؐ کی پرستش اس نوع اور ایسے الفاظ میں پیش کرنا شروع کر دی جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کفریات ہونے کی بنا پر قابلِ مذمت تھی۔ مثال کے طور پر یہ کہ "اگر نور محمدؐ پیدا نہ ہوتا۔ تو نہ دنیا پر کوئی رموز ظاہر ہوتے نہ چشمے بہتے، نہ دریاؤں میں روانی ہوتی" صوفیائے آنحضرتؐ کو محبوبِ خدا کے نام سے یاد کرتے ہیں اور آپ ہی کے توسّل سے تحفہ ہائے ربّانی اس کے محبانِ اور اس کی یاد میں محو رہنے والوں تک پہنچائے جاتے ہیں ابنِ عربی کے نزدیک اولیائے کرام اور رسولِ پاکؐ کے ساتھ عوام کی عقیدت اللہ تعالیٰ تک رسائی کے عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے۔ مذہب والوں کا خدا تصوف کے خدا کے برعکس محدود محض ہے۔ اسی لئے اس عقیدہ کے قائل صرف اپنے ہی مسلک کی تعریف کرنے اور دوسری کو متہم کرنے میں اپنی جہالت اور

تاانصافی کا اظہار کرتے ہیں۔ کافر اور بُت پرست بھی خدا ہی کے نقش پر پیدا ہوتے ہیں۔ اگرچہ مذہبی عقائد کے مطابق وہ کشتنی اور گردن زدنی ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ روح ہستی ربانی کا ایک مظہر ہے۔ ابن عربی یہ نتیجہ مستنبط کرتا ہے کہ انسان اپنے اعمال میں قادر و مختار ہے۔ لیکن اس کا نظام فلسفہ آزادیٔ رائے کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خداوند کریم کے افعال اس کی اپنی فطرت کے اقتضاء کے مطابق ہوتے ہیں۔ جن کا اقتضاء یہ ہے کہ اس کے صفاتِ عالیہ کا لامحدود تنوع ان اشیاء میں جن پر ان کا صدور ہوتا ہے لاتعداد اثرات پیدا کرے۔ کیوں کہ بدی بذاتہٖ کوئی چیز نہیں۔ اس لئے جہنم ایک عارضی قیام گاہ ہے۔ اور آخر الامر ہر گنہگار کی شفاعت ہو جائیگی۔

ابن عربی کے اقوال ہمیں سپریز (SPIRAZE) یہودی ہسپانوی کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن اس جگہ ہمیں یہ کہنے میں تامل ہے کہ ہسپانوی یہودی کو ہسپانوی مسلم (ابن عربی) کے خیالات کا علم تھا۔ جس کے بے شمار باطنی اور سرّی اقوال اس حقیقت پر پردہ ڈالے ہوئے ہیں کہ وہ ایک جدت طراز اور پُرمغز مفکر ہو گزرا ہے اس کے بالکل برعکس اس کے اقوال کا ازمنۂ وسطیٰ کے عیسائی ماہرین علم الکلام پر بہت زیادہ اثر ہوا اور جیسا کہ پروفیسر (آسن پیلاکوائز) نے حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ حسن، معشوق، جہنم اور بہشت کی جو کیفیات ابن عربی نے بیان کی ہیں۔ وہ DANTE (ڈانتے) اٹلی کے شاعر کے بیان سے بہت حد تک مشابہ ہیں۔ جہنمی طبقات، ستاروں بھرے آسمان، نور یزدانی کے گرد فرشتوں کا جھرمٹ، تین حلقے جو کہ تثلیث کے نشانوں میں سے ہیں۔ ان تمام چیزوں کو ڈانتے نے عین اسی طرح بیان کیا ہے۔ جس طرح ابن عربی نے انکی کیفیت لکھی ہے۔ ڈانتے لکھتا ہے کہ کس طرح وہ جوں جوں اوپر ہی اوپر آسمان کی طرف چڑھتا گیا۔ اس کی محبت بڑھتی گئی اور بٹریس (BEATRICE) (اس کی معشوقہ کا نام ہے۔ اس کے حسن کو دیکھ دیکھ کر میری روحانی بصارت اور تیز ہوتی گئی۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار ابن عربی نے اپنی ایک نظم (ترجمان العشاق) میں جو ڈانتے سے ایک سو سال پہلے لکھی تھی۔ کہتا ہے۔ معشوق سے ملاقات کرنے پر میرے اندر وہ چیز پیدا ہوئی۔ جبکہ پہلے مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کیونکہ مجھے ایک صورت نظر آئی۔ جس کی خوبصورتی بار بار ملنے پر لطافت اور عظمت میں بڑھتی چلی گئی۔ پس ایک ایسی محبت سے جو ایک مقرر شدہ اندازہ کے ساتھ لحظہ بہ لحظہ ترقی پذیر تھی۔ کوئی راہِ فرار نہیں مل سکتی تھی۔

اس جگہ یہ بھی عرض کر دینے میں کوئی باک نہیں کہ ابنِ عربی کی بھی ایک معشوقہ نظام نامی تھی جو مکین الدین کی باسلیقہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نیک اختر دختر تھی۔ ابن عربی نے اس کی شان میں ایسے غنائی اشعار لکھے کہ جن کی بناء پر وہ بدنام ہو گیا۔ اور اس بدنامی کے داغ کو دور کرنے کے لئے اس نے اُن اشعار کی تفسیر لکھی۔ تاکہ ان کے نقادوں کو یقین دلایا جا سکے کہ ان کے احتمالات بے بنیاد ہیں۔ عین اسی طرح ڈانٹے نے بھی اپنی معشوقہ کی شان میں ۴۲ غزلیں لکھی تھیں۔ جن کی بناء پر اس پر کڑی نکتہ چینی کی گئی اور اس نقطہ چینی کی تلخی کو دور کرنے کے لئے جس کا مطلب یہ تھا کہ ان غزلوں میں شہوانیت کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ اس نے اپنی مشہور نظم کانوٹ (CONVITE) لکھی۔ مختصراً یہ تقابل اپنی عمومیت اور خصوصیت کے لحاظ سے یہاں تک وسیع ہو گیا ہے کہ اس سے ایک اور صرف ایک نتیجہ مستنبط ہوتا ہے۔ واقعہ معراج اور حیات بعد الممات کے متعلق اہلِ اسلام کے مذہبی عقائد جو محدثین اور فارابی وغزالی جیسے مصنفین سے ماخوذ ہیں۔ ادبی کلچر کے ان تمام مشترکہ خزائن تک پہنچ چکے تھے۔ جن تک تیرھویں صدی کے بہترین یورپین دماغوں کی رسائی ہو سکتی تھی۔ آؤ اب ہم مشرق کی طرف رجوع کریں جہاں ایرانی تصوف کا سنہری دور شروع ہو چکا تھا۔ یہ دور قدرتی طور پر ایک ایسے زمانہ کے بعد ظہور پذیر ہوا جب کہ مغل حملہ آوروں نے وسط ایشیا پر پے در پے حملے کر کے وحشت خستہ حالی اور بدنظمی کے سوا اور کوئی نشان باقی نہ چھوڑا تھا۔ افراد کی طرح اقوام کو بھی متواتر اور مسلسل مصائب کے بعد دماغی سکون کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ کوئی حیرانی کی بات نہیں اگر ایرانی لوگ جو مدت العمر کی خستہ حالی اور بے چینی کے بعد ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ جنہوں نے ایک طرف تو انہیں امن و امان، سلامتی، انصاف اور مہربانی اور تلطف کی فراوانیوں سے متمتع ہونے کے وعدے دلائے۔ اور دوسری طرف ان کی توجہ صوفیائے کرام کے ابدی امن اور خوشی کے نظریات کی طرف ملتفت کرائی جو ان لوگوں کا حصہ وافر ہے جو خداوند کریم کی یاد میں محو رہ کر اس سے ملنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اس ابدی امن اور خوشی کی پُر لطف زندگی کا نقشہ صوفی شعرائے نے ایسی خوبی اور وضاحت سے کھینچا کہ ان کا کلام ان ممالک میں بھی جہاں فارسی زبان سمجھنے والے بہت کم حضرات پائے جاتے ہیں۔ نہایت ادب اور احترام سے دیکھا جانے لگا۔ اس دلکش تصویر کی عقلی داغ بیل ابن عربی کے دماغ کی اختراع ہے۔ اس کے پیش کردہ تصوف کو دل اور ضمیر کے ساتھ کوئی علاقہ اور کوئی لگاؤ نہیں بلکہ یہ ایک قیاسی فلسفہ کی بے جان تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ جسے اوّلین صوفیاء کے

مذہبی اور اخلاقی احساسات کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں۔ اب ایک صوفی کی امتیازی شان یہ نہیں کہ اس نے اللہ کی یاد میں عرصہ دراز تک محو اور منہمک رہنے کے بعد اسے پالیا ہو۔ یا جس نے اپنے نفس کو مار کر۔ ریاضت اور انفعال کے مدارج طے کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی سے اس تک رسائی حاصل کر لی ہو۔ بلکہ اب اس کی حیثیت ایک ایسے شخص کی ہے جو سمجھتا ہے کہ ہر شخص اپنی ہی وجدانی کیفیت سے خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ اور اس کے اسرار و رموز کو بیان کر سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے ایسا انسان جو ذات باری میں مدغم اور حلول ہو گیا ہے۔ میری ہستی اس دن سے شروع ہوئی جب کہ ناموں کا وجود تک نہ تھا اور نہ کسی ایسی ہستی کا نشان تھا جس کا نام لے کر اس کو پکارا جائے۔ میری ہی وجہ سے نام اور ناموں والے وجود میں آئے۔ اس دن جب کہ "میں" اور "ہم" کا کوئی وجود نہ تھا۔

پیشتر اس کے کہ اس نوع کی شاعری پر غور کیا جائے بہتر ہوگا کہ اس نظری فلسفہ کو بیان کیا جائے جس پر اس قسم کی شاعری کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا جوہر اصلی وہ ہے جو معرض ہست میں ہے۔ اس کے صفات عالیہ خیالی طور پر تو اس سے متمیز ہو سکتے ہیں۔ لیکن در اصل وہ اس کے ذات سے علیحدہ نہیں۔ ذات باری کی صفات عالیہ کا مجموعہ جسے ہم آفاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس تصویری شیشہ کی مانند ہے جو ہر وقت مختلف اطراف میں گھومتا رہتا ہے اور جو کہ اس کا مظہر ہے۔ اور اس حد تک حقیقی ہے۔ جب تک وہ اس میں معکوس ہو رہا ہوتا ہے۔ مظاہر قدرت کی کوئی بالذات ہستی نہیں۔ ان کی ہنگامی ہستی اس ہستی مطلق کا بیرونی اظہار ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے مرکز سے نکل کر جلوہ نمائی کرتے رہتے ہیں۔ اشیاء کے نظام میں انسان کی پوزیشن اور اس کے وظیفہ ہائے خاص کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ وہ روحانی اور اجسامی دنیاؤں کا جائے اتصال ہے۔ اور وہ آفاق کے اس مرکز پر واقع ہے جس کی وہ روح رواں ہے۔ لیکن جہاں تک اس کے مظاہری پہلو کا تعلق ہے وہ نقدان ہستی کی تاریکی سے زیادہ تاریک ہے۔ اس کے جسمانی تعلقات اسے غلامی کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ پس وہ خیال کرتا ہے کہ وہ اپنے ممالک سے دور اور علیحدہ ہے۔ اگرچہ ہمارے حواس ظاہری اور انتقادی تعقل اس فریب نظری کی تصدیق کرتے ہیں لیکن یہ فریب نظری فلسفۂ تصوف کے اس پہلے اصول کا رد ہے۔ جس کا پہلا سبق یہ ہے کہ کل کائنات اور عالمانہ حرکت ربانی سرگرمی کا مظہر ہے۔ صوفیائے کرام اس سے کیا مطلب لیتے ہیں۔ یہ تو وہ جانیں جنہوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہو۔ اور درحقیقت وہ کنایات کے سوائے

اس کے معانی بھی آشکار نہیں کر سکے۔ عاشقانہ طرز کی شاعری جس میں اس فریب نظری کا کنایتہً اظہار ہوتا ہے۔ بصد خوبیٔ حسن ہمارے تخیل میں اس چیز کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ جو تعقل کے دائرے سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ جوش محبت کو دورۂ مستی کے ساتھ وہ صحیح مطابقت ہے۔ جسے صوفیا، علمِ باطنی اور زاہدانہ انقطار سے مربوط جانتے ہیں۔ شروع شروع میں قرأت قرآن سے وجدانہ کیفیت کو بروئے کار لانے کا کام لیا جاتا تھا لیکن بعدۂ غزلیات جن میں بظاہر کوئی متصوفانہ ارادہ نہیں پایا جاتا تھا۔ اس قسم کی کیفیت کے بروئے کار لانے میں استعمال کی جانے لگیں۔ غنائی نظمیں سرود کے ساتھ اور بغیر سرود کے پڑھی جاتی تھیں۔ تاکہ وجدانی کیفیت اور جوش کو ابھارا جا سکے اور بعض اوقات خاص مواقع کے لئے اسی مقصد کے پیش نظر خاص غزلیں تیار کی جاتی تھیں۔ ایسی غزلوں کے تیار کرنے میں شاعروں کا مقصد یہ نہیں ہوتا تھا کہ کسی عالمگیر سچائی کا اظہار کیا جائے۔ بلکہ ان کے پیشِ نظر صرف یہ بات ہوتی تھی کہ اپنے فن کی مدد سے ایک ایسی نظری دنیا پیش کی جائے۔ جس میں خداوند کریم کی ذاتِ مطلق اور ناقابلِ اظہار ہستی کا مشاہدہ ہو سکے۔ اور روح کو آسمانی ترنمات سے ہم آہنگ کر کے متصوفانہ کیفیات کے مشاہدہ کے لئے تیار کیا جائے۔

ہمیں مولنٰا جلال الدین رومی اور فرید الدین عطار کی صوفیانہ شاعری کا ذکر کرنا باقی ہے۔ موخرالذکر کی مشہور کتاب منطق الطیر ہے۔ اس میں پرندوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جو ہُدہُد کی سرکردگی میں سیمرغ کی تلاش کو نکلے۔ جستجو محبت، علم، ترک تعلقات، وصال، حیرانی اور ضبطِ نفس کی سات وادیوں میں سے گزر کر کل تعداد میں ۳۰ باقی رہ جانے والے پرندے سیمرغ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ جہاں انہیں محسوس ہوا کہ ان میں سے ہر ایک بذاتِ خود سیمرغ ہے۔ اور سیمرغ بذات خود تیس پرندوں کے سوائے اور کچھ نہیں۔ انہوں نے درخواست کی کہ انہیں اس گہرے معمے کا حل بتایا جائے۔ یعنی یہ کہ اس "میں" اور "تو" میں کیا راز پوشیدہ ہے۔ ایک پُراسرار بے صوت تقریر میں انہیں سیمرغ کے حضور سے جواب ملا۔ "یہ سورج جیسی آب وتاب والی ہستی ایک آئینہ ہے۔ جو کوئی اس میں داخل ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو ہی اس میں معکوس پاتا ہے۔ جسم اور روح۔ اس میں اسی جسم اور روح کو دیکھتے ہیں"

مستی کی حالت کسی قانون کی تابع نہیں۔ اس لئے اللہ والے بے دینی اور دینداری کی حدود سے باہر ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صوفیائے کرام بے دینی اور بداخلاقی کو اپنا شعار بنالیں۔ البتہ کم ظرف اور دُون فطرت نام نہاد صوفی ایسا سمجھیں تو بعید از قیاس نہیں۔ حقیقی معنوں میں نیک انسان قانون کی پابندی اپنا فرض سمجھتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اپنے اور خدا کے درمیان کوئی فرق نہیں پاتا۔ دائرہ معبودیت معبود کے اندرونی اور بیرونی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہونا چاہئے۔ یکتائیت اور معدودیت، صداقت اور احکام واجب العمل۔ یہ کافی نہیں ہے کہ خدائے خلاقِ خلائق کی عبدیت میں داخل ہوئے بغیر ہم اس چیز سے بچنے کی کوشش کریں جس میں تخلیق کی بُو آتی ہے۔ انسان کامل کا امتیازی خاصہ یہ ہے کہ وہ قناعت کے مدارج کو عبور کرکے اللہ تعالیٰ کی عبودیت میں سما جائے۔ کامل انسان وہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سفر کرنے کو کافی نہیں سمجھتا (یا یوں کہئے کہ معدودیت سے اکائیت کی طرف جاتا ہے) بلکہ ایک خدائے واحد میں مدغم ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی یکتائیت میں سما کر اسی کے ساتھ دنیائے مظاہر میں ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں سے روانہ ہوا تھا اور معدودیت میں رہ کر یکتائیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس "اترائی" میں وہ احکام کی پابندی کو اپنی ظاہری پوشاک بناتا ہے۔ اور صوفیانہ مسلک کو اپنے لباس اندرونی کا نام دیتا ہے کیونکہ احکام واجب العمل کی تعمیل کرتے ہوئے وہ حقیقت کو بنی نوع انسان پر ظاہر کرتا ہے۔ نظریات سے قطع نظر اولیائے کرام جن میں سے اکثر ماہر روحانیات اور الٰہیات تھے اچھی طرح جانتے تھے کہ انہیں معرفت کے اعلیٰ نکات ایسے لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرنا چاہئیں جو ابھی مبادیات پر بھی اچھی طرح حاوی نہیں ہوئے۔ سینٹ پال کی طرح وہ جانتے تھے کہ کون چیز کس قسم کے انسان کے لئے موزوں و مناسب ہے۔ کسے دودھ پیش کیا جانا چاہئے اور کسے گوشت۔ یہی وہ دوہری سچائی تھی جس کی مدد سے وہ قرآن کریم کے پیش کردہ "اللہ" اور وحدتِ وجود کے خدا کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ اور اس کی مدد سے اخلاقیات کا وہ اعلیٰ نظام پیش کر سکے جس کی آخری اور قطعی بنیاد اس بات پر ہے کہ بدی بذاتہٖ کوئی چیز نہیں۔

ایرانی تصوف کا شاہکار مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی معنوی میں نمایاں ہوتا ہے۔ مولانائے موصوف نے درویشوں کے سلسلہ "مولوی" کی بنیاد رکھی اور قونیا کے مقام پر ۱۲۷۳ عیسوی میں وفات پائی۔ مثنوی کو قرآن در زبان پہلوی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور اس کے مصنف کا دعویٰ ہے کہ مثنوی پیغامبرانہ الہامات کی حامل ہے۔ لیکن کتاب کو سرسری نگاہ سے دیکھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ اس کے پیش کردہ عقاید جو روایتوں، کہانیوں، قصوں، لطیفوں اور تمثیلوں کے پود و تار

میں مربوط ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کی مذہبی اور نظریاتی زندگی کی کل اقالیم پر حاوی ہیں۔ اپنی غنائی نظموں میں وہ ایک ایسے صوفی کے نکتۂ نگاہ سے لکھتا ہے۔ جو واصل باللہ کا درجہ حاصل کر چکا ہو۔ مثنوی ایک خطیبانہ انداز کے ساتھ سالکان راہِ حقیقت کو خدائی مسلک کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ مثنوی کی بنیادی روح افتتاحی سطور ہی میں واشگاف ہو جاتی ہے۔ جہاں کہ نے کو۔ جو کہ مولوی سلسلہ کے درویشوں کا آلۂ موسیقی ہے' روح اور خدا کی جدائی پر ماتم کرتی بتایا گیا ہے۔ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اس نظم میں کوشش کی گئی ہے کہ مذہب پروری کے جذبہ کو محبت کی بُو باس میں بسایا جائے۔ جلال الدین رومیؒ کے خیال کے مطابق وہ مذہب جو معقول پسند ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے عقل و دلائل کا محتاج ہے' ایسا ہی بے فائدہ اور عبث ہے جیسا کہ وہ مذہب جس کی بنیاد رسم و رواج کی پابندی اور وضعداری پر رکھی گئی ہو۔

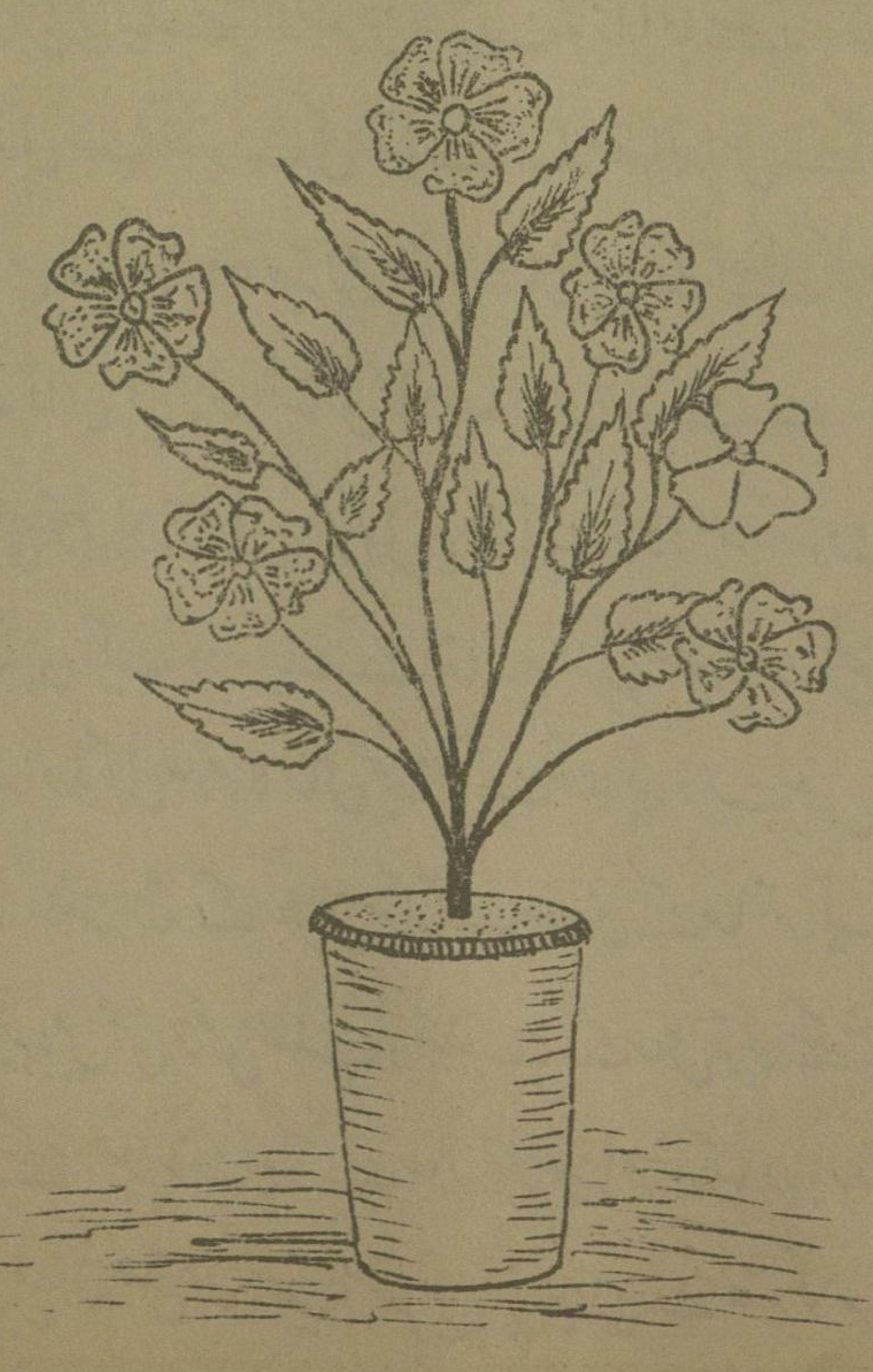
خدا کے نزدیک رسوم و مسالک کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ خدا کا مقام نہ تو مسجدیں ہیں نہ منادر اور نہ گرجے نہ صومعے وہ دلِ مومن میں جاگزیں ہے۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ صحیح عقیدہ اور خشوع و خضوع کے ساتھ عبادتِ الٰہی میں منہمک رہ کر اپنے اندر ایک مکمل اخلاقی تغیر پیدا کیا جائے۔ جلال الدین رومیؒ کا اعتقاد ہے کہ انسان سب گناہ ہے اور خدا کُلّہم نیکی۔ اس لئے اگرچہ جہاں تک خدا کا تعلق ہے بدی بالذات کوئی چیز نہیں۔ لیکن مخلوق کے لئے اس کی ہستی لازم و ملزوم ہے۔ خدا کے ساتھ بدی کا صرف یہ تعلق ہے کہ یہ اس کی کمالیت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ اس طرح ہے جیسے کہ ہم کہیں کہ ایک مصوّر کا کمال ایک خوبصورت اور کریہہ المنظر چیز دونوں کے تیار کرنے میں یکساں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ مثنوی بالوضاحت اس نکتہ نگاہ کو پیش کرتی ہے کہ "تمام بے آہنگی، ہم آہنگی کے اچھی طرح نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے اور تمام ادھوری برائی، عالمگیر نیکی" یہ صوفی شاعر اس "شہوانی جسم" کے خلاف اعلانِ جہاد کرتا ہے۔ وہ سات دروازوں والے جہنم اور مادر اصنام کے بُرے ناموں سے پکارتا ہے۔ انسان اپنی ہی برائیوں کو دیکھ کر دوسروں میں برائیاں گنتا ہے۔ شاعر موصوف نے استادانہ کمال کے ساتھ شہواتِ حیوانی پر بھی لمبی چوڑی بحث کی ہے اور اس موضوع پر ایسی حقیقت نگاری کے ساتھ قلمرانی کی ہے کہ اس کے مترجمین عاجز آ گئے ہیں۔ جبری اور قدری دلائل کا جواب دیتے ہوئے وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہمارے اعمال آسمانی وسائل کے زیرِ اثر ارادتاً ہماری ذات سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے اس کی ذمہ داری خدا پر عائد نہیں ہوتی۔ اگر گنہگاروں کو اس امر کا شعور ہے کہ بُرے کام جبر کے ماتحت ان سے سرزد ہوئے تو وہ اس آسانی کے ساتھ کیوں اس کے تابع ہو گئے۔ اور

پھر بعد ازاں وہ نادم کیوں ہوتے اور اپنے آپ کو مجرم کیوں گردانتے۔

لیکن یہ سوال کا قطعی حل نہیں۔ کامل محبت کے بغیر مکمل آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسی صورت میں میسر آسکتی ہے جب انسان اپنے آپ کو اللہ کی رضا پر چھوڑ دے۔ مثنوی کا اخلاقی پہلو اس کے فلسفیانہ مباحث میں بھی نمایاں ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ خدائے واحد کون ومکاں کے کل مدارج میں ظاہر ہے۔ یہ طریقۂ کار روح کے ارتقاء کے دوران میں مجملاً بیان کیا گیا ہے۔ روح عالمگیر حقیقت کی شکل میں مادی دنیا پر ظاہر ہوتی ہے۔ معدنی، نباتاتی اور حیوانی اقالیم میں سے گزرتی اور انسان کی شکل میں معقولیت کا روپ دھارتی۔ آزمائشی وقت کی تکالیف برداشت کرتی انتقام کی سختیاں جھیلتی، پھر فرشتوں کے طبقات کی طرف صعود کرتی اور اپنے روحانی نشوونما کی تکمیل کے بعد وحدہٗ لاشریک کا وصال حاصل کرتی ہے۔ جس کا وہ ایک مظہر تھی اور آخر کار اس حقیقت کو پہچانتی ہے کہ اس کا زمانہ جدائی در اصل محض ایک خواب وخیال اور بے حقیقت و بے اصل تھا۔

فقیر کہتا ہے کہ یہ ہیں وہ معتقدات متصوفانہ جو ایک یورپین صوفی با محقق کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ اور جن کو کتاب ہذا میں بصورت اقتباسات اس لئے درج کیا گیا ہے تاکہ منکرین تصوف کو بتایا جا سکے کہ متقدمین اہلِ علم حضرات خواہ وہ مغربی ہوں یا مشرقی، ایشیائی ہوں یا یورپی سب تصوف کی حقیقت کے مقر اور اس سے آشنا پائے جاتے ہیں۔ خواہ انکے نظریات کی مباحث جداگانہ ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ بہترین مغربی دماغ جن کے چھینکنے کو بھی نام نہاد مسلمان اپنی زندگی کے لئے اسوۂ حسنہ سمجھتا ہے۔ اس امر کے قائل ہیں کہ خدا شناسی کا واحد ذریعہ تصوف ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تمام انبیاءٔ علیہم السلام کی دعوت الی الحق کا صحیح ترجمہ اور ترجمان اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ علم تصوف اور عمل صوفی ہی ہے۔ ہر ایک صوفی کا طریق حصولِ معرفت خواہ کتنا ہی ایک دوسرے سے مغائر ہو منزل مقصود اور مطمع نظر میں ایک ہی ہے۔ جس کو اختیار کئے بغیر اپنے آپ کو اصلاحی تعلیم اور قرآنی علوم کا حامل سمجھنا ایک کھلا ہوا فریب نفس ہے۔ کیونکہ تقویٰ وعرفان کی صحیح صورت عمل تصوف ہی پیش کرتا ہے۔ سنتہ اللہ کے مطابق ہر کتاب سماوی کے ساتھ ایک عملی نمونہ اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ کتب کے اوراق الفاظ کے ذخیرہ میں کسی نہ کسی مطلب و کیفیت کے حامل تو ہو سکتے ہیں مگر عمل کے بغیر وہ کسی دوسرے کے لئے موجب ہدایت نہیں بن سکتے۔ علمِ سفینہ اور ہے اور علمِ سینہ اور۔ کیا دربارِ رسالتؐ میں فاروقِ اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عرض کرنا، کہ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی جان سے حضور کو عزیز سمجھنے میں ہچکچاہٹ پاتا ہوں“

سرکار انبیاء علیہم السلام کے اس ارشاد کا جواب نہ تھا۔ جو حضور علیہ السلام نے تمام صحابہؓ کی مجلس میں فرمایا۔ "کہ تم میں سے کوئی پکا مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک میں اس کو اولاد، ماں باپ، عزیز و اقارب اور تمام دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز نہ ہوں۔" پھر اس انکار پر جو فاروقِ اعظمؓ سے سرزد ہوا حضورؐ نے ایک باطنی توجہ سے قلبِ عمر رضی اللہ عنہ پر نگاہِ مرشدانہ ڈالی جس کا اثر یہ ہوا کہ عمر رضی اللہ عنہ، فوراً پکار اٹھے کہ میں حضورؐ کو جان سے بھی عزیز تر سمجھتا ہوں۔ اور اس واقعہ کا حال صاحبِ بخاری رضی اللہ عنہ نے درج کر کے ثابت کر دیا ہے کہ بخاری کے اوراق میں یہ ارشاد تو موجود ہے مگر وہ نورِ نبوت موجود نہیں جو سینۂ نبوت سے اٹھ کر قلبِ عمر رضی اللہ عنہ پر گرا اور ہمیشہ کے لئے اس کو منور کر گیا۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہی انتقالِ نور دوسرے معنوں میں حقیقت تصوف ہے۔ اور ہر متلاشی اوراقِ بخاری سے اس قصہ کو تو پا سکتا ہے۔ مگر وہ نور نہیں پا سکتا۔ جو سینۂ اطہر نبوی سے اٹھا اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ، کے دل پر برقِ خاطف بن کر گرا۔ بلاشبہ اسکے حصول کے لئے کسی نورانی سینہ ہی کی تلاش کی ضرورت ہوگی ؏



غیر اسلامی اور اسلامی تصوّف

فی زمانہ بہت سے مدعیان عاملین بالتصوف اور نام نہاد جاہل صوفیوں نے ہندو مذہب کے سادھوؤں اور انکی جوگیانہ مشرب کی کتب وطریق کار سے ایک ایسے تصوّف کی بنیاد ڈالی ہے۔ جو قطعی طور پر اسلامی تصوّف کہے جانے کا حقدار نہیں کیونکہ اس میں تعلیم تو ہے بزرگانِ دین کی اور عملی رنگ ہے جوگیانِ ہند اور راہبانِ یورپ کا۔ ان وضو اور نماز سے بھاگے ہوئے درویشوں نے عزّو جاہ کی طلب میں دیگر مذاہب کی طرح تعلیم تصوّف اسلامی کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ حالانکہ اسلامی تعلیم میں ایسی کوئی تفریق نہیں ملتی۔ جس سے کوئی خاص طبقہ باقی ملتِ اسلامیہ کے افراد سے کٹ کر علیٰحدہ ہو گیا ہو۔ اور نہ ہی یہ بات عقل ونقل کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام جیسے عالمگیر اور انصاف ومساوات پرور مذہب نے اپنے مسائل کی تفسیر ایسے دو طریقوں سے کی ہو۔ کہ اُن میں سے ایک پر صرف ظاہر پرستوں کا قبضہ ہو۔ اور دوسرے پر باطن پرست عمل کریں۔ جہاں تعلیم ایک ہو، علم ایک ہو وہاں اس تفریق خیالی کا کیا مطلب۔ البتہ علمی وعشقی کوائف سے مدارج میں فرق ہو جاتا ہے۔ جو جماعتی تفریق اور اختلافِ راہ کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تقسیم ان جہّال فقیروں کی بے علمی وعملی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ جو اسلامی تصوف سے ناواقف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حصولِ اعزاز وامتیاز کے واسطے اُن غیر مسلم مقتدایانِ مذاہب کا یہ طریق محض ایک خودساختہ حیلہ تھا کہ جو عوام کے لیے علومِ ظاہری اور اپنے لئے ایک حلقۂ باطنی قائم کر لیتے۔ اور اس اندرونی حلقہ میں اپنے حسب منشاء جسے چاہتے داخل کرتے اور جسکو چاہتے نہ کرتے۔ چنانچہ ہندومت کے برہمنوں میں اس درجہ تک پہنچنے کے لئے مسلسل چالیس سال کی ریاضت واطاعت اور بے چون وچرا فرمانبرداری کی ضرورت تھی۔ اور اس کے بعد بھی ستّر برس کی عمر سے پہلے کوئی شخص اس حلقۂ تقدس میں نہیں لیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ شرف بھی صرف برہمن ہی کو حاصل ہوتا تھا۔ کسی دوسری ذات کے آدمی کو کیا مجال کہ وہ اس کا نام تک بھی لے سکے۔ بلکہ بڑے بڑے خاندانی اور اچھے اچھے شریف لوگوں

کے لئے جو برہمن جاتی سے نہ ہوں - اس تعلیم کا ایک لفظ بھی سُن لینا حرام اور موت پا لینے کے مترادف ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اسرار سے عام طور پر سب لوگ ناواقف اور بالکل بے خبر رہتے تھے - ایسے ہی بناوٹی حیلوں سے ان کا اور عیسائی راہب طبقہ کا اقتدار و اختیار ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم میں اتنے عرصہ دراز تک قائم رہا - کہ مصر قدیم سے لے کر یورپ کے قرون مظلمہ تک ان کا درجہ بادشاہوں سے بھی بڑھا رہا - مگر آفتاب عالمتاب اسلام کی زندگی بخش شعاعیں چونکہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ، ہر خورد و کلاں، ہر خاص و عام پر یکساں نور افشاں ہوتی ہیں - اس لئے اس نے اس قسم کی تفریق و تخصیص کا موقعہ ہی نہیں دیا - کہ کوئی طبقہ تعلق الٰہی میں اپنی خصوصیت بیان کر کے عوام کے سامنے اپنے تقدس کا ایسا رعب جما سکے - جس سے یہ پتہ چل جائے کہ دماغی اور اخلاقی ترقیوں کی طرح روحانی ترقی کا انحصار بھی صرف اُن کی ہی ذاتی کرمفرمائی پر منحصر ہے - یہ تمام مذاہب کا مشترکہ عقیدہ اور عام انسانوں کا تجربہ و مشاہدہ ہے - کہ ریاضت اور نفس کشی سے روح قوی اور تر و تازہ ہوتی ہے - اور مادی خواہشات و علائق دنیوی میں انہماک سے یہ طاقت کمزور ہو جاتی ہے - یہی وجہ ہے کہ انبیاء و اولیاء کے علوم و ادراکات اور مقامات عقول متوسطہ کے مرتبہ سے بالاتر ہوتے ہیں - کیونکہ جو چیز انسان میں علوم اور ادراکات کرنے والی اور عالم قدس و عالم سعادت تک پہنچانے والی ہے - وہ ایک لطیف چیز ہے - جس کو روح سے تعبیر کیا جاتا ہے - پس جب علم و سعادت اور قرب الٰہی حاصل ہونے کا منبع وہی لطیف چیز روح ٹھہرتی ہے - تو جس قدر جسم کی کثافت کو بذریعہ مجاہدات و ریاضیات کے زائل کیا جائے گا اسی قدر روح کی لطافت میں ترقی ہوگی اور علوم و ادراکات میں یقیناً وسعت پیدا ہوتی جائے گی - اور روحانی ترقی و سعادت کی راہیں کھلتی جائیں گی - چنانچہ شیخ بوعلی سینا لکھتے ہیں :-

> خدا کی معرفت رکھنے والے پاک بندے جس وقت ان سے جسمانی تعلق کا بار ہلکا کر دیا جاتا ہے - اور وہ دنیاوی مشاغل سے علٰحدہ ہو جاتے ہیں - تو انکی توجہ خاص طور پر عالم قدس اور عالم سعادت کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور وہ اعلیٰ درجہ کے کمال کے ساتھ موصوف اور بڑے لذت اٹھانے والے ہوتے ہیں - اور یہ نہیں کہ جب روح بدن میں ہو تو وہ اس لذت سے بالکل محروم ہیں - بلکہ ایسے لوگ جو خدا کی عظمت و جبروت کی فکر میں ڈوبے ہوئے اور

جسمی شغلوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔ وہ ان اجسام میں رہ کر بھی اس لذت سے اتنا ہی حصہ پا لیتے ہیں۔ جو اُن پر غالب آکر ان کو تمام اشیا سے فارغ کر دیتا ہے۔ دانش نامہ علائی

چونکہ ریاضت اور نفس کشی سے روح کا قوی ہونا اور معرفت الٰہی کا حاصل ہونا ایک مسلمہ امر اور ایک یقینی حقیقت ہے۔ بشرطیکہ رحمتِ الٰہی دستگیری فرمائے اور تعلیم نبوت کے ماتحت رہنمائی صحیح ہو۔ اسلئے بڑے بڑے اربابِ عالم میں عام اخلاقی تعلیم اور معمولی عبادات کے علاوہ خواص کو حصول معرفتِ الٰہی کے لئے سخت مجاہدات و ریاضات کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ چنانچہ ہندوؤں میں جوگ، عیسائیوں میں رہبانیت اور مسلمانوں میں تصوف اسی غرض کے لئے پیدا ہوئے اور اس نعمتِ عرفان کے حاصل کرنے کے لئے مقتدایانِ مذاہب اور عارفانِ الٰہی نے ایسی ایسی ریاضاتِ شاقہ برداشت کیں۔ جو آج کل کے عقول ناقصہ کے نزدیک ناممکن العمل ہیں۔ انہوں نے جسم کے دبانے اور کمزور کرنے کے وہ طریقے نکالے جن کو سن کر تعجب ہوتا ہے۔

گھر بار اور اہل و عیال سے علٰحدہ ہوئے، کھانے، پینے، پہننے اور دیگر عیش و راحت پر لات ماردی۔ تجرد و تنہائی اختیار کی۔ برسوں تک (برت) روزے رکھے۔ چلّے کھینچے۔ ہاتھ اٹھایا تو خشک کر دیا۔ ایک پاؤں پر مدت العمر کھڑے رہے تو اسے سُن کر دیا۔ جس آسن پر بیٹھے برسوں پہلو نہ بدلا۔ یہاں تک کہ حبس دم کی مشق پکائی تو مہینوں سانس لینا بند کر دیا۔ اور یہ سب جانکاہ ریاضتیں محض اس لئے اختیار کی گئیں۔ کہ کسی طرح پیدا کرنے والے سے شناسائی ہو جائے۔ اور معبود حقیقی مل جائے۔ اس سے دائمی تعلق پیدا ہو۔ اور محبتؐ عشق الٰہی کے تمام حقوق پورے ہو جائیں مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجود اس بھاگ دوڑ، محنتِ شاقہ اور جد و جہد کے بھی ویدانت اور عیسائیت کا یہ طریق کار اپنے پیروؤں کو اس روحانی ترقی و بہبودی کی منزل سے روشناس نہیں کرا سکا۔ جس کے وہ متلاشی تھے۔ اور خدا کے عشق میں پاکباز ہندو مہنتوں اور مرتاض عیسائی راہبوں کی ریاضات شاقہ یونہی ایک مقدس شغل بن کر رہ گئیں۔ اور ان کی روحوں کو جس چیز کی تلاش و جستجو تھی۔ اس سے ناآشنا اور دور ہی رہیں۔ تو سخت حیرت ہوتی ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی ریاضتیں بالکلیہ بے فائدہ چلی گئیں۔ آخر ان کی روحانی طاقت میں کچھ نہ کچھ ترقی تو ضرور ہوئی ہوگی اور ممکن ہے کہ قدیم ہندوستان کے جوگیوں کے جو حیرت انگیز قصے مشہور ہیں۔ ان میں بہت کچھ واقعیت اور صداقت

بھی پائی جاتی ہو - اور وہ سب روحانیت ہی کے کرشمے ہوں - مگر اس میں شک نہیں کہ اُن لوگوں نے اپنے مقصدِ حیات کو نہیں پہچانا اور نہ ہی صحیح معنوں میں معرفتِ الٰہی کے بلند و بالا مقام کو حاصل کیا - اور نہ ان کے وجود، ان کی تعلیمات، اور ان کے ان اعمال و افعال سے ابنائے جنس کو کوئی حقیقی فائدہ پہنچا - بلکہ بعض حالات میں ان کی بعض ہستیاں نظامِ عالم کے لئے مزید پراگندگی کا باعث بنیں - اور قوانینِ قدرت کی زنجیروں کو توڑ کر آئندہ نسلوں کے سامنے اخلاقی و روحانی زندگی کا ایک ناممکن العمل اور خلافِ قانون دستورِ عمل چھوڑ گئیں -

جوگ اور رہبانیت کا نقص

ہندوؤں کے جوگ اور عیسائیوں کی رہبانیت کا مرکزی اصول علی العموم ترکِ دنیا اور ترکِ لذاتِ نفسانیہ ہے - جو حقیقتاً قانونِ قدرت اور منشائے فطرت کے سراسر خلاف ہے - اگر خدا کی خوشنودی اسی میں ہے کہ ہم دنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنے وجودوں کو تباہ و فنا کر دیں - تو یہ خدا کی تخلیق پر سخت ترین الزام اور نہایت بدنما دھبہ ہے - کیونکہ اس ترکِ لذائذ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ انسان کا اگر یہی فرض تھا کہ وہ اپنی ہستی کو اپنے پیدا ہونے کے بعد بغیر دنیا سے منفعت حاصل کئے کے فوراً تباہ و برباد کر دے تو خالق نے دنیا کو پیدا ہی کیوں فرمایا اور انسان کو اس میں بھیجا ہی کیوں - پھر اس کا مفہوم یہ ہوا - کہ ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای ... باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

دریا میں ڈالنا اور کپڑے نہ بھیگنے کی تاکید کرنا، پانی گرانے کی اجازت بخشنا اور زمین گیلی نہ ہونے پائے کی ہدایت فرمانا - یا آفتاب کو طلوع کی توفیق دے کر ساتھ ہی دھوپ کو بند کرنے کی تلقین کرنا - نعوذ باللہ گویا قدرت کو بیوقوف بنانا ہے -

خالق الکل نے انسانی تخلیق اور اس معمورہ دنیا کی پیدائش عبث نہیں فرمائی - جو نہ خود کسی کے کام آ سکے اور نہ کوئی اس کے کام آ سکے - جیسا کہ ہندو جوگیوں اور عیسائی راہبوں کے وجود سے نہ دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچا - اور نہ خود انکو دوسروں سے کوئی نفع - ان کی ریاضتوں کی دشواری اصولِ فطرت سے سخت ترین مخالفت و منازعت رکھتی تھی - اور ان کی عمومیت میں سب سے بڑی سدِ راہ بھی تھی - جس پر عوام طبقے کے محدود زندگی گزارنے والے لوگ کبھی گامزن نہیں ہو سکتے تھے -

کیونکہ نجات و معرفت کے حصول کے لئے قویٰ کو معدوم کر دینا ایک انتہائی لغویت ہے - حکیم و لبصیر خدا نے

ان کو مصالح زندگی کے لحاظ سے پیدا فرمایا ہے۔ اگر ان کا استیصال ہو جائے تو انسان کی عملی زندگی یکسر ختم ہو جائے پھر تقرب الی اللہ کیسا اور معرفتِ الٰہی کیسی۔ بعض اوقات اس فریب میں پھنس کر جن لوگوں نے رہبانیت اختیار کی وہ بھی اپنے آپ کو دنیا کی آلودگی اور سیاہ کاری سے بالکل محفوظ نہیں رکھ سکے۔ بلکہ ان کی شہوانی طاقتوں نے عوام الناس سے زیادہ گل کھلائے۔ اور بہیمیت کا حیوانوں سے بھی زیادہ مظاہرہ کیا۔ چنانچہ اب تک جہاں کہیں بھی یورپ کا کوئی قدیم کنیسہ یا صومعہ کسی وجہ سے منہدم ہو جائے تو صدہا معصوم اور بیگناہ بچوں کی ہڈیاں زمین سے نکل کر ان کی سفاکی، بدباطنی سیاہ کاری اور معصیت شعاری کا اعلان کرتی ہیں۔

اور یہی حال ہندوؤں کی مہنت نما اور سادھو گو مقدس دنیا کا ہے جن کے کردار سے واقف ہو کر اسلام نے آج سے کئی سو سال قبل اسی ایک گندی حقیقت اور پوشیدہ معصیت کا پردہ اٹھایا تھا۔

مسیحیت کی روحانی تعلیم کی شکست اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔ کہ روم کے ایک صومعہ کا تالاب جب پوپ گریگوری کے حکم سے صاف کیا گیا۔ تو اس میں سے کئی ہزار معصوم بچوں کی کھوپریاں نکلیں۔ آسٹریا کی ایک خانقاہ دوشیزگان کی بنیادوں نے بھی یہی مہیب منظر دکھایا۔ جس سے اِن ترکِ دنیا کا وعظ کہنے والوں کی پاکبازی اور عصمت شعاری کا پتہ چلتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ ترک لذائذ کی حکائتیں اور گوشہ نشینی کی نام نہاد ریاضتیں ان کو کہاں سے کہاں لے گئیں۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی ضرورت نہیں، کہ تمام تارک الدنیا لوگوں کا یہی حال تھا۔ بلکہ بہت سے پاکباز انسان صحیح معنوں میں ان بدمستیوں سے دور رہے اور انہوں نے اپنے آپ کو ان سیاہ کاریوں سے بالکلیہ محفوظ رکھا۔ مگر وائے افسوس کہ ان کی یہ جانکاہیاں اور نفس کشیاں کسی طرح بھی نمونہ بن کر عوام کے لئے مفید اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکیں۔

آمدم برسرِ مطلب

یہ تھا کہ غیر اسلامی تصوّف کا مختصر سا خاکہ۔ اب اسلامی تصوّف کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجئے جس سے حق حق اور باطل باطل معلوم ہو جائے۔ چنانچہ مسلمانوں میں خداشناسی اور وصول الی اللہ کے جو چار طریقے مشہور اور معمول بہا ہیں وہ اپنے منبع اور ماخذ کے لحاظ سے اسلامی تصوف کا صحیح نقشہ ہیں۔ اور ان کی حیثیت بھی وہی ہے۔ جو فقہ میں چاروں آئمہ رحمہم اللہ کی ہے۔ مگر افسوس کہ نااہلوں نے اس کے بھی دو ٹکڑے کر

دئے۔ ایک وہ جس کی تعلیم ہم کو ہادیٔ برحق سرکار انبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اور جس پر حضرات خلفاء اربعہ اور صوفیائے عظام نے عمل فرمایا۔ اور دوسرا وہ کہ آنحضرتؐ کے فرمودہ اور صوفیائے کرام کے معمولہ تصوف کی جگہ رہبانیت اور ہندوانہ طریق کار و صحرا نشینی نے لے لی۔ اور یہ بتایا کہ تصوف ہمیں یہ سکھاتا ہے۔ کہ انسان کی ہستی کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ دنیا گذشتنی اور گذاشتنی ہے۔ اور اس کا لگاؤ خداشناسی کے میدان میں حجاب اکبر ہے۔ لاحول ولاقوۃ الّا باللہ۔

حالانکہ اس کے برخلاف اسلامی تصوف ہمیں بتاتا ہے۔ کہ ہم دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے بے پرواہ رہیں۔ قلب کو صاف رکھیں۔ نفس اور اس کی خواہشات پر غلبہ حاصل کریں۔ اپنے جسم کی ظاہری و باطنی قویٰ کو خدائے قدوس کے سپرد کر دیں اور اس سے شناسائی پیدا کر لیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ بھلا وہ مذہب جو یہ بتائے کہ خداوند تعالیٰ تمہاری شہ رگ سے بھی قریب تر ہے۔ تم دنیا میں خلیفہ اور نائب حق بنا کر بھیجے گئے ہو۔ تمہارے ہی لئے یہ کائنات پیدا فرمائی گئی ہے، یہ کارخانۂ عالم بیکار و عبث پیدا نہیں فرمایا گیا، زمین و آسمان کی چیزیں تمہارے ہی لئے مسخر ہیں۔ تمہاری خودشناسی خداشناسی کا ذریعہ ہے۔ وہ مذہب اس امر کی اجازت کب دے سکتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بے حقیقت اور ذلیل سمجھے۔ خصوصاً ایسے حال میں جب خدائے قدوس و برتر نے اس کی فضیلت و شرافت پر قسمیں کھا کھا کر حقیقی شرف و مجد سے نوازا ہو۔ اور تمام کائنات سے تاج تکریم کا مستحق ٹھہرایا ہو۔

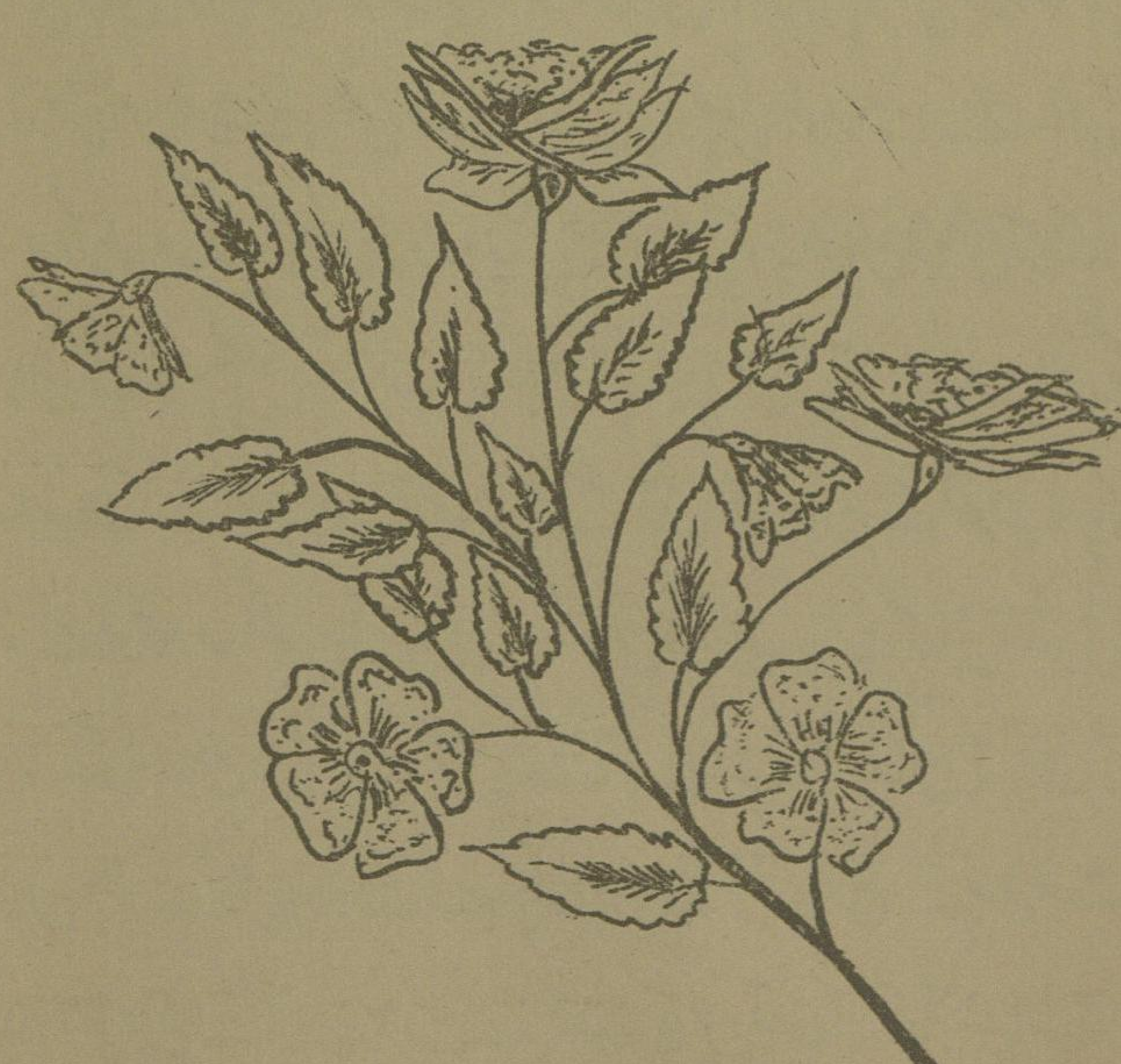
ان واضح امور کی روشنی میں ہر شخص بادنیٰ تامل معلوم کر سکتا ہے کہ انسانی پیدائش کا منشا کیا ہے۔ آیا لذائذ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں زندگی گذارنا یا باہمہ اپنے آپ کو ملوث نہ کرتے ہوئے اس کی معرفت کے میدان میں گامزن ہونا۔ اگر انسان دنیا کو محض بے حقیقت اور اپنی ہستی کو دردسر کے برابر سمجھ کر اس معمورۂ دنیا میں زندگی گذارے۔ تو یقیناً وہ اپنے مقصد تخلیق کو پورا نہیں کر سکتا۔ مولنا رومؒ فرماتے ہیں کہ خود فراموشی فنا ہے اور خودشناسی بقا۔ اگر انسان کو خودشناسی کا جوہر حاصل ہو جائے تو وہ تمام جہان کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ دنیوی علائق کو توڑ کر زندگی کی کشمکش سے کنارہ کش ہو جانا۔ اور گوشہ نشینی اختیار کر کے گناہوں سے بچنے کا تہیہ کر لینا کوئی جوانمردی اور کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ دنیوی تعلقات پر قائم رہتے ہوئے آگے بڑھے۔ اور حقوق عبدیت ادا کرے۔ شعر

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں　　　مے شود فرماں پذیر از دیگراں

یعنی جو شخص اپنے پیکرِ خاکی پر حکمراں نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کا محتاج و محکوم اور فرمان پذیر ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کو پوری طرح ضبطِ نفس کی قدرت حاصل ہو جائے۔ تو اس کا دل یادِ خدا سے منوّر اور تجلیاتِ الٰہی سے مزیّن ہو جاتا ہے اس کے دل پر عجیب ترین کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ جو عالمِ جذبات کی نیرنگیاں اور نشاۃِ ملکیہ کی رنگ آفرینیاں ایک ایسی شانِ ادائی و دلربائی کا متحرک منظر و محسوس پیکر پیش کرتی ہیں۔ جس کا اوّل نظارہ عقل و فکر کی نگاہ کو خیرہ اور فہم و ادراکِ انسانی کی نظر کو تیرہ کر دیتا ہے۔ پھر اگر کوئی شخص حقیقت و معرفت کی عینک لگا کر اسکی تابشِ کمال و درخشندگی جمال کا نظارہ کرے تو اس کی آنکھ کرۂ انوار بن کر اسکو آفتابِ حقیقت کے مقابل کر دیتی ہے۔ مشاہدہ یکتائی کا پیکر عالمِ مثال کی ہمثالی کا مجسمہ پیش کرتا ہے۔ عالمِ سفلی و جہانِ مادی کا ذرۂ خاک سیارگانِ اجرامِ علوی پر چشم نمائی کرتا نظر آتا ہے۔ اور عرش تجلیات فرشِ ظلمات کی طرف جھکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پھر اگرچہ وہ لوگوں سے متعلق رہ کر دنیا کے کام سرانجام دیتا ہے۔ مگر کوئی کام اسکی اپنی مرضی اور خواہشِ نفس کا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اب وہ اس جہان میں نائبِ حق ہے۔ جس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ، جس کی زبان خدا کی زبان، جس کی آنکھ خدا کی آنکھ اور جس کا ہر قول و فعل خدا کا قول و فعل ہو جاتا ہے۔ کاش کہ آج اسلام کے نام نہاد فدائی اس حقیقتِ اعلیٰ کو سمجھتے اور یوں ذلیل و خوار نہ ہوتے۔ ان کے زوال و انحطاط کا واحد علاج اتباعِ تصوّف میں ہے۔ یہ اگر خدا کے ہو جائیں تو وہ دنیا کی نعمتیں جن کو یہ ایمان فروشی کر کے مشرکین کے دسترخوان سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، خود بخود ان کے قدم چومیں۔ تصوّف کا عامل ہونا ہی ان کی تمام پستیوں اور کمزوریوں کو دور کر سکتا ہے۔ اور وہ جوں جوں عالمِ روحانیت سے متصل ہوتے جائیں گے توں توں ان کے قلوب پاکیزہ، ان کے نفوس مقدس اور ان کی قوتیں سحرانہ انداز سے موثر و عالمگیر ہوتی جائیں گی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی محبت و عقیدت کو حد سے زیادہ دل میں جگہ دی جائے اور ان کی صحبت کو غنیمت سمجھا جائے۔ مسلمان بزرگوں اور مشائخین کے مزارات سے مشرف ہوا جائے۔ جس وقت دل ہر طرف سے پاک اور فارغ ہو ان کے مزارات پر بیٹھ کر ان کی روحانیت کی جانب توجہ کی جائے۔ اور اسکی حقیقت کو اپنے مرشد کی صورت میں تصوّر کر کے فیضیاب اور برکات کا حامل ہوا جائے اور اپنے مرشد کے حکم و ادب کو ہر حالت میں اللہ تعالیٰ جلشانہٗ اور اس کے برگزیدہ رسول علیہ السّلام کے حکم و ادب کی حقیقت سمجھا جائے۔ بشرطیکہ خلافِ شریعت نہ ہو۔ عقائد میں فرقۂ ناجیہ حقّہ اہلسنت والجماعت کا پیرو ہو کر

کتاب وسنت اور آثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اتباع کیا جائے۔ نفس کے رذائل سے تزکیہ وتخلیہ کر کے تقویٰ وپرہیز گاری کو شعار بنایا جائے۔ اوامر اور نواہی کے ادا کرنے کے بعد باطن کی مشغولیت کو فرض دائمی یقین کیا جائے اور قبض وبسط کی حالتوں میں تذکار واشغال سے منہ نہ موڑا جائے۔ متلوّن مزاجی سے دور ہو کر دل سے من کل الوجوہ خواہشات پر نناہ وارد کی جائے۔ اور وہ دل جو انوار الٰہی کا گنجینہ وآئینہ بن چکا ہو۔ اس میں غیر اللہ کو نہ دیکھا جائے اور تمام جہان سے بے خوف وبے طمع ہوا جائے۔ پھر دیکھئے کہ کس طرح یہ بندہ خدا کا اور خدا اس کا نہیں ہو جاتا کسی شاعر نے کیا مزے کی بات کہی ہے۔ شعر

میری خود بینی نے ڈالا تھا ترے رُخ پر نقاب
میں ہی خود جب نہ رہا، تو تُو نظر آیا مجھے



تصوّف اور صُوفی

کون نہیں جانتا کہ مسلمان کے لئے متابعت سنّت اور ترکِ بدعت ہی دین و دنیا کی تمام بھلائیوں اور خوبیوں کی جڑ اور آنحضرت محبوب خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اسوۂ حسنہ ہی مرکز حیات اور ایمان و عرفان کا سرچشمہ و مشعل راہ ہے۔ اہل اللہ متقدمین و متاخرین نے امتِ محمدیہ میں سے جو کچھ بھی از روئے مدارج و مراتب پایا ہے۔ صرف اتباع رسول علیہ السلام ہی سے پایا ہے۔ صدیقیت، امامت، خلافت، فردیت، امارت، شہادت، غوثیت، قطبیت، ولایت اور ابدالیت سب کچھ اتباع رسول مقبول علیہ السّلام ہی کا نتیجہ و ثمرہ ہیں۔ جو شخص صحیح معنوں میں متبع رسولؐ نہیں وہ ہزار ولایت کے دعوے کرے اور کرامات کی ڈینگیں مارے، ہوا پر پرواز کر کے دکھائے اس کا ولی ہونا تو درکنار اس کی مسلمانی میں بھی شبہ کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ شعر

خلاف پیمبر کسے را گزید ہرگز نخواہد بمنزل رسید

اگر تم کسی کی ولایت کو پرکھنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے یہ دیکھو کہ وہ متبع رسول انام علیہ السلام ہے یا نہیں کیونکہ سنّت اور اسلامی تصوّف ہی فقر اور فقیر کی اساس ہیں۔ فی زمانہ لبعض منوبین الی التصوف میں یہ مرض عام ہوگیا ہے کہ ان کے نزدیک بدعت اور سنّت کا فرق ہی لاشئے ہے۔ اور ان کا مذاق یہ ہے کہ ایسے امور میں نزاع و اختلاف حقیقت ناشناسی سے ہے۔ سب کو توسیع خیالی سے کام لینا چاہئے۔ اور اس وسعت خیالی کے ماتحت اس گروہ نے اصطلاحات صوفیہ کا ایک جداگانہ فن بنا رکھا ہے۔ اور ایسی بے شمار لغو اصطلاحیں، بے معنی محاورے اور بعید از قیاس عبارات و جملے وضع کر لئے ہیں۔ جو صراطِ مستقیم سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔ اور وہ نہیں سمجھتے کہ یہ وسعت خیالی عوام کے لئے زہر۔ اہل حق کے لئے دشمنی اور متوسطین کو سنت کے خلاف نفرت کی آمادگی ہے۔ ایسے غالی متصوفین نے بدعات کو سنن و فرائض سے بڑھ کر جزو ایمان اور محبت خدا و رسول خدا کا نشان بنا رکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ لوگ تصوّف و صوفی کی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ یا حقیقی صوفیاء کے دستور العمل پر چلنے سے ان کے نفوس بھٹک گئے ہیں

جیسا کہ حضرت سیدنا غوث الثقلین شیخ عبدالقادر بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ طرفہ درویشاں پیدا شدند کہ راہ سنت وجماعت نے شناسند و عمر عزیز در منکرات و مسکرات میگذرانند و در خرابات نشستن وحرام خوردن حاصل زندگانی مے دانند و خود را مواحد و موصل میگویانند۔ یعنی عجیب ترین درویش پیدا ہوئے ہیں کہ سچا راستہ اور حقہ عقیدہ اہل سنت والجماعت کو نہیں پہچانتے۔ اور اپنی تمام پیاری عمر بری اور نشیلی چیزوں کی عادت و استعمال میں گذار دیتے ہیں۔ چنڈو خانوں اور میکدوں میں بیٹھنا اور لہو ولعب میں وقت کا ضائع کرنا اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے ہیں۔ اور پھر اپنے آپ کو توحید پرست اور واصل باللہ بزرگوں سے شمار کرلتے ہیں۔ اگر یہ تصوف اور صوفیاء کی حقیقت سے آشنا ہوتے تو یوں اپنے جہل واوہام سے غلو کو کام میں نہ لاتے اور اتباع سنت میں مستقیم رہتے۔

تصوف کیا ہے اور صوفی کون ہے؟

تصوف اور صوفی کی تعریف میں بڑے بڑے اولوالعزم بزرگوں نے ارشادات فرمائے ہیں۔ اور اپنے خیالات کے مطابق اظہار رائے کیا ہے۔ جن میں ہر ایک سے ایسی ایسی تعریف درج کتب پائی گئی ہے۔ جو تصوف کے صحیح مفہوم پر حاوی اور اس کے مطالب پر عام فہم بھی ہے۔ مثلاً حضرت ابو عبداللہ حضرمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ صوفی وہ لوگ ہیں۔ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۔ کہ جن باتوں کا خدا سے عہد کر چکے ہیں سچ کر دکھاتے ہیں۔ ان کے دل ہوا اور غیر کے اندیشہ سے خالی ہوتے ہیں۔

حضرت احمد بن سالم بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ صوفی وہ ہے جو زبان میں نرم حسن اخلاق میں بلند خندہ پیشانی، نفس کا سخی، عذر قبول کرنے والا اور اعتراض کم کرنے والا ہو۔ حضرت ابوبکر کسائیؒ فرماتے ہیں۔ صوفی وہ ہے جو بہت باتیں کہنے اور مقبول ہونے کی طلب سے پرہیز کرے۔

حضرت ابوبکر مزاہلی فرماتے ہیں اَلتَّصَوُّفُ حَالٌ تَضْمَحِلُّ فِيْهَا مَعَالِمُ الْاِنْسَانِيَّةِ۔ یعنی تصوف ایک حال ہے۔ جس میں انسانی آثار جاتے رہتے ہیں۔

حضرت واسطیؒ فرماتے ہیں۔ کہ جو شخص توحید کے مرتبہ تک نہیں پہنچا دراصل اس کا وجود خدا کے وجود میں فانی ہے۔ لیکن وہ جانتا نہیں۔ پھر اس فنا کا پالینا تصوف ہے۔

حضرت ابن ابی سعدان فرماتے ہیں۔ اَلصُّوْفِيُّ هُوَ الْخَارِجُ عَنِ النُّعُوْتِ وَالرُّسُوْمِ۔ یعنی صوفی وہ ہے جو

احوال و آثار کی تاثیر و تصرف سے نکل گیا ہو۔

حضرت ابو سعید اعرابیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اَلتَّصَوُّفُ کُلُّہٗ تَرْکُ الْفُضُوْلِ۔ تصوف تمام فضولیات کے ترک کرنے اور یگانگی کا نام ہے

حضرت بندار ابن حسینؒ فرماتے ہیں کہ تصوف عہد پر وفا کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو بات دل میں گزرے اس کیلئے کرے تو وہی کرے۔

حضرت ابو الحسین مصریؒ فرماتے ہیں۔ اَلصُّوْفِیُّ لَا یَنْزَعِجُ فِیْ اِنْزِعَاجِہٖ وَلَا یَقِرُّ فِیْ قَرَارِہٖ۔ یعنی صوفی اپنے اضطراب میں بیقراری نہیں کرتا اور اپنے قرار میں قرار نہیں پکڑتا۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔ اَلصُّوْفِیُّ الَّذِیْ لَا یُوْجَدُ بَعْدَ عَدَمِہٖ عَدَمِہٖ وَلَا یَعْدِمُ بَعْدَ وُجُوْدِہٖ یعنی صوفی وہ ہے کہ عدم کے معدوم ہونے پر موجود نہیں ہوتا۔ اور وجود کے بعد معدوم نہیں ہوتا۔

حضرت ابن خفیف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اَلتَّصَوُّفُ وُجُوْدُ اللّٰہِ فِیْ حِیْنَ الْغَفْلَۃِ۔ یعنی خدا کا وجود غفلت کے وقت میں ہو یہ تصوف ہے۔ یعنی لوگوں کی غفلت کے اوقات مثل کھانے پینے وغیرہ میں خدا کی یاد۔

حضرت شیخ ابو اسحٰقؒ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے سرکارِ مدینہ تاجدارِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ تو عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم تصوف کیا شے ہے؟ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اَلتَّصَوُّفُ تَرْکُ الدَّعَاوِیْ وَکِتْمَانُ الْمَعَانِیْ۔ یعنی تصوف دعووں کو ترک کر دینے اور مطالب کو چھپانے کا نام ہے۔

حضرت ابو عبد اللہ روذباریؒ فرماتے ہیں۔ اَلتَّصَوُّفُ تَرْکُ التَّکَلُّفِ وَاسْتِعْمَالُ التَّظَرُّفِ وَحَذْفُ التَّشَرُّفِ یعنی تصوف تکلف کو چھوڑنے اور پاکیزگی کا برتاؤ کرنے اور بڑائی کے دور کرنے کا نام ہے۔

حضرت ابو القاسم مقریؒ فرماتے ہیں۔ تصوف یہ ہے کہ تم کم از کم صالحین کے اپنے اور ان کے مشائخین کے حال کی تصدیق کرو۔

حضرت ابو محمد راسیؒ فرماتے ہیں۔ لَا یَکُوْنُ الصُّوْفِیُّ صُوْفِیًّا حَتّٰی لَا تُقِلَّہٗ اَرْضٌ وَّلَا تُظِلَّہٗ سَمَاءٌ وَّلَا یَکُوْنُ لَہٗ قُبُوْلٌ عِنْدَ الْخَلْقِ۔ یَکُوْنُ مَرْجِعُہٗ فِیْ کُلِّ اَحْوَالٍ اِلَی الْحَقِّ تَعَالٰی۔ یعنی صوفی اس وقت تک صوفی نہیں بنتا۔ جب تک کہ اس کو نہ زمین اٹھائے اور نہ آسمان سایہ کرے اور لوگوں کے نزدیک اس کی مقبولیت نہ ہو۔ بلکہ اس کا مرجع ہر حال میں حق سبحانہ تعالیٰ کی طرف ہی ہو۔

حضرت ابو الحسین سیروانیؒ فرماتے ہیں۔ اَلتَّصَوُّفُ تَرْکُ الْخَلْقِ وَاِفْرَاطُ الْہِمَّۃِ۔ یعنی تصوف خلقت

کے ترک اور ہمت کی زیادتی کا نام ہے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں۔ اَلصُّوْفِیَّۃُ مَعَ الْوَارِدَاتِ لَامَعَ الْاَوْرَادِ۔ یعنی صوفیاء واردات کے ساتھ ہوتے ہیں وظیفوں کے ساتھ نہیں ہوتے۔ صوفی مقامات وحالات سے گزر چکا ہوتا ہے۔ وہ سب اس کے زیر قدم اور اس کے حال میں جمع ہوتے ہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔ اَلتَّصَوُّفُ ھُوَالْخُلُقُ مَنْ زَادَ عَلَیْکَ بِالْخُلُقِ زَادَ عَلَیْکَ بِالتَّصَوُّفِ یعنی تصوف خلق ہی کا نام ہے۔ جس کا خلق بڑھکر ہے وہ تصوف میں بڑھکر ہے۔

حضرت ابوالقاسم امام محمد قشیریؒ فرماتے ہیں۔ مَثَلُ الصُّوْفِیْ کَمَثَلِ الْبِرْسَامِ اَوَّلُہٗ ہَذَیَانٌ وَّاٰخِرُہٗ سُکُوْنٌ فَاِذَا تَمَکَّنْتَ خَرَسْتَ۔ یعنی صوفی کا حال برسام والے کی طرح ہے شروع اس کا بکواس اور آخر اس کا سکون ہے پس جب قرار پکڑتا ہے۔ تو گونگا ہو جاتا ہے۔

حضرت غوث الاعظمؒ یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ تصوف قلب کو اس کی تمام کدورتوں سے صاف کرنے کا نام ہے۔ اور صوفی میں یہ آٹھ اوصاف جو آٹھ انبیاء علیہم السلام سے وابستہ ہیں ضروری پائی جانی چاہئیں تب کہیں صوفی صوفی بنتا ہے۔ ۱ فقر سرکار دو جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ۲ سخاوت ابراہیم علیہ السلامؑ سے ۳ صوت موسیٰؑ سے ۴ سیاحت عیسیٰؑ سے ۵ صبر ایوبؑ سے ۶ تضرع یحییٰؑ سے ۷ رضا اسحٰقؑ سے ۸ مناجات ذکریاؑ سے۔ اللہ اللہ کیسی عجیب ترین باریکیاں اور کیسے پاکیزہ ترین الفاظ ہیں۔ اگر یہ تصوف کے مدعی اپنی حقیقت کو متقدمین کے آئینہ میں دیکھتے۔ تو ایک دم میں خاک سے بر سر افلاک پہنچتے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی روح حیات حاصل کر لیتے۔ کیونکہ لزوم پرہیزگاری وتقویٰ اور اتباع سنت نبوی علیہ السلام ہی ہلاکت سے نجات پانے کا واحد ذریعہ ہے۔ اولوالعزم بزرگان دین نے فرمایا ہے۔ کہ درویش کو چاہئے کہ پرہیزگاری کو لازم پکڑے ورنہ ہلاکت اس کے گلے سے چمٹی ہوئی ہے۔ اور اس سے کبھی خلاصی نہیں پا سکتا۔ جب تک اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کو نہ ڈھانک لے۔

حدیث شریف میں ہے کہ تحقیق دین کا مدار پرہیزگاری اور تقویٰ پر ہے اور بربادی اس کی طمع سے ہے۔ اور تحقیق جو کوئی چراگاہ کے گرد گھومے گا۔ جلدی ہی اس میں پڑ جائیگا۔ جیسے کہ زراعت کے گرد جو جانور گھومتا ہے۔ نزدیک ہی اس کی طرف منہ پھیلا دیتا ہے۔ اور زراعت اس سے سلامت نہیں رہتی۔ حضرت فاروق اعظم سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے

فرمایا ہے۔ کہ ہم حرام میں پڑنے کے خوف سے حلال کے بھی نو حصے چھوڑ دیتے تھے۔ اور یہ کام حرام کی نزدیکی سے پرہیز کے واسطے کرتے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل کرنے کے واسطے کرتے تھے۔ جو حضورؐ نے فرمایا کہ خبردار ہو۔ بادشاہ کے واسطے چراگاہ ہے۔ اور اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں۔ پس جو کوئی ان کے گرد آئے گا۔ تھوڑی دیر کو اس میں پڑ جائے گا۔ پس جو کوئی بادشاہ کے قلعہ میں داخل ہو کر ایک دروازہ سے بڑھ جائے پھر دوسرے سے، پھر تیسرے سے، یہاں تک اس کے داخلی دروازہ کے قریب ہو جائے۔ وہ اس سے بہتر ہوتا ہے۔ جو اس سے پہلے دروازہ پر جو میدان سے متصل ہے کھڑا رہے۔ پس اگر اس سے تیسرا دروازہ بند کیا جائے تو اس کو کچھ تکلیف نہ دے گا۔ نیز حضور سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ کہ آخرت کو اپنا راس المال مقرر کر اور دنیا کو اس کا نفع سمجھ۔ پہلے اپنے وقت کو آخرت حاصل کرنے میں خرچ کر اور آخرت کو دنیا سے بیچ ڈالنے والا نہ بن اور نہ اپنے نفس کا غلام اور گھوڑا ہو۔ کیونکہ تجھے اس پر سوار ہونے۔ اسکی اصلاح کرنے، اسکو نرم کرنے اور اس پر سوار ہو کر زادِ آخرت جمع کرنے کا حکم ہوا ہے۔ اگر تو نے اسکی باگ اس کے سپرد کر دی۔ اور اس کی شہوتوں اور لذتوں میں اس کی پیروی کی اور اس کی ہوا سے موافقت بنائی تو دین و دنیا کی بھلائی تیرے ہاتھ سے جاتی رہے گی اور تو دونوں جہانوں میں ٹوٹا اور خسارہ پانے والا ہو جائے گا۔ اور ایسی حالت میں تو سب لوگوں سے زیادہ مفلس اور دین کے نقصان والا ہوگا۔ اور یاد رکھ نفس کی پیروی کرنے سے بھی دنیا میں اپنے نصیب سے زیادہ نہ پا سکے گا۔ اگر تو اس کو آخرت کے رستہ پر چلائے اور آخرت کو اپنا راس المال بنائے گا تو تجھ کو دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی ہوگی۔ جیسا کہ آنحضرت سرورِ کائنات مفخرِ موجودات مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی نیت پر دنیا تو دے دیتا ہے مگر دنیا کی نیت پر آخرت نہیں دیتا۔ اور اسی طرح ہونا بھی چاہیئے۔ کیونکہ آخرت کی نیت اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور نیت عبادت کی روح اور اسکی ذات ہے۔ پس جب تو نے دنیا سے بے رغبتی برتی اور آخرت کی طلب کی جس سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی نیت مترشح ہو، تو اللہ تعالیٰ کے خاص لوگوں اور اس کی محبت اور بندگی کرنے والوں میں سے ہو جائے گا۔ جس سے تجھ کو آخرت بھی حاصل ہو جائے گی اور دنیا میں بھی سرفرازی ہوگی۔ دنیا تیری تابعدار اور خادم بن جائے گی۔ اور اللہ کریم تیرا نصیب پورا فرما دیگا۔ کیونکہ یہ سب کچھ اسی کا ہے۔ جسے چاہے، جب چاہے اور جتنا چاہے عطا فرما سکتا ہے

جب بندہ اس کا ہوجاتا ہے تو اس کی کائنات اس کے بندے کی ہوجاتی ہے۔ اس لئے کہ محبوب و محب میں میرا تیرا نہیں ہوتا اور عاشق کی ساری کائنات معشوق کی ہوتی ہے۔ حضرت سعدیؒ نے بوستان میں کیا خوب ایک حکایت بیان فرمائی ہے۔

حکایت

یکے دیدم از عرصۂ رودبار — کہ پیش آمدم بر پلنگے سوار
چناں ہول زاں حال بر من نشست — کہ ترسیدنم پائے رفتن ببست
تبسم کناں دست بر لب گرفت — کہ سعدی مدار آنچہ دیدی شگفت
تو ہم گردن از حکم داور مپیچ — گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

ترجمہ:۔ فرماتے ہیں۔ کہ رود بار کے میدان میں میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ چیتے پر سوار ہو کر میرے سامنے آیا اس کو دیکھ کر مجھ پر ایسا خوف طاری ہوا۔ کہ میرے پاؤں چلنے سے رہ گئے۔ چیتے کے سوار نے مسکرا کر ہاتھ ہونٹوں پر رکھا۔ اور فرمایا کہ سعدی! جو کچھ تو نے دیکھا ہے اس پر تعجب نہ کر۔ تو خدا کے حکم سے گردن نہ پھیر۔ کوئی بھی تیرے حکم سے گردن نہ پھیرے گا۔

اگر انسان دنیا میں اس حد تک مشغول ہو جائے کہ کلیتہً آخرت سے روگردانی کرنے لگے تو رب العلمین اس پر ایسا غضب کرتا ہے۔ کہ آخرت اس کے ہاتھ سے ویسے نکل جاتی ہے۔ اور دنیا بھی اس سے سرکش و متنفر ہوجاتی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی۔ یعنی جو شخص اللہ کے ذکر سے منہ موڑے گا۔ اس پر اس کی معیشت تنگ کر دی جائیگی اور قیامت کو وہ نابینا اور اندھا اٹھایا جائیگا۔ کیونکہ دنیا اللہ کریم کی مملوک ہے۔ جو اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ وہ اس کو ذلیل و خوار کرتی ہے۔ اور جو رب العزت کے حکموں کی اطاعت کرتا ہے وہ اسکو عزت دیتا ہے۔ پس اس وقت حضور سرکار سرورِ کائنات مختارِ ہستی جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ثابت ہوجائے گا کہ دنیا و آخرت دو سوتیں ہیں۔ جب آدمی ایک کو راضی کرتا ہے تو دوسری ناراض ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی دنیا چاہتا ہے اور کوئی آخرت۔ اس سے مراد دنیا کے اور آخرت کے بیٹے ہیں۔ پس آدمی کو

خود دیکھنا چاہئے کہ وہ کس کے بیٹوں میں سے ہے۔ اور دونوں گروہوں میں سے کس گروہ میں ہونا چاہتا ہے۔ یا ہو چکا ہے۔ تاکہ اس کو اپنا مستقبل سامنے آسکے۔

پھر ایک حدیث شریف کے ارشادِ نبوی پر بھی غور کرے جو حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ مولا کی طلب کرنے والا مرد ہے اور عاقبت کی طلب کرنے والا مؤنث اور دنیا کی طلب کرنے والا مخنث ہوتا ہے۔ پھر مؤنث اور مخنث بننے سے بہتر ہے کہ مرد بنے۔ اور دوسرے فریق میں جانا چاہتا ہے تو مخنث بننے سے بچے۔ کیونکہ دین و دنیا میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

حکایت

ایک مردِ خدا نے خواب میں دیکھا کہ ایک نوجوان کنواری عورت اس کو اپنی جانب دعوت دے رہی ہے۔ اس مردِ خدا نے پوچھا کہ تو کون ہے۔ اور مجھ سے تیری کیا طلب اور حاجت ہے۔ اس نے عرض کیا۔ حضرت میں دنیا ہوں اور اپنے نفس کے لئے آپ کو چاہتی ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تو بتا کہ اس قدر تیرے خاوند اور چاہنے والے دنیا دار موجود ہیں۔ پھر تو کنواری نظر آتی ہے۔ اس کا کیا سبب ہے۔ کہنے لگی۔ سبب کوئی ایسا نہیں جو سمجھ میں نہ آسکے۔ سب مرد تو خدا کی جانب چلے گئے اور نامرد میرے حصے میں آئے۔ اس لئے میں کنواری ہوں۔

ترکِ دنیا کا مفہوم

زہد و تقویٰ کی وہ تعلیم اور ترکِ دنیا کی وہ دعوت جو صوفیائے کرام، درویشانِ عظام و بزرگانِ نام رحمہم اللہ کے ارشادات و عملیات میں ملتی ہے اور ان کے تمام علوم و تذکار میں پائی جاتی ہے اس سے بعض دین کے بھاگے ہوئے۔ دنیا کے ٹھکرائے ہوئے اور ہمت کے راندے ہوئے نام نہاد فقیروں نے بڑا غلط مفہوم لیا ہے۔ اور وہ سب بیوی بچے، مال و دولت، املاک و مکانات، وطن و خانہ داری چھوڑ کر اس امر پر معتقد ہو بیٹھے ہیں کہ جب تک ہم اس دنیا کو چھوڑ کر کنارہ کش نہیں ہوں گے۔ معرفت الٰہی سے کوسوں دور ہی رہیں گے۔ اور خداوندِ عالم کی شناسائی نہیں ہوگی۔ حالانکہ یہ وہ جوگیوں اور راہبوں کا عقیدہ ہے جو پیچھے ذکر ہو چکا ہے۔ اور بزرگانِ دین کے ارشاد ترکِ دنیا سے مراد دنیا کے تعلقات کو قطع کر دینا نہیں۔ بلکہ اس سے مراد جہاد بالنفس ہے۔ یعنی تعلقات دنیوی رہیں۔ مگر وہ خدا کی جگہ دل میں نہ اتر جائیں۔ اور یہی شاہراہِ حقیقت ہے۔ مگر افسوس کہ یہ لوگ اس مطلب کو سمجھ نہیں سکے

اور نہ ہی ان کو لَا رَھبَانِیَۃَ فِی الْاِسْلَامِ کی حقیقت ذہنوں میں آئی ہے

نقیرے پسرِ خود را گفت پندے | کہ راہبانی بدینِ ما حرام است
بہ عشق آویز و از دنیا بہ پرہیز | کہ طلبِ ما بمجوبے مدام است

اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لنگوٹ بند ملنگ اور سادھو بن جاؤ۔ جس طرح اہلِ ہنود یا عیسائی لوگوں میں رواج ہے۔ بلکہ اسلام تو دنیا میں رہنے، کھانے، پینے، پہننے، بیوی سے حظ اٹھانے اور بچوں سے پیار کرنے، حتیٰ کہ سلطنت تک کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کی اجازت فرماتا ہے۔ مگر ہدایت صرف یہ ہے کہ تخت و تاج پاکر بھی اس کا دل یادِ خدا کے لئے خالی ہو۔ دُنیا اس کے دل پر پنجہ نہ مارے۔ اور خدا کا مقام اپنے اثرات سے ناپاک نہ کردے۔ کسی درویش سے لوگوں نے پوچھا کہ دنیا کا منافع درویش کے لئے کس قدر ہے۔ فرمایا۔ کہ اسی قدر جیسے پانی پر اڑنے والا جانور پانی پر اڑتا ہے اور چکر کاٹتا رہتا ہے۔ پھر جب مچھلی نظر آتی ہے تو غوطہ لگا کر اس کو پیٹ کے لئے پکڑ بھی لیتا ہے۔ لیکن غوطہ لگانے اور نفس کی خوراک حاصل کر لینے کے بعد وہ پانی سے ایسا صاف نکلتا ہے کہ اس کے پروں پر پانی کا قطرہ تک نہیں ہوتا۔ ایسے ہی درویش کی زندگی ہونی چاہئے۔ دنیا میں رہے۔ قُوتِ لَا یَمُوت حاصل کرے۔ تخت و تاج اس کے قدم چومیں۔ مگر جب دُنیا سے سفر کرے تو اس کا دل دنیا کی آلائش اور داغ سے پاک ہو۔

یہاں یہ مسئلہ بھی یاد کے قابل ہے کہ صوفی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کو ابن الوقت کہا جاتا ہے جو مجذوب و مست ذوق و شوق اور وجد و تواجد کے تابع اور بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ دوئم ابوالوقت جو ہر حال میں وقت پر حاکم و متصرف اور ہوش و صحو کی حالت میں رہتے ہیں۔ اگرچہ ان پر بھی غلبہ ہوتا ہے۔ مگر یہ مغلوب نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا درجہ صوفی ابن الوقت سے بہت بلند ہوتا ہے۔ اور یہ مغلوب الحالی بھی ایک مقام سے متعلق ہے۔ جس میں تمیز حال و جلال، حرام و حلال و حفظِ مراتب، پابندئ شریعت و مذہب و ملّت نہیں رہتی۔ اور اکثر اہل اللہ نے اسکو واصلوں کاملوں کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اس میں درویش پر سُکر غالب ہو جاتا ہے اور وہ فرق حلال و حرام و کفر و اسلام سے مستثنےٰ کہلاتا ہے۔ عبودیت اُٹھ جاتی ہے۔ مواصلت بڑھ جاتی ہے اور تعمیل شریعت ساقط ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ ابوالمعالی خیرالدین لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ

مونس جماں میں شیخ لقمان سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ لکھتے ہیں۔ کہ شیخ لقمان سرخسی علیہ الرحمۃ اللہ ابتداء حال میں بہت مجاہدہ اور سخت احتیاط فرمایا کرتے تھے۔ لیکن کچھ وقت کے بعد اچانک آپ کو جذبہ ہوا اور عقل جاتی رہی۔ پھر کسی خاص وقت میں لوگوں نے پوچھا کہ وہ پندوقال کیا تھا۔ اور یہ وجد وحال کیا ہے۔ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ میں جس قدر زیادہ عبادت کرتا تھا اسی قدر اور کرنی باقی رہتی تھی۔ ایک روز میں نے تھک کر اللہ کریم سے عرض کی۔ کہ اے معبود لایزال جل وعلا شانک۔ شعر

رسمیت کہ مالکان تحریر آزاد کنند ، بندۂ پیر

یعنی اے مولا کریم یہ رسم ہے کہ ملوکوں اور غلاموں کے مالک اپنے بوڑھے غلاموں کو اپنی خدمت ومشقت سے آزاد فرما دیا کرتے ہیں۔ تو شہنشاہ ہے اور میں تیری بندگی میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ اب مجھے آزاد فرما دے۔ تب میرے مولا کریم نے مجھے فرمایا کہ اے لقمان میں نے تجھکو آزاد فرمایا۔ لہٰذا اب میں یہ ہوں جو دیکھ رہے ہو۔

مگر غلبہ حال کے ظہور سے پہلے اسلام اور کفر کے درمیان تمیز نہ کرنا جس طرح اہل شرع کے نزدیک کفر ہے۔ اسی طرح اہلِ حقیقت کے نزدیک بھی کفر ہے۔ اگر اہلِ شریعت اور اہلِ طریقت کے درمیان کچھ اختلاف ہے تو غلبہ حال کی صورت میں ہے جیسے کہ منصور حلاج کو مغلوب الحال تھا۔ اہلِ شریعت نے اس کے متجاوز عن الحد اور گمراہ ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ لیکن اہلِ حقیقت نے نہیں دیا۔ ہاں۔ اہلِ حقیقت کے نزدیک بھی نقصان اسکی طرف ضرور عائد ہوتا ہے۔ اور اہلِ حقیقت، اس کو کاملین سے شمار نہیں کرتے۔ الغرض غلبہ حال کے ظاہر ہونے سے پہلے صاحبان حال کی تقلید کرنا اور اس میں تمیز نہ کرنا قطعاً بے تمیزی ہے اور شریعت وحقیقت میں زندقہ وکفر ہے۔ پھر اگر کسی صوفی نے غلبۂ حال کی وجہ سے بے اختیارانہ طور پر ہر قسم کی ظاہری تمیز کو چھوڑتے ہوئے۔ دنیا کو ترک کر دیا تو یہ اس کی خداطلبی اور حق جوئی کا کمال ہے۔ جس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ فعل دوسرے ظاہر پرستوں کے لئے فرض وواجب یا ترک دنیا پر حجت ہوگا۔ دراصل زہد اور ترکِ دنیا سے مقصود تو یہ ہے کہ سالک اپنے دل سے ماسوائے اللہ کی محبت کے سب کچھ نکال دے۔ اور نفس سرکش کو زیر کر کے اس کے منہ میں تقویٰ کی لگام دیدے اگر یہ بات دنیوی تعلقات کو قائم رکھتے ہوئے بھی حاصل ہو جاتی ہے تو سبحان اللہ پھر دنیوی تعلقات کو منقطع کر کے منازل سلوک طے کرنے کی کیا ضرورت محسوس ہوگی۔ بلکہ اس سے بدرجہا بہتر اور زیادہ کمال یہ ہے کہ دنیوی تعلقات کو قائم رکھتے ہوئے معبود حقیقی کا قرب ووصال ڈھونڈا جائے جس میں رہبانیت کو دور کا بھی دخل نہ ہو۔

عندالضرورت یا غلبۂ حال سے ترک دنیا میں بھی حقیقت و معرفت کا وہ راز پنہاں ہے جو روحانی زندگی کا جوہر حقیقی کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا اور دین کی ہر کامیابی کا راز صرف نفس کشی میں مضمر ہے۔ اس کے برخلاف آرزو مندی و خواہش اور حرص و ہوا ہی دنیا و دین میں ذلیل و خوار کرتی ہے۔ مطالب و مقاصد دینی و دنیوی کے حصول میں روڑے اٹکاتی ہے۔ اور دنیا کو پریشانیوں اور غموں کا گھر بناتی ہے۔ کسی کا دل جس چیز یا ہستی کی طرف راغب ہو اور وہ اس رغبت کو دل میں جگہ دے دے تو بس یہی رغبت ناکامی و نامرادی کی بنیادی اینٹ ہے۔ کیونکہ جب محبوب چیز اور مطلوب ہستی نہیں ملتی یا مفارقت کرتی ہے۔ تو دل میں غم و اندوہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ جو موجب کلفت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف جس چیز کی آرزو و ہوا اور اس سے استغنا برتا جائے۔ تو دنیا میں غم و اندوہ کا سامنا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے آگے ہفت اقلیم کی بادشاہت بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی پس جہاد بالنفس اور ترک دنیا کا مطلب یہ نہیں کہ بھوک لگنے پر کھانا نہ کھائے۔ پیاس لگنے پر پانی نہ پیئے سردی لگنے پر کپڑا نہ پہنے اور نکاح کی خواہش پر نکاح کرنے سے پرہیز کرے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ کام کیئے جائیں اور ضرور کیئے جائیں مگر ان کا لگاؤ تعلق الٰہی میں رکاوٹ نہ ہو۔ کیونکہ طالب بننے سے مطلوب اور محب بننے سے محبوب بننا بہتر ہوتا ہے۔ اور یہ وہ راز ہے کہ درویش اس دنیا میں صبر و تحمل، قناعت و شکر و تحمل و برداشت کے ساتھ زندگی گزارتے اور کسی خواہش کے پورا کرنے میں سرگرداں و حیران نہیں ہو سکتا

الغرض وہ شخص صوفی کہلانے کا مستحق اور درویشوں کے گروہ سے ہونے کا اہل نہیں۔ جس نے کتاب اللہ پر غور و خوض اور احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں فہم و بصیرت سے کام نہ لیا ہو۔ صوفی مشرب علماء کی صحبت سے ترک اور ان اہل اللہ و اصحاب حلم کی موانست و مجالست سے علیحدگی جن کو کتاب و سنت میں درک ہے ایک باریک سا نفسانی فریب ہے۔ کیونکہ جاہل صوفی اور تصوف کا منکر دونوں مذہبی چور اور مشربی راہزن ہیں جنہوں نے حقیقت نفس سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اور اگر وہ نفس کے اقسام و اعمال اور اس کے باریک ترین وساوس و خطرات کا علم رکھتے تو یوں بے بسی و بے عنوانی کی زندگی بسر نہ کرتے یہ انکی خود اختیاری عجوبہ پسندیاں اور مجموعۂ بدعات و منہیات، قدیم اسلامی سلوک و طریقت سے انکی دوری کا باعث بنتیں۔

فقر اور فقیر

آج مسلمانوں کا سمجھدار، تعلیمیافتہ، سنجیدہ اور حقیقت بین طبقہ چیخ اٹھا ہے۔ کہ نام نہاد، مکار اور فریبی پیروں نے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام اور ذلیل وخوار کر رکھا ہے۔ ان کا وجود اخلاق اور روحانیت کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ وہ تعید و تسفّل کے علمبردار اور ذمہ دار ہیں۔ ان کے سروں پر خدا کا نہیں بلکہ غیر خدا اور نفس کا سایہ ہے۔ قومی ترقی اور برتری کے وہ دشمن ہیں۔ آزادی سے ان کو نفرت ہے۔ اپنوں سے بیزار اغیار سے ملاپ۔ اسلام سے بے تعلقی اور تثلیث و کفر سے گہرا تعلق ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ الحب للّٰہ والبغض للّٰہ کی جگہ نفسانیت کی حب و بغض ہے۔ محبت الٰہی اور خوف خدا سے ان کے قلوب یکسر خالی ہیں۔ اور استبدادی طاقتوں سے ہر وقت وہ مرعوب ہیں۔ وہ فقر و تصوّف اور سجادہ و تقدس کا غازہ مل کر مسلمانوں کے ایمان و دولت پر ڈاکہ ڈالتے رہتے ہیں۔ اندریں حالات ضرورت ہے کہ سچے پیروں اور صحیح رہنماؤں کی تلاش کی جائے۔ تاکہ قوم کی صحیح رہنمائی ہو سکے۔ یہ آوازے کیوں کسے جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ عوام الناس نے بزرگی، درویشی اور ولایت کا مفہوم اپنی طرف سے الگ الگ گھڑ رکھا ہے۔ مثلاً کسی کے نزدیک بزرگ وہ ہے جو کرامت دکھلائے۔ کوئی اس کو ولی جانتا ہے۔ جو دنیا سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشینی اختیار کرلے۔ کوئی گفتگوئے مکاشفہ کو پسند کرتا ہے اور کوئی ولایت کا نشان لوگوں کی مرادیں پوری ہونا رکھتا ہے۔ اس لئے فقر و فقیری اس مسئلہ میں مستحق طعن نہیں ہیں۔ بلکہ فہم و عقل کی یہی کجروی اور گمراہی بھی مستحق لعن وطعن ہے۔ جس نے مسلمانوں کو صراط مستقیم سے ہٹا کر اغراض زندگی کی یافت اور حصول کے لئے صحیح و غلط کی پہچان سے دور جا پھینکا ہے۔ اور وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ہم اوہام و جہل کی تاریکی میں بزرگی کا تقدس کا نور کیونکر ڈھونڈ سکتے ہیں۔ جبکہ اس مسئلہ میں ہمارا معیار ہی غلط ہے۔ ان کو تو چاہئے تھا کہ وہ قرآن و حدیث کی ضیا پاشیوں میں کسی مرد خدا کی پاکیزہ حیات کا نور

اور اخلاق و روحانیت کی بلندیوں میں معرفتِ الٰہی کا ظہور پانے کی سعی کرتے۔ کیونکہ بہ ارشاد حضرت خواجہ ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ اَعْظَمُ الْعَلَامَاتِ فِیْ زَمَانِنَا شَیْئَانِ عَالِمٌ یَّعْمَلُ بِعِلْمِہٖ وَعَارِفٌ یَّنْطِقُ عَنْ حَقِیْقَتِہٖ یعنی بڑی علامات سے ہمارے زمانے میں دو چیزیں ہیں۔ وہ عالم باعمل جو اپنے علم کے ساتھ صحیح عمل بھی رکھتا ہو۔ اور وہ عارف جو حقیقت کی بنا پر بات کرتا اور بولتا ہو۔ مگر یہ نہیں ہوا کیونکہ جن کو اپنی ہی بصارت و بصیرت جواب دے چکی ہو۔ وہ کیونکر صحیح راہ تلاش کر سکتے ہیں۔ جبکہ لعن و طعن کا ذمہ دار وہ بجائے اپنی غلط بین نگاہِ انتخاب کے بغیر استثناء صحیح صلحا اور سچے فقراء کے عمل، فقراء جہال و پیران بجال کو دیکھ کر حقیقی فقراء کو مطعون کر لیتے ہیں۔ اور اپنی ہی غلطی سے جماعت کی جماعت پر زبان طعن کھولنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ دنیا میں ہمیشہ صادق و کاذب دونوں ہی قسم کے لوگ ہوتے چلے آئے ہیں۔ صادقین اپنے صدق کے ماتحت اور کاذبین اپنے کذب کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ پھر اگر کوئی کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ پر عمل نہ کرتے ہوئے کسی مکار کے جال اور فریبی کے جال میں جا پھنسے تو کیا یہ صادقین کا قصور ہے۔ یا متلاشی کی حقیقت ناشناسی اور بیگانہ نظری کا جس کو وہ اپنی انتہائی تحقیق اور اپنا سب سے بڑا کمال سمجھتا ہے اس کی اپنی ہی فہم و عقل کی پستی اور کور ذوقی نے اس کی خالص اسلامی ذہنیت مستقیم نظر اور غیر مخدوش دماغ پر قبضہ کر لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے۔ کہ آج اس کو تصویر کا ایک رُخ دیکھتے ہوئے کوئی مقبول بزرگ نظر نہیں آتا اور اس پر سب سے زیادہ اندھیر گردی یہ ہے کہ ہماری قومی آوازیں اخبارات وغیرہ بھی وہ طریق تشہیر و اشاعت اختیار کر چکے ہیں۔ کہ ان کے نزدیک جاہل و ناقابل پیروں کی پردہ دری تو فرض اور جزو ایمان بن چکی ہے (اور بنی بھی چاہیئے) مگر عوام کو حقیقت کی جانب متوجہ کرنے کی توفیق ان کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اور جن پر طعن کر رہے ہیں اصل حقیقت کے اغماض سے خود فہم و ادراک میں ان سے بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ان کی بدعقیدگی اس چیز سے مانع ہے کہ بزرگانِ دین سے لگاؤ کو جائز سمجھیں۔ یا ان کی نگاہ تفرقہ ساز و فتنہ پرداز کو کوئی برگزیدہ، سچا، متبع شریعت اور صحیح بزرگ نظر نہیں آتا۔ جس کی صداقت کا رنگ وہ بطالت پرستی کے مقابلہ میں پیش کر سکیں۔ کیا کوئی شخص اگر زید کو یہ کہدے کہ تیرا کان کتا لے گیا ہے۔ تو اسکو کتّے کے پیچھے دوڑنے کی بجائے پہلے اپنے کان کا ٹٹول لینا زیادہ مناسب نہیں تھا

حکایت

ایک بزرگ تبلیغ دین کے سلسلہ میں کہیں تشریف لے گئے، تو ایک شخص ان کی درویشی کا جائزہ لینے اور

پرکھنے کو لوہے کی تاروں کا بنا ہوا ایک گورکھ دھندا ان کے سامنے لے آیا اور کہنے لگا۔ اگر آپ فقیر ہیں تو اس گورکھ دھندے کو کھول دیجئے۔ فقیر صاحب نے جواب دیا کہ میں نے فقیر ہونے کا دعویٰ کیا ہے" لوہار ہونے کا نہیں کیا اصل بات یہ ہے کہ مدعی کو اس کے دعوے میں تو پرکھا نہیں جاتا۔ اور اس کی درویشی کی کسوٹی سمجھ لی جاتی ہے سٹے کا نمبر۔ مال حرام کا حصول، پرائی عورتوں کی دستیابی۔ مغویہ عورتوں کی نشان دہی۔ اموال مسروقہ کی خبر دہندگی مویشی کا اظہار گمشدگی، اولاد کا نہ ہونا اور عملیات حب و بغض کی کامرانی، تو بتلایئے کہ یہ کام ایک باخدا درویش کی دعوت میں شامل ہیں۔ اگر ہیں تو کہاں تک اور اگر نہیں تو اس کام کے کرنیوالے نجومی، رملی، ہتھکنڈی، جوگی مکار، بہروپئے جو بھی رنگ و روپ اختیار کر سکیں گے وہ وہ ہوگا جس کے شبہ میں عوام فریب کھا جائیں۔ اور وہ رنگ صرف حق پرستوں کا رنگ ہے۔ کیونکہ ان ضروریات کے متمنی درویشوں کے بجائے نہ ایڈیٹران اخبار کے پاس جائیں اور نہ بہروپیوں کے پاس۔ اس لئے کہ کوئی ایڈیٹر صاحب کسی سیاہ پوش سے مل کر اتنا تو کر سکتے ہیں کہ کسی موکل یا غیبی روح کا روپ دھار سکیں۔ مگر کسی مرد خدا کا روپ دھارنے سے وہ بھی قاصر رہتے ہیں۔ تو پتہ چلا کہ عوام الناس کو تحقیق میں مغالطہ لگتا ہے۔ اور اپنی مطلب براری کے لئے ان کا نفس ان کو ہر ایسے شخص کے روبرو لے جاتا ہے جس کو وہ تمیز نہیں کر سکتے کہ یہ کون ہے۔ کوئی جرائم پیشہ کا سرغنہ ہے جو اپنے افشائے جرم کے خوف سے درویشی وضع بنائے ہوئے ہے۔ یا کوئی کارسرکار کا ملازم ہے۔ جو مجرموں کی تلاش کے لئے اس رنگ میں آئے ہوئے ہے۔ کیونکہ ہر عیار و مکار، ہر فقیر صورت اور حقیر سیرت ان کو اپنے مطلب کے پیش نظر قطب زماں اور غوث دوراں ہی دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ ہر زرد چمکیلی چیز کو سونا سمجھتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ باخدا اولوالعزم حضرات کی غلطی نہیں بلکہ ان کی احولانہ نگاہ کی اپنی غلطی ہے۔

تعریف

فقیر یہاں پر مختلف بزرگان عظام کی تحریرات سے فقر و فقیر کی تعریف لکھتا ہے جس سے یہ پتہ چل جائے کہ فقیر کون ہوتا ہے۔ اور فقیر کس کو کہتے ہیں۔ یا خود اولوالعزم فقراء کے نزدیک اس درجہ کا اہل کون ہے۔ اور فقیر کو کن صفات سے موصوف ہونا چاہیے۔ قرآن کریم اور احادیث نبی رؤف و رحیم کو مطالعہ فرمایئے تو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کریم جلشانہ' اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک برگزیدہ بزرگ اور ولی، صوفی اور پیر وہ ہے، جو متبع شریعت ہو۔ جس کے اقوال اور افعال قرآنی معیار پر پورے اترتے ہوں

اور جسکی تعلیمات اور تلقینات قرآنی تعلیمات وہدایات کے مطابق ہوں - چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ - یعنی اے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور ڈھونڈو اسکی طرف وسیلہ اور جہاد کرو اس کی راہ میں (یا اس کی معرفت میں محنت وکوشش کرو) تاکہ تم فلاح کو پہنچو - آیت مذکورہ بالا میں کلمہ آمنوا کے متعلق قرآن وحدیث اور اتقوا اللہ میں جہاد امر ونواہی شامل ہیں - اور وابتغوا الیہ الوسیلۃ سے مراد بیعت یا پیر کامل ہے - اور جاھدوا سے جہاد اور ریاضت ومجاہدہ نفس اور سبیلہ سے راہ معرفت الٰہی مراد ہے - یعنی پیر کامل سے بیعت کرکے بارشاد مرشد حصول معرفت الٰہی کے لئے ریاضت ومجاہدہ میں مشغول ہو جاؤ - تاکہ دیدار الٰہی سے جو فلاح ابدی ہے مشرف ہو - پس جو شخص بیعتِ مرشد کا منکر ہے - وہ نص قطعی کا منکر ہے - اس حقیقت عظمیٰ کے ماتحت کسی عقیدتمند غلام نے حضور غوث الاعظم محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے فقیر کے معنی پوچھے تو آپ نے فرمایا کہ فقیر کے نام میں چار حرف ہیں - جن کی اپنی توضیح وتاویل فقر کی صحیح ترجمانی کرتی ہے - اور پھر آپ نے اس کے معنی بیان فرماتے ہوئے یہ اشعار پڑھے :-

فَاءُ الْفَقِیْرِ فَنَاءُہٗ فِیْ ذَاتِہٖ — وَفَرَاغُہٗ مِنْ نَعْتِہٖ وَصِفَاتِہٖ
وَالْقَافُ قُوَّۃُ قَلْبِہٖ بِحَبِیْبِہٖ — وَقِیَامُہٗ لِلّٰہِ فِیْ مَرْضَاتِہٖ
وَالْیَاءُ یُرْجُوْ رَبَّہٗ وَیُخَافُہٗ — وَیَقُوْمُ بِالتَّقْوٰی بِحَقِّ تُقَاتِہٖ
وَالرَّاءُ رِقَّۃُ قَلْبِہٖ وَصَفَائِہٖ — وَرُجُوْعُہٗ لِلّٰہِ عَنْ شَھَوَاتِہٖ

ترجمہ - یعنی فائے فقیر سے مراد فنا فی اللہ ہو کر اپنی ذات وصفات سے فارغ ہو جانا ہے - اور قاف فقیر سے مراد یاد الٰہی سے اپنے دل کو قوت دینا اور ہمیشہ اس کی رضامندی پر قائم رہنا ہے - اور ی سے مراد یاس ونا امیدی سے دور رہ کر امیدوار رحمت الٰہی ہونا اور اس سے ڈرتے رہنا، اور ایسی پرہیزگاری اور تقویٰ اختیار کرنا جیسا کہ اس کا حق ہے - اور ر سے مراد رقتِ قلب اور اس کی صفائی اور اپنی خواہشات سے منہ موڑ کر رجوع الی اللہ کرنا ہے -

شیخ ابو عبداللہ خفیفؒ فرماتے ہیں - اَلْفَقْرُ عَدَمُ الْاَمْلَاکِ وَالْخُرُوْجُ عَنْ اَحْکَامِ الصِّفَاتِ

یعنی فقیر وہ ہے جو کسی چیز کا مالک نہ ہو اور صفات کے احکام سے نکل جائے۔ (یعنی اس میں ملک کی تمنا ہی باقی نہ رہے)

شیخ محسن فرماتے ہیں۔ الفقیر الذی من استفیضیٰ نفسہ فی فقرہ تقربًا الخ یعنی فقیر وہ ہے کہ اپنے نفس کو فقر میں خدا کے تقرب کیلئے صاف اور پسند کرے۔ اور اسکے اقسام و عادات کو بزرگان دین کے ارشادات کے ماتحت یوں جانے کہ آدمی کا نفس ایک ایسی شے ہے۔ جس کو تین حالتیں عارض ہوا کرتی ہیں۔ یعنی اگر اسکو عالم علوی کی جانب میلان ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی بندگی اور عبادت میں مزہ لیتا ہے۔ اور شریعت کے اتباع میں آرام و آسائش پاتا ہے تو اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ اور اگر عالم سفلی کی جانب مائل ہو کر شہوات و مستلذات، بیدردی و بے رحمی، حصول انتقام اور کینہ کیشی کی خواہش کر کے شریعت کی تابعداری سے کوسوں بھاگتا اور معائب کی خواہش کرتا ہے۔ تو اسکو نفس امارہ بولتے ہیں۔ کیونکہ وہ روح کو ہمیشہ برائی میں ملوث کر کے عصیان و طغیان کا حکم کرتا رہتا ہے۔ اور اگر کبھی عالم سفلی کی طرف مائل ہو کر شہوت و غضب میں آلودہ ہوتا ہو۔ اور کبھی عالم علوی کی جانب میلان میں لذت محسوس کرتا اور گناہوں کی عادت پر نفرین و ملامت کر کے گذشتہ اعمال بد پر ندامت و پریشانی کا احساس رکھتا ہو۔ تو اسکو نفس لوامہ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ کہ ہر نفس خواہ نیک ہو یا بد قیامت کے دن اپنے آپ کو ملامت کرنے والا ہوگا۔ اگر نیک ہے۔ تو اس بات پر ملامت کرے گا۔ کہ افسوس تو نے اور زیادہ نیکی کیوں نہ کی۔ اور اپنے قیمتی اوقات کو کیوں رائیگاں گنوایا۔ اگر بد ہے تو یوں ملامت کرے گا۔ کہ تو نے کیوں تقویٰ کو ترک کیا۔ اور کیوں گراں بہا عمر کے موتیوں کو بدعملی کی خاک میں ملایا۔ دنیا میں تقویٰ سے نفرت کرنا اور عبادت الٰہی سے بے رغبت ہونا قیامت کے دن ذلیل و خوار کرے گا۔ بعض بزرگان دین نے کہا ہے کہ نفس لوامہ سے متقیوں کے نفوس مراد ہیں۔ جو قیامت کے دن نفوس عامیہ کو ترک تقویٰ پر ملامت کریں گے۔ اور بعض مفسرین نے تحت آیت لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ لکھا ہے کہ ہر آدمی کے جسم میں تین نفس ہیں۔ ایک نفس مقدس جسے روح الٰہی کہتے ہیں۔ یہ نفس ہمیشہ ذکر الٰہی کے ساتھ مطمئن رہ کر خداوند عالم جلشانہٗ کی بندگی میں مستغرق رہتی ہے۔ دوسرے نفس منطبعہ جو ہمیشہ بدن کی تدبیر میں لگا رکھے اور مقتضیات شہوات و لذات کی بالطبع جویاں ہو۔ اس لئے اس کو امارہ بھی کہتے ہیں۔ تیسرے نفس ناطقہ

جو ظاہری اور باطنی حواس سے علم وادراک کو جمع کر کے روح کے آگے پیش کیا کرتی ہے۔ اور اسکو نفس ملہمہ کہتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ نفس مطمئنہ کا تعلق ان انبیا علیہم السلام اور اولیاء کاملین واصفیاء واصلین سے ہے۔ جو خدا کے ذکر محبت میں مطمئن رہتے۔ اور وساوس وخطرات کی کشاکش سے مخلصی پا جاتے ہیں۔ اور نفس ملہمہ صلحائے مومنین اور نیکو کاروں سے متعلق ہے۔ اور نفس لوامہ ان تائب گنہگاروں اور نادم تقصیر داروں کا نفس ہے جو ذرا سی لغزش سرزد ہونے پر بھی اپنے آپ کو شدید ملامت کر کے ہمیشہ کے لئے اس فعل بد سے توبہ کر جاتے ہیں۔ اور نفس امارہ کفار و فجار اور شریں ناہنجار کا نفس ہے۔ جو ہر لحظہ معصیت کا طالب اور فسق و فجور پر غالب رہتا ہے۔

حضرت اعظمیؒ فرماتے ہیں الفقیر ھو الفاقد الاشیا۔ یعنی فقیر وہ ہے جس کے پاس کوئی شے نہ ہو۔

شیخ ابو جعفر احمد بن حمدانؒ فرماتے ہیں الفقیر من انقطع الی اللہ علی الحقیقۃ ان لا یرد علیہ ما یشغلہ عنہ۔ یعنی فقیر وہ ہے کہ اس پر وہ باتیں نہ آئیں جو اس کو خدا کے ہاں سے روک دیں۔

حضرت ابو بکر بن ابی سعدانؒ فرماتے ہیں الفقیر ھو الفاقد الطریق الاسباب فقد السبب اوجب لَہٗ اِسْمَ الْفَقْرِ وَ مُسْتَھِلٌ لَہٗ الطَّرِیْقِ اِلَی الْمُسَبِّبِ۔ یعنی فقیر وہ ہے جو اسباب سے ہاتھ نکال لے۔ سبب سے گزر جانا فقر کے نام کا موجب ہے۔ پھر اس کو مُسَبَّب سے مُسَبِّب کی جانب راستہ آسان ہو جاتا ہے۔

حضرت منظفر کرمانشاہیؒ فرماتے ہیں۔ فقیر وہ ہے کہ خدا کی طرف اسکی کوئی حاجت نہ ہو۔ کیونکہ اس کی تمام حاجت وہ خود ہی ہے اور بس۔

عبداللہ لبانؒ فرماتے ہیں۔ کہ فقیر وہ ہے جو کسی سے رنجیدہ نہ ہو۔ کیونکہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔

ابو عبداللہ تروغندیؒ فرماتے ہیں اَلْفَقِیْرُ الَّذِیْ لِمَنْ لَمْ یَکُنْ لَہٗ وَسِیْلَۃٌ اِلَیْہِ غَیْرُہٗ یعنی فقیر وہ ہے جس کا وسیلہ خدا کی طرف اس کے سوا اور کوئی نہ ہو۔

حضرت مقری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اَلْفَقِیْرُ الصَّادِقُ الَّذِیْ لَا یَمْلِکُ کُلَّ شَیْءٍ وَلَا یَمْلِکُ لَہٗ شَیْءٌ سچا فقیر وہ ہے کہ کسی شے کا مالک نہ ہو اور اس کا کوئی مالک و وارث نہ ہو۔

حضرت عبداللہ دینوریؒ فرماتے ہیں کہ فقیر وہ ہے کہ خدا خود اس پر سلام بھیجے۔ اور فقراء ہی دین و دنیا کے بادشاہ ہیں جو خوشی کی جانب جلدی دوڑ گئے ہیں۔

حضرت ابو منصور معمرؒ فرماتے ہیں الفقیر عزیز یعنی فقیر معزز و غالب ہوتا ہے۔

حضرت شیخ گورگانیؒ فرماتے ہیں کہ فقیر وہ ہے جو کپڑے کو درست پیوند لگا سکے۔ یعنی فقر کے لئے نہ زینت کیلئے اگر اُلٹا سیا جائے تو سیدھا ہی سمجھا جائے (۲) سچی بات کہے اور سنے یعنی حال سے سنے نہ خودی سے۔ اور حق و سعی سے اس میں تصرف کرے، نہ خوش طبعی سے (۳) سیدھا پاؤں زمین پر رکھے یعنی وجد کے ساتھ زمین پر مارے نہ لہو کے ساتھ۔

حضرت عبداللہ مختارؒ فرماتے ہیں۔ کہ فقیر وہ ہے کہ اس کے تمام ظاہری اعمال و اقوال شریعت کے مطابق ہوں اور باطن میں ایسا ہو کہ اس میں غیر کی بو نہ پائی جائے۔

حضرت خواجہ محمد پارساؒ فرماتے ہیں کہ فقیر شرع کی پابندی سے فقیر بنتا ہے۔ اس کے کھانے میں اوسط درجہ کی محافظت ہوتی ہے۔ وہ دو عشاؤں کے درمیان سوتا نہیں۔ اور صبح اس قدر پہلے اٹھتا ہے کہ اس پر کسی کو اطلاع نہیں ہوتی توجہ سے اپنی طرف ہونا اور خطرات کی نفی کرنا اور فضول باتوں سے سکوت کرنا اور اس کا شیوہ ہوتا ہے ؛

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ فقیر وہ ہے کہ اگر کبھی نظر کرم فرما دے تو پچھلوں کو پہلے سے ملا دے۔ ان برت عین من الکرم الحقت الاحقین بالسابقین۔ یعنی اگر کرم کی نظر ظاہر ہو جائے تو مایوسوں کو مقبولوں کے ساتھ (پچھلوں کو آگے جانے والوں کے ساتھ ملا دے)

شیخ سعد الدین کاشغریؒ فرماتے ہیں کہ فقیر وہ ہے کہ جس کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی نہیں اس سے وہ مرزد نہ ہو۔ اور جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہوا۔ اس میں نہ پایا جائے اور صفات نبویہ سے موصوف ہونے کے سبب حق سبحانہٗ تعالیٰ کے تصرف کا مظہر بن جائے اور خدائی تصرف سے مستعد لوگوں کے باطن میں تصرف کرے اور اپنے آپ سے پورے طور پر خالی ہو کر حق سبحانہٗ تعالیٰ کے مقصود کے لئے کھڑا ہو جائے۔

حضرت عین القضاۃؒ فرماتے ہیں۔ کہ فقیر وہ ہے۔ جو علوم ظاہری و باطنی سے بے بہرہ نہ ہو۔ جاہل اور بے علم فقیر ہر حالت میں شیطان کا ظل ہوتا ہے۔ اور اس سے ہر لحظہ خلافِ شریعت حکم پہنچنے کا امکان رہتا ہے۔

شیخ مجد الدین بغدادیؒ فرماتے ہیں۔ فقیر وہ ہے۔ جس کو سوائے متابعت حبیب مطلق صلی اللہ علیہ وسلم اور کچھ پسند نہ آئے۔ اور جس فقیر کو حضور علیہ السلام کی متابعت بڑھکر ہے وہ درجہ میں سب سے بڑھکر ہے

حضرت اسحٰق محمد دہقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ فقیر وہ ہے جس کو دنیا اور اپنے نفس کی لذت سے کچھ بھی میلان نہ ہو۔ اور وہ چیز جو نفس کے مزہ کے متعلق ہے اس کی زبان سے بصورت طلب وتمنا نہ نکلے نیند سے پیار نہ رکھے اور دوائی پر دفعیۂ مرض کے متعلق شافی ہونے کا گمان نہ کرے۔

شیخ ابو الحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں کہ فقیر وہ ہے جس میں یہ چار وصف پائے جائیں۔ چھوٹوں پر رحم۔ بڑوں کی تعظیم، نفس سے انصاف چاہنا اور اپنے لئے انصاف کو چھوڑ دینا۔ جس فقیر میں یہ نہ ہوں وہ مٹی ہے۔

فقیر مؤلف کتاب ہذا ابو الفیض قلندر علی سہروردی کہتا ہے کہ فقیر وہ ہوتا ہے جو مرید کو اپنی توجہ وتصرف سے حضور میں تو مطمئن رکھے اور غیبت میں فتنہ نفس سے محفوظ کرے۔ اپنے اخلاق واسباق سے ارادتمند کی ایسی تربیت کرے کہ اس کے باطن کو اپنی توجہ سے مشرف اور اپنے نور اشراق سے منور بنا دے۔ اور اگر بعیت سے قبل لوح محفوظ سے اس کی ارادت اور بعیت کا ثبوت نہ پائے تو اس کو یہ کہکر رخصت دیدے کہ میرے پاس کوئی خدمت کا وظیفہ نہیں رہا۔ جس پر تم قیام کرسکو۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ کہ توجہ درویش میں چار قسم پر کام کرتی ہے:۔

اوّل القائی زیر سایہ شیخ کے مرید کا حاضر ہو کر توجہ پیر کے ساتھ ہر وسوسہ سے محفوظ رہنا۔ اور اس کا متواتر اثر انداز ہونا جیسے مکان کا سایہ، یہ القائی کہلاتی ہے۔ یعنی بعیت کے بعد ارادتمند شیخ کے سایہ میں اس طرح مصئون ومحفوظ ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی شخص مسقف پختہ مکان میں دھوپ، آندھی برسات ودیگر حوادثات سے حفاظت میں ہوتا ہے۔ اس کو شیخ کامل کی اس توجہ کی برکت سے فتنہ نفسانیہ ووسوسۂ شیطانیہ کا ڈر نہیں رہتا۔

دوئم اتحادی وہ ہے کہ شیخ اور ارادتمند کی مجلس متحد ہو۔ ایک مقام معین پر شیخ توجہ دینے کے لئے اور مرید توجہ لینے کے لئے آمادہ ہو۔ دونوں کا خیال اور ارادہ ایک ہو۔ جیسے چکوہ اور چکوی نر و مادہ جن کے لئے مشہور ہے کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے لئے جفت نہیں ہوتے۔ بلکہ

ایک دوسرے کے سامنے صرف متحد الخیال ہو کر اس نیت پر بیٹھ جاتے ہیں تو مادہ صرف خیال ہی سے بوجھل ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی مرید بھی شیخ کی اس توجہ سے حصۂ معرفت پالیتا ہے۔ کسی ہندو صوفی کا قول ہے۔ شعر

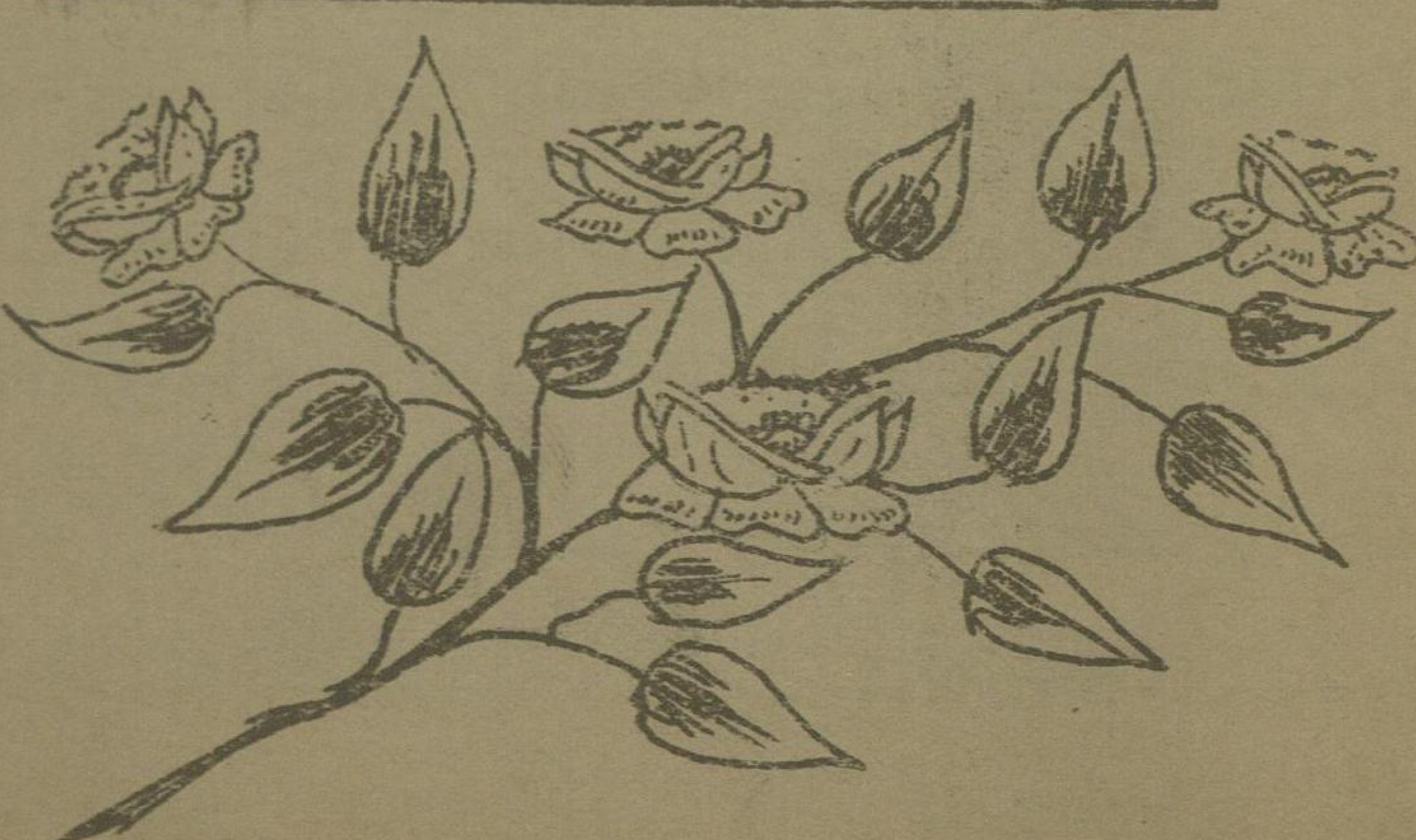
ریت پریت پریم رس چکھا کرے دھیان   بینی ہو کے سنگ رہے تب پاوے بھگوان

سوئم اتصالی

وہ یہ ہے کہ شیخ اور ارادتمند میں گو ظاہری طور پر ہزاروں کوس کی مسافت ہو مگر مرید کے مجاہدے اور شیخ کی مہربانی سے فیضانِ باطنی ارادتمند کو ہر لحظہ منفصل طور پر ایسے پہنچتا رہتا ہے۔ جیسے دریا کا پانی کھیتی کو بغیر انقطاع کے ملتا رہتا ہے۔ اور وہ سرسبز و شاداب ہوتی رہتی ہے۔ یعنی دریا کہیں ہوتا ہے اور کھیتی کہیں۔ مگر پانی کے مسلسل پہنچنے سے کھیتی کی سیرابی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

چہارم انعکاسی

وہ یہ ہے کہ فیضانِ معرفت ارادتمند پر اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے، جیسے سورج آسمان پر ہو اور دھوپ زمین کے پانی پر پڑے اور اس کا عکس مکان کے اندر پایا جائے۔ یہ اکثر اوقات اس وقت ہوتی ہے۔ جب مرید براہِ راست انوار و تجلیاتِ الٰہیہ کے بے حجابانہ پانے کے لئے بیقرار ہو جسکی بہترین مثال سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ ایزدی میں جب دیدارِ بے حجابانہ کی تمنا کی تو حکم ہوا کہ تو نہیں دیکھ سکتا۔ دیکھنے کے لئے میرے اور اپنے درمیان پہاڑ کو تجلی گاہ بنالے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تجلی الٰہی پہاڑ سے انعکاسی طور پر موسیٰ علیہ السلام پر پڑی۔



ولایت اور ولی

قرآنِ کریم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اعمالِ صالح اور کاروبارِ سیئہ کے لحاظ سے دو بالکل مخالف ومتضاد گروہ دنیا میں ہوتے چلے آئے ہیں۔ اور کتاب اللہ نے مختلف ناموں سے ان دونوں جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے ایک کا نام اولیاء اللہ دوسری کا نام اولیاء الشیطٰن ہے۔

قرآنِ کریم میں ۲۲ سے زیادہ مقامات پر ایک ایسی جماعت کا تذکرہ ہے۔ جس نے اپنے دلوں کو حق کے قبول کے لئے مستعد کرلیا ہے۔ اور اپنی تمام قوتوں اور جذبوں سے اللہ کریم اور اسکی رضا و صداقت کو چاہنے والی ہے اس لئے اللہ نے اس کو اپنا دوست کہہ کر پکارا ہے اور اپنا ساتھی بنا لیا ہے۔ جیسا کہ اَللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْن کا ارشاد ہے چونکہ مدعیانِ باطل اور اولیاء الشیطٰن کو بھی مقام دنیا میں دعویٰ ولایت کی جرأت ہوسکتی تھی۔ اس لئے اس جماعت اولیاء اللہ کے لئے ایک شرط لگا دی گئی اور وہ اس لئے نہیں کہ موت کو پکار کر اپنی محبت الٰہی کا ثبوت دیں یا موت کو پکارنا ان کی ولایت کی شہادت ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ مطلوب کے حصول کے لئے موت کی تمنا کرنا ایک انتہائی جذبۂ طلب ومحبت ہے۔ تاکہ سچے اور جھوٹے کی پہچان ہوجائے۔ لہٰذا فرمایا۔ قُلْ یَآ یُّھَا الَّذِیْنَ ھَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ط اے میرے محبوب یہودیوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم کو اس بات کا دعویٰ ہے۔ کہ تمام لوگوں میں سے صرف تم ہی اللہ کے ولی اور دوست ہو تو اس کی آزمائش یہ ہے کہ خدا کی راہ میں موت کی آرزو کرو اور اگر تم سچے ہوگے تو ضرور ایسا ہی کروگے۔ آگے فرمایا۔ وَلَا یَتَمَنَّوْنَہٗٓ اَبَدًا م بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ م بِالظّٰلِمِیْنَ ط اور ہرگز تمنا نہیں کریں گے وہ بسبب اس کے جو آگے بھیجا ان کے ہاتھوں نے اور اللہ ایسے بدعہدوں اور ظالموں کو جاننے والا ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ کے دوستوں کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ جب انہیں جان دینے اور زندگی اور اسکی لذتوں سے دست بردار ہوجانے کی دعوت

دی جاتی ہے، تو وہ لبیک کہتے ہوئے اس طرح دوڑتے ہیں، گویا بھوکوں کو غذا اور پیاسوں کو پانی کی پکار سنائی دی۔ پر جو جھوٹے ہیں اور اللہ کی ولایت سے محروم۔ وہ اس تمناءِ عمل سے انکار کر دیتے ہیں اور یہ ان کے جھوٹے ہونے کی مہر ہے جو انہوں نے اپنے آپ پر خود لگا دی ہے۔

پس فرمایا کہ خدا کے دوست اور ولی وہ ہیں۔ جو اس کے لئے اور اس کے کلمۂ حق کے لئے خون بہانے، جان دینے اور اپنے آپ کو مہلک مشقتوں میں ڈال لینے اور زندگی کے عیش و آرام سے محروم ہونے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

پھر اُن کے مقابلہ میں ایک دوسری جماعت بھی ہے۔ جو اپنے خواص و اعمال میں قطعاً اسکی ضد ہے قرآنِ کریم نے اسے اولیاء الشیطٰن سے تعبیر فرمایا ہے۔ کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام قوتیں جو تعلق الٰہی اور رشتۂ حق و صداقت کی مخالف ہیں اور ابلیس کی اطاعت میں کام آنے والی ہیں وہ سب شیطانی کہلاتی ہیں۔

پس جو لوگ راہِ حق و عدل سے ہٹ کر اعمالِ باطلہ کی تاریکی میں گم ہو گئے ہیں اور اللہ کریم جلّ وعلا شانہٗ کا رشتہ ان کے ہاتھوں میں نہیں رہا۔ وہ خواہ کسی حال اور کسی شکل میں ہوں درحقیقت شیطان کے ولی، اس کے پرستار اور اسکی بادشاہت کے غلام ہیں۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے:۔ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ط یعنی ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا ولی بنا دیا ہے جو ایمان سے محروم ہیں۔

پس ایک طرف اولیاء اللہ ہیں اور دوسری طرف اولیاء الشیطٰن۔ گویا ایک جماعت اپنے تئیں اللہ کی راہ میں قربان کرنیوالی ہے، اور دوسری شیطان کی اطاعت میں جنگ و جدال کرنے والی۔ جو کامیابی اور فلاح سے دور اور ہر میدانِ عمل میں گھاٹے کی مستحق ہے۔

ان دونوں جماعتوں میں ایک بڑا فرق اور حقیقی فرق یہ بھی ہے کہ اولیاء اللہ ایسے عہد میں پیدا ہوتے ہیں جب کہ حق اور سچائی محدود اور باطل و فساد عام ہوتا ہے اور گمراہی کی تاریکی اس طرح پھیل جاتی ہے کہ کوئی گوشہ منور نہیں رہتا، پھر ان پاکبازوں کے لئے خدا کا ہاتھ چمکتا ہے جو تاریکیوں سے نکال کر نور کے میدان میں لے جاتا ہے۔ مگر اولیاء الشیطٰن پہلے سعادت و ہدایت کی وادیوں میں سفر کرتے ہیں۔ بعد کو شیطان انہیں سعادت و ہدایت سے نکال کر شقاوت و ہلاکت کے جنگل میں دھکیل دیتا ہے، جہاں وہ بھٹکتے ہیں، اور ان

کے قلوب قاسیہ میں یہ گمان پیدا کردیتا ہے کہ تم ہی حق و صداقت پر ہو، اور صراطِ مستقیم تمہارے ہی سامنے ہے
یہاں سے واضح ہوگیا کہ حق اور باطل، نور اور ظلمت، کفر اور ایمان کی حقیقت تب ہی سمجھ میں آئے گی۔ جب راہ نمائی کے لئے خدا کا ہاتھ جھکے اور اپنے متلاشی کی نگاہ کو منور کر کے اسے اپنا ولی بنا لے۔ بغیر اسکی رحمت اور انکشاف کے اس حقیقت معرفت الٰہیہ کو پانا محال بلکہ مشکل ترین عمل ہے۔ جن کو اس نے ظلمتوں سے نکال کر نور میں لانا چاہا ان پر اپنے نور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنی کتاب قرآن کریم کا راز کھول دیا۔ جس نے اس نور مبین کی معرفت حاصل کر لی اور اسکی غلامی کا قلادہ گلے میں ڈال لیا۔ وہی ولی اللہ بنا اور جس نے اس نور، اس رحمت، اس ہدایت اس سعادت سے منہ موڑا، وہ ولی شیطان اور جہنمی ہوا۔

کیونکہ اس جہانِ عمل میں معرفت الٰہی کی تمام راہیں، تمام تعلیمیں اور تمام دروازے بند ہو چکے ہیں، جو آدم علیہ السلام سے مسیح علیہ السلام تک کھلے تھے، اور اب صرف ایک ہی شاہراہ اور ایک ہی بڑا دروازہ ایک ہی معرفت الٰہی کی صراطِ مستقیم ہے جو مدینہ طیبہ سے ہو کر عرش اعظم پر جاتی ہے اس کے بغیر رازِ الٰہی کا پانا محال اور دربار الٰہی تک رسائی ناممکن ہے۔ جس نے پایا، اسی راہ سے پایا۔ اور جس نے پانا ہے اسی راہ سے پانا ہے۔ اس کے بغیر راز و نیاز کا دعویٰ ایک کھلی بطالت اور اس کے اتباع کے علاوہ ولایت کا مدعی ہونا صریح ہلاکت ہے۔ کیونکہ بندہ اطاعتِ رسالت واتباعِ شریعت اور ترکِ بدعت کے بغیر تقرب الی اللہ کی منزل میں کوئی حیثیت پیدا ہی نہیں کر سکتا۔ گو فی زمانہ بعض وہ لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جنہوں نے بغیر کسی فطری اور قدرتی مجبوری کے انحراف شریعت اور استخفاف سنت کا نام طریقت رکھ لیا ہے۔ اور اپنی نفسانی خامیوں پر ان الفاظ سے پردہ پوشی کر کے اپنا وقت گزار رہے ہیں کہ قانون شریعت اور چیز ہے اور طریقت و ولایت اور چیز ہے۔ مگر ان کا یہ نظریہ اور انکشاف و اجتہاد قطعاً غلط ہے۔ اور وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ دراصل شریعت اور طریقت، حقیقت اور معرفت کے الفاظ کس مفہوم پر وضع کئے گئے ہیں۔ اور یہ اپنے معانی کے لحاظ سے کس کس محل پر وارد ہوتے ہیں۔ اور کن کن مطالب کو ادا کرتے ہیں۔ اگر وہ سمجھ سکتے۔ تو اس فریب نفس میں مبتلا نہ ہوتے۔ اور اگر عام فہم الفاظ میں ان کی کیفیت کو سمجھنے کی تکلیف کرتے تو بہت جلد سمجھ میں آسکتی جس پر کسی زیادہ دماغ سوزی کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی۔ مثلاً شریعت کسی شے کے وجود میں آنے کو کہتے ہیں اور اس کا طریق استعمال طریقت کہلاتا ہے۔ اس طریق استعمال کے بعد اس سے اس کی غرض کے ماتحت نفع

اٹھانا حقیقت ہے۔ اور اس نفع کا نتیجہ جو انسانی ضرورت کیلئے پیدا ہوتا ہے وہ اسکی معرفت ہوگی۔ اب جو شخص ایک شے کی پیدائش ہی کا قائل نہیں۔ وہ اسکی معرفت کیلئے کیوں میدانِ سعی میں قدم رکھے گا۔ مثال کے طور پر ایک کرسی یا میز کو لے لیجئے۔ اس کا عام لکڑی کی حالت سے کرسی کی شکل میں آنا اور ایک خاص ضرورت کے ماتحت آنا شریعت کہلائے گا۔ پھر اس کو یہ سمجھنا کہ اس کا طریقِ استعمال کیا ہے اور کس غرض کے لئے بنائی گئی ہے یہ طریقت ہے۔ پھر اس پر بیٹھ کر اپنا کام کرنا یہ حقیقت ہے اور اس کام کے بعد کام کا انجام اور راحت و آرام پانا اور ایک آخری نتیجے پر پہنچ جانا یہ معرفت ہے۔ ایک انسان جب بذاتہٖ کرسی کی ساخت ہی کا قائل نہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر راحت و آرام اور سیر و عیش کا متمنی ضرور ہے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص عمر بھر مدرسے سے بھاگا رہے اور لوگوں کی ایم۔ اے، کی ڈگریاں دیکھ کر اپنے لئے ڈگری کی تمنا کرے۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ مزید کیفیت ان تمثیلات سے معلوم کیجئے کہ شریعت اتباع ہے، اور طریقت انقطاع۔ حقیقت اطلاع اور معرفت متاع۔ یا شریعت بندگی ہے اور طریقت ترکِ خودی حقیقت وصال اور معرفت کمال۔ یا شریعت فرمانبرداری ہے اور طریقت غیر سے بیزاری حقیقت دوست سے برخورداری اور معرفت اپنے آپ سے ہشیاری۔ یا شریعت عنا ہے اور طریقت فنا۔ حقیقت بقا، اور معرفت غنا۔ یا شریعت شیر اور طریقت پنیر۔ حقیقت مسکہ اور معرفت روغنِ خالص ہے۔ پھر وہ انسان جو سرے سے دودھ ہی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اس گھی سے کہاں تک واسطہ ہو سکتا ہے۔ گویا شریعت ہی ایک وہ چیز ہے جس نے ہستیٔ باری تعالیٰ کا سبق دیا ہے۔ اور اسکی تلاش اور جستجو کے اصول و قواعد سمجھائے ہیں۔ مخلوق پرستی سے نکال کر مورتی پوجا اور نفس پرستی چھڑا کر بھٹکے ہوئے انسانوں کو ان کے خالق و مالک سے شناسا ہونے کی دعوت دی ہے۔ گویا توحید الٰہی کی اصل و اساس ہی شریعت ہے طریقت اس شریعت کے فرمودہ اصولوں پر عمل کرنے اور چلنے کا نام ہے۔ یعنی بغیر شریعت کسی شئے کی ظاہری صورت کے اس کی حقیقت کا مدعی ہونا بے بنیاد اور لایعنی عقیدہ ہوگا۔ شریعت پر چل کر اور طریقت حاصل کر کے حقیقت پر پہنچ سکے گا۔ جب شریعت کے اصولوں کو اپنا کر اور طریقت کو اختیار کر کے تلاشِ حق میں متجسس نہ ہوگا وہ اس کی حقیقت پر کیونکر پہنچ جائیگا۔ اور کس طرح حقیقت کے مقام کو پا کر اس کی پہچان کرے گا۔ جس کی اس کو تلاش تھی۔ اور کیسے وہ عارف باللہ یا معرفت یافتہ کہلائے گا۔ گویا شریعت نے جس نظریہ کو اس کے سامنے پیش کیا تھا، طریقت

پر قدم اٹھا کر حقیقت سے واقف ہوتا ہوا مطلوب کی معرفت پر اس کی تکمیل ہو جائے گی۔ اگر کوئی مدعی کاذب معرفت الٰہی کا تو دعویدار ہے اور شریعت غرا کا منکر تو وہ اپنے دعویٰ فقر و محبت میں جھوٹا ہے۔ ایسے لوگ خود نامرد اور مردوں کے راہزن ہوتے ہیں اور عوام کو یہ کہہ کر فریب دیتے ہیں کہ فلاں بزرگ غیر شرع تھے، نماز کے پابند نہ تھے، روزہ نہ رکھا کرتے تھے، تکلفات شرعیہ سے بے نیاز تھے۔ ہم بھی ان ہی کے متبع ہیں۔ اس لئے ہم پابند شرع نہیں۔ حالانکہ یہ محض فریب نفس اور بے سمجھی کی گفتگو ہوتی ہے۔ کسی کے غلبۂ حال کی کیفیتوں کو ایک نفس پرست جو غلبۂ حال سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا اپنے واسطے اور اپنی نفسانی شرارتوں کے واسطے دلیل نہیں لا سکتا۔ وہ، وہ لوگ ہیں جنکو شریعت نے مستثنےٰ قرار دیا ہے۔ اور سوائے مغلوب الحال بزرگوں کے کوئی شخص اتباع شریعت سے انکار کرنے کا استحقاق نہیں رکھتا۔ اور نہ خلاف شرع جاکر اہلِ طریقت سے اپنے آپ کو شمار کر سکتا ہے۔ یہاں شریعت اور طریقت کے فرق پر اسی نظریے کے ماتحت ایک نظم ملاحظہ ہو۔ جو لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے لکھی ہے:۔

نظم، شریعت اور طریقت کیا ہے؟

سُنو دو ہی لفظوں میں مجھ سے یہ راز
شریعت وضو ہے، طریقت نماز

طریقت، شریعت کی تعمیل ہے
طریقت، عبادت کی تکمیل ہے

شریعت بحکم و طریقت بدل
کہ معنی سے کردے تجھے متصل

شریعت میں آثار راہِ خدا
طریقت میں رفتار راہِ خدا

طریقت، شریعت سے ہے صف بہ صف
وہ ہے موج دریا، یہ دریا میں کف

شریعت سے ہے ظلمت کفر دور
طریقت میں فطرت کا ظاہر ہے نور

شریعت کرے گی بصیرت کو صاف
طریقت میں حسب مذاق انکشاف

شریعت تو اک عام قانون ہے
طریقت کا اک خاص مضمون ہے

شریعت میں لازم اطاعت ہوئی　　طریقت میں شرطِ ارادت ہوئی

شریعت تو ہے دیدۂ نور بیں　　طریقت بنی روح کی دوربیں

شریعت ہے اک شمع محفل فروز　　طریقت ہے اک شعلۂ وہم سوز

شریعت ہے مہرِ سپہرِ ہدٰے　　طریقت کا رخ سوئے حُبِ خدا

شریعت ہے جان اور طریقت نشاط　　شریعت ہے منزل طریقت رباط

شریعت غذا ہے طریقت دوا　　شریعت چمن ہے طریقت ہوا

شریعت عبادت ہے اللہ کی　　طریقت محبت ہے اللہ کی

شریعت کی خدمت کا سب سے لگاؤ　　طریقت کی لذت پئے مَنْ یَّشَآءُ

شریعت میں ہے نار و جنّت کا رنگ　　طریقت میں ہے وصل و فرقت کا رنگ

شریعت کتابوں کی ہے محتمل　　طریقت میں ہے درسِ الواحِ دل

شریعت طریقت میں تو کیوں الجھ　　وہ قرآن ہے اور یہ اسکی سمجھ

سخن سنجیاں گو ہوں میری درست　　مگر قولِ سعدیؒ نہایت ہے چست

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست　　بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

محال است سعدیؒ کہ راہِ صفا　　تواں رفت جز بر پئے مصطفٰےؐ

نہ ہو اہل اس کا تو کیا اس کی قدر　　خدا ہی کی مرضی سے ہے شرح صدر

شریعت میں دین اور ایمان ہے　　طریقت میں تسکین اور ایقان ہے

عبادت سے عزت شریعت میں ہے　　عبادت کی لذت طریقت میں ہے

شریعت میں تائید ضبطِ نفوس　　طریقت میں ذوقِ عمل با خلوص

طریقت قدم ہے شریعت ہے راہ　　شریعت زباں ہے طریقت نگاہ

شریعت درِ محفلِ مصطفٰےؐ　　طریقت عروجِ دلِ مصطفٰےؐ

شریعت میں ہے قیل و قالِ حبیبؐ　　طریقت میں محوِ جمالِ حبیبؐ

شریعت میں ارشادِ عہدِ الست طریقت میں ہے یادِ عہدِ الست
شریعت شکر ہے، طریقت زباں
کہ معنی کی لذت چکھے تیری جاں

اس اصول کے خلاف ایک مدعی ولایت ولی تو کیا منکرِ احکامِ شریعت ہوتے ہوئے پکا مومن بھی نہیں رہ سکتا۔ العیاذ باللہ۔ وہ موٹے موٹے اصول جو ایک مومن کے لئے ولی بننے کے واسطے بیحد ضروری ہیں، اور نورانی صداقت و ربانی ہدایت کے ساتھ اہلِ مجاہدہ و محاسبہ و اولو العزم لوگوں نے بیان فرمائے ہیں یہ ہیں:-

اصُول :- اوّل متمنّیٔ ولایت کو چاہیئے کہ کبھی خدا کی قسم نہ کھائے، جھوٹا ہو یا سچا، خواہ عمداً ہو یا سہواً، کیونکہ اہلِ طریقت نے لکھا ہے کہ جب وہ ترکِ قسم پر اپنے نفس کو مضبوط کر دے گا اور زبان اس کی عادی ہو جائے گی تو یہ عادت اس کو وہاں تک پہنچا دے گی۔ کہ قسم کو وہ بالکل عمداً وسہواً ترک کر دے گا۔ جب وہ اس خصلت کا عادی ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے انوار سے ایک نور کا دروازہ اس پر کھول دیگا۔ اور اس کے درجہ میں بلندی۔ اس کے مقصد میں قوّت، اس کے عزم میں استقلال، اس کے صبر میں تعریف، اس کی عزت و تکریم میں وسعت پیدا ہو گی۔ پھر عامل اس کا نفع اپنے اندر محسوس کرے گا۔ جو اس کو دیکھے گا اس سے ہیبت کھائے گا اور عزت کرے گا۔

دوئم :- دروغ بافی اور کذب بیانی یعنی جھوٹ بولنے سے قصداً وسہواً کنارہ کش رہے۔ اس لئے کہ جب وہ اس پر قائم ہو جائے گا اور اپنے نفس کو محکم و پختہ کرے گا تو اس کی زبان حقگوئی و راست بازی کی عادی ہو جائیگی یعنی اس سے سچ کے سوا کچھ ظاہر نہ ہو گا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے انشراحِ صدر فرمائے گا۔ اور اس کے علم و سینہ کو مصفا کر دے گا۔ پھر وہ ایسا ہو جائے گا کہ گویا جھوٹ سے آشنا ہی نہیں۔ سچائی اس کے رگ و پے میں ایسی سرایت کر جائے گی کہ جب کسی دوسرے سے بھی جھوٹ سنے گا تو اس پر اظہارِ نفرت کریگا اور عیب رکھے گا۔ اور اپنے دل میں اس کی اس بد عادت کے دور ہونے کی دُعا کرے گا۔

سوئم :- وعدہ کے پورا کرنے کی عادت رکھے اور وعدہ خلافی سے پرہیز اور احتراز کرے۔ اس عادت کے پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ عام طور پر کسی سے وعدہ کرنا ہی چھوڑ دے۔ کیونکہ یہ بات اس کے حق میں

وعدہ خلافی سے بہتر رہے گی۔ وعدہ خلافی جھوٹ ہے اور جب انسان جھوٹ سے بچتا ہے تو اس پر سخاوت و حیا کا دروازہ کھل جاتا ہے اور راست بازلوگوں کے قلوب میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔

چہارم۔ مخلوقات میں سے کسی ذی روح پر انسان ہو یا حیوان لعنت نہ کرے اور کسی کو ایذا نہ پہنچائے۔ اس لئے کہ لعنت سے باز رہنا اور ایذا رسانی سے بچنا اصفیاء اور صدیقوں کے اخلاق میں سے ہے۔ لعنت سے اجتناب کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت میں رکھتا ہے اور ہلاکتوں سے بچاتا ہے۔ خلق کے فتنہ وشر سے محفوظ کرتا ہے اور اپنا قرب نصیب فرماتا ہے۔

پنجم:۔ مخلوق میں سے کسی پر بددعا نہ کرے، اگرچہ کسی نے اس پر ظلم ہی کیا ہو۔ ظالم سے اپنی زبان کے ساتھ قطع صلہ کرنا اور اپنے فعل کے ساتھ اس سے بدلہ لینا اس کی بلندی مراتب سے بہت دُور ہے۔ کیونکہ اس کو خدا کے لیئے برداشت کرنا چاہیئے۔ یہ خصلت عامل کو بلندی درجات بخشتی اور آخرت میں بزرگ بناتی ہے۔ قریب وبعید میں عزت پاتا ہے اور صوفیوں کے نزدیک قابلِ تحریم وتکریم ہوتا ہے۔

ششم:۔ اہلِ قبلہ میں سے کسی پر کفر وشرک کا فتویٰ نہ دے۔ جب تک کہ اس کا شرک وکفر ونفاق اسکے نزدیک مسلم ویقینی نہ ہو۔ یہ بات رحمت کے قریب درجہ میں بلند اور اللہ تعالیٰ کے علم میں دخل دینے سے بہت دور ہے۔ کیونکہ کسی پر کفر وشرک کا فتویٰ دینا گویا خدا کے علم میں دخل دینا ہے۔ جو مومن کی شان سے بعید اور اسلام کے منافی ہے۔ یہ فعل اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچاتا اور اسکی رضامندی کے قریب کرتا ہے۔

ہفتم:۔ ظاہری و باطنی گناہوں سے پاکیزگی حاصل کرے اور ان سے اپنے اعضاء وجوارح کو محفوظ رکھے۔ کیونکہ عملوں میں سے اس عمل کا ثواب جلدی ملتا ہے۔

ہشتم۔ اپنا ہر قسم کا چھوٹا بڑا بوجھ مخلوق میں سے کسی پر نہ رکھے اور نہ کسی کے آسرے کا عادی بنے۔ بلکہ اپنے بوجھ کو تمام مخلوقات سے لوٹالے۔ خواہ اس بوجھ کی اسکو حاجت ہو یا اس سے بے احتیاج ہو۔ کیونکہ یہ عابدوں کی عبادت کا تتمہ ہے۔ اور اسی بے نیازی کے سبب سے ان کی عزت ہوتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب لکھا ہے :۔

ہیچ میدانی کہ سگ را با گدا غوغائے چیست   منع مے سازد کہ جز حق بر درِ دیگر مرو

ترجمہ - شاعر کہتا ہے کہ کیا تو جانتا ہے کہ کتے کو بھیک مانگنے والے فقیر و گداگر سے کیا عناد ہوتا ہے۔ کتا اس کو منع کرتا اور سبق سکھاتا ہے کہ سوائے خدا کے مخلوق کے دروازے پر نہ جا اور اپنی حاجت اسی بے نیاز سے مانگ جو انسان اپنی قوتِ لایموت کے لیے بھی دوسروں کا دست نگر ہو جاتا ہے - اللہ کریم اس کو تونگری، استقامت یقین اور اعتماد کی دولت سے دُور ہٹا دیتا ہے - اور وہ دین و دنیا کے ہر میدان میں ذلیل و رسوا ٹھہرتا ہے۔

نہم - اپنی طمع کو لوگوں سے قطع کر دے اور اپنے نفس کو اس چیز کی طمع میں نہ ڈالے - جو اس کے ہاتھ میں نہیں ہے یہ عادت منتخر بزرگی، صحیح تونگری، یقین متحکم اور خالص توکل عطا کرتی ہے - گویا یہ زہد کے دروازوں سے ایک دروازہ ہے - اسی سے پرہیزگاری حاصل اور طبیعت عبادت پر مائل ہوتی ہے۔

دہم :- متواضع بنے، کیونکہ عابد کا عمل اسی سے محکم ہوتا ہے۔ مولا کریم اور اس کی مخلوق کے نزدیک عزت و رفعت کامل ہوتی ہے - متواضع شخص دنیا و آخرت کے امور میں سے جس امر کا ارادہ کرے گا، اس پر اس کو قدرت حاصل ہوگی - اس سے صالحین کے مراتب بلند ہوتے ہیں - اور یہی کمالِ تقویٰ کی کنجی ہے - تواضع کی تشریح اگلے باب اعمال و اشغال میں ذکر ہوگی۔

جب تک کسی شخص میں مندرجہ بالا خصائل نہ پائے جائیں، اس وقت تک اس کو مسندِ ولایت پر متمکن سمجھنا ہی جائز نہیں اور جو ایسا نہ کرے گا، اپنے دعویٰ میں کاذب ہوگا۔ ایسے شخص کو کتاب اللہ کا مطالعہ کرنا چاہئے - کہ وہ تعریف جو کتاب اللہ نے ولی کی کی ہے وہ کیا ہے اور کس پر وہ صادق آسکتی ہے - کتاب اللہ میں ولایت کا مفہوم قرب کا ہے - اور اس کی دو قسمیں ہیں - ایک ولایت عامہ، دوسری ولایت خاصہ - ولایت عامہ میں تو تمام مومن شریک ہیں - جیسے مولا کریم نے ارشاد فرمایا ہے :- اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط یعنی اللہ تعالےٰ مومنوں کا دوست ہے - جن کو اندھیروں سے نور کی جانب نکال لیتا ہے - اور ولایت خاصہ صرف اہلِ سلوک کے خدا رسیدوں کو حاصل ہوتی ہے - حضرت بوعلی صفاہانیؒ فرماتے ہیں - وَهِيَ عِبَارَةٌ فَنَاءُ الْعَبْدِ فِى الْحَقِّ بِقَائِهٖ فَالْوَلِيُّ هُوَ الْفَانِيْ فِيْهِ وَالْبَاقِيْ بِهٖ ط یعنی اس سے مقصود ہے بندہ کا خدا کی حقیقت میں فنا ہو جانا اور اسی کے ساتھ باقی رہنا - پس ولی اس کو کہتے ہیں جو فانی فی اللہ ہو اور باقی باللہ ہو۔

ابو علی جورجانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں - اَلْوَلِيُّ هُوَ الْفَانِيْ مِنْ حَالِهٖ وَالْبَاقِيْ فِيْ مُشَاهَدَةِ الْحَقِّ

لَمْ یُمْکِنْ لَہٗ مِنْ نَفْسِہٖ اَخْبَارٌ وَّلَا مَعَ غَیْرِ اللّٰہِ قَرَارٌ یعنی ولی وہ ہے جو اپنے حال سے فانی اور خدا کے مشاہدہ میں باقی ہو۔ اس کو نہ اپنی طرف سے خبر دینا ممکن ہے اور نہ خدا کے سوا قرار ہے۔

حکایت

حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کو فرمایا کہ کیا تو ولی اللہ بننا چاہتا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ ہاں حضرت ابراہیم ادھم نے فرمایا کہ دنیا اور آخرت کی طرف خواہش نہ کر، کیونکہ ان کی خواہش سے خدا کی طرف اعراض ہوگا رسالہ قشیریہ میں ہے کہ ولی وہ ہے جو خدا کی اطاعت اور عبادت کا والی ہو۔ اور اسکی عبادت اس سے بدوں کسی گناہ کے متواتر جاری رہے۔ اور گناہ سے ایسا محفوظ ہو جیسے نبی گناہ سے معصوم ہوتا ہے۔

ابو عبد اللہ سالمیؒ فرماتے ہیں کہ ولی وہ ہے۔ جس کی زبان میں نرمی ہو۔ حسنِ اخلاق، خندہ پیشانی اور نفس کا سخی ہو۔ اعتراض کم کرے۔ جو شخص اس کے سامنے عذر کرے۔ اس کا عذر قبول کرے۔ تمام لوگوں پر خواہ نیک ہوں یا بد شفیق ہو اور کسی کے احسان پر نظر نہ رکھتا ہو۔

کتاب کشف المحجوب میں حضرت زبدۃ الاولیاء، قدوۃ الاصفیاء، داتا گنج بخش علی ہجویری لاہوری رحمۃ اللہ علیہ ولی اور ولایت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے نبوی برہان کو باقی کر دیا ہے۔ اور اولیاء اللہ اس کے اظہار کا سبب ہیں تاکہ خداوند عالم کی نشانیاں اور حضور ختمی مرتبت تاجدار کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت ظاہر ہوتی رہے۔ اور اولیاء اللہ کو خدا کی کائنات کا والی بنا دیا گیا ہے۔ تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مجرد وجود ہو جائیں۔ ان کے قدموں کی برکت سے آسمان سے بارش ہوتی ہے اور ان کے حال کی صفائی کی وجہ سے زمین سے روئیدگی اُگتی ہے۔ اور ان ہی کی پاک جانیوں اور بلند ہمتوں کا صدقہ مسلمان کافروں پر جنگوں میں فتح حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کی تعداد چار ہزار ہے۔ جو ہر حال میں اپنے آپ اور مخلوق سے چھپے رہتے ہیں۔ اور ان میں جو لوگ اہل تصرف اور درگاہِ الٰہی کے پیارے ہیں وہ تین سو ہیں۔ جن کو اخیار کہا جاتا ہے۔ پھر ان میں سے چالیس ابدال سات ابرار، چار اوتاد، تین سو نقباء اور ایک قطب وغوث ہوتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں اور کاموں میں ایک دوسرے کی اجازت کے محتاج بھی ہوتے ہیں۔ کتاب فتوحات مکیہ کے باب ایک سو

اٹھائوے کی فصل اکتیس میں سات قسم کے اشخاص کو ابدال بیان کیا گیا ہے۔ اور ذکر کیا ہے کہ حق سبحانہٗ تعالےٰ نے زمین کو ہفت اقلیم بنایا ہے۔ اور اپنے بندوں میں سے سات اشخاص کو پسند کرکے ان کا نام ابدال رکھا ہے۔ تاکہ ہر اقلیم کے وجود کو ان میں سے ایک ایک نگاہ میں رکھے۔ غالباً صاحب فتوحات مکیہ کی بھی منشا اس بیان سے وہی ہے جو حضرت گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ لاہوری کی ہے۔ اور یہ سات مقدس ہستیاں وہی ہیں جن کو داتا صاحب نے سات ابرار ارقام فرمایا ہے۔ بعض کتب تصوف میں یہ تذکرہ بالترتیب بھی آیا ہے۔ جیسا کہ فقیر نے اپنی کتاب صحیفہ غوثیہ شرح قصیدہ غوثیہ شریف میں لکھا ہے۔ یعنی۔

افراد۔ اس جماعت کا نام ہے جو قطب زمانہ کے دائرہ تصرّف سے باہر ہوتی ہے۔ چونکہ یہ حضرات ظلِ ملائکہ ہوتے ہوتے ہیں اور ملائکہ متصرف ارضی سے علیحدہ اور اس کے تصرف سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس لئے افراد اقطاب کے تصرفات سے باہر ہوتے ہیں۔

اقطاب۔ وہ ہیں جو مدار وجود خلائق اور شہود حقائق ہیں۔ جیسا کہ فلکیات کے مرکز قطب کو صرف انتظام وجودِ عالم کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اصطلاح تصوف میں قطب بھی مقام مخدع ہے۔ پھر اقطاب ایک زمانہ میں کئی ہوتے ہیں جو قطب الاقطاب کے ماتحت ہوتے ہیں۔ جس کے متعلق کتب تصوف میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ هُوَ بَاطِنُ نُبُوَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَا يَكُونُ اِلَّا لِوَرَثَتِهِ لِاخْتِصَاصِهٖ بِالْاَكْمَلِيَّةِ فَلَا يَكُونُ خَاتِمُ الْوِلَايَةِ وَقُطْبُ الْاَقْطَابِ اِلَّا عَلٰى بَاطِنِ خَاتِمِ النُّبُوَّةِ (یعنی قطبیت نبوت محمدیؐ کا باطن ہے۔ پس نہیں حاصل ہوتی مگر اس کے ورثا کے لئے کیونکہ حقیقی کمال ان کے لئے مختص ہے۔ پس خاتم الولایت اور قطب الاقطاب سوائے باطن خاتم النبوت کے نہیں ہو سکتا پھر اقطاب ایک زمانہ میں کئی ہوتے ہیں۔ اور قطب الاقطاب یا غوث جس سے درجہ قطبیت کبریٰ مراد ہے صرف ایک ہوتا ہے۔ پھر ان کے مختلف مدارج اور بھی ہیں۔ مثلاً

قطبِ ارشاد۔ یہ آبپائے ہدایت کا مدار ہوتا ہے۔ جس سے عصیان وطغیان اور کفر و عدوان کی تاریکیاں دور ہوتی ہیں۔

قطبِ اوتاد۔ اس طبقہ کا ہر فرد ایک میخ کا کام دیتا ہے۔ کیونکہ اوتاد جمع وتد کی ہے۔ اور وتد میخ کو کہتے

ہیں جسکے ساتھ زمین وآسمان، بحروبر، شجر وحجر، چرند وپرند وابستہ ہیں۔ جب کوئی قطب دنیا سے سفر کر جاتا ہے تو اس کی جگہ اوتاد سے پوری کی جاتی ہے۔

قطب ابدال۔ یہ حضرات اس درجہ سے متعلق ہیں۔ جن کو ہر لحظہ ترقی مدارج ہوتی رہتی ہے۔ ان کو ابدال اس لئے کہا جاتا ہے کہ ایک کی کمی پر دوسرا اس کا بدل بن کر اس کی جگہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور ان کی تعداد ہمیشہ چالیس پر مشتمل رہتی ہے۔

نجبار۔ یہ بھی چالیس اولیاء اللہ کی ایک جماعت ہوتی ہے جس سے قطب ابدال بنتے ہیں۔

نقبار۔ یہ جماعت تین سو اولیاء اللہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو عام مقامات میں کام کرتے ہیں۔

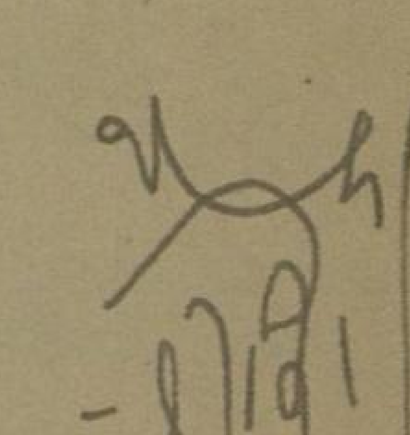
الغرض مرتبہ ولایت، اتباع شریعت، ترک بدعت، اجتناب کفر و شرک و کبائر معاصی، کی شرط اولین رکھتا ہے۔ جو شخص احکام شرع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تابع نہیں وہ ولایت وفقر سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا۔ کیونکہ جس نے شریعت کے احکام سے سرتابی کی اور محبوب کی غلامی سے تساہل برتا وہ بدعہد، مکار اور فریبی ہے۔ مکھی کی طرح پروانے کی ہم پائیگی کا دعویٰ رکھتا ہے۔ مگر شمع کے حسن بے پناہ پر جان دینا نہیں جانتا۔

حضرت مجدالدین بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ میں ایک درویش کے ساتھ سفر میں تھا کہ راستہ میں ہم نے ایک علاقہ کے مشہور بزرگ کی تعریف سنی۔ میں نے اس درویش کو کہا کہ چلو اُن کی زیارت کو چلیں۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ جب ہم اس مقام پر پہنچے جہاں وہ بزرگ رہتے تھے تو اتفاق سے وہ ہم کو راستہ میں ہی مل گئے جو نماز پڑھنے کے ارادے سے مسجد میں جا رہے تھے۔ ہم نے ملاقات کی اور سلام مسنون کے بعد ان کے پیچھے پیچھے مسجد کی طرف چل دیئے۔ جب وہ بزرگ مسجد کے صحن میں جوتا اتار کر قدم رکھنے لگے تو انہوں نے پہلے بایاں قدم اندر رکھا۔ جونہی کہ میرے ساتھی نے ان کو بایاں قدم مسجد میں رکھتے دیکھا مجھے کہنے لگا کہ چلو واپس چلیں۔ اس شخص نے مسجد میں پہلے بایاں قدم خلاف سنت داخل کیا ہے، جو انسان محبوب کے دروازے پر مجلس اور دربار کے آداب نہیں جانتا وہ بزرگ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہم اس کی اس بے ادبی کو دیکھ کر واپس چلے آئے۔ سبحان اللہ۔ طالبین حق کے لئے کس قدر غور کا مقام ہے کہ جو اھل اللہ اتنی سی کوتاہی پر ایک بزرگ کی ہم نشینی گوارا نہیں فرماتے، وہ بھلا یہ کب جائز رکھتے ہیں کہ ایک نام نہاد بلا عذر شرعی ترک احکام کرنے والا اور بغیر غلبۂ حال کے اعمال سنت کو چھوڑنے والا

ولی اللہ تسلیم کر لیا جائے۔

اسی قسم کی ایک حکایت حضرت سلطان الہند قطب زماں خواجہ غریب نواز اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منسوب ہے کہ ایک وقت کی نماز میں آپ کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ یعنی اپنے اصلی مقام پر نہ بندھے رہے۔ تو تین دن حضوری دربار رسالت سے محروم فرما دیئے گئے۔ آخر بڑی گریہ وزاری سے چوتھی رات دربار رسالت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں پھر باریابی ہوئی اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خادم کا کیا قصور تھا جو تین دن رات زیارت سے محروم فرما دیا گیا۔ حکم ہوا کہ فلاں وقت کی نماز میں تمہارے ہاتھ ڈھیلے بندھے ہوئے تھے۔ اس لئے دربار میں آنا بند کر دیا گیا تھا۔ کہ اگر تم جیسا ایک قطب وقت میری سنت کی یہ پرواہ وقدر کرے تو عوام کا کیا حال ہوگا۔ اللہ اللہ کجا وہ اولوالعزم بزرگان دین اور کجا آج کل کے بدنام کنندہ نیکو نام چند فقراء جہال جو ہر امر شریعت کا استخفاف وتوہین اپنی درویشی کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک ٭





ضرورتِ شیخ اور ثبوتِ بیعت

ضمناً گذشتہ باب میں بیعت کی معنوی حقیقت و ضرورت پر مفصل بحث ہو چکی ہے۔ کہ اس کی غرض و غایت کیا ہے۔ اور متقدمین نے اسکو کیوں لابدی خیال کر کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بعد داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں دوسرا درجہ دے رکھا ہے۔ مگر فی زمانہ بعض لوگ اس مسئلہ کے اس قدر منکر نظر آتے ہیں کہ گویا مسئلہ بیعت ان کی تحقیق میں ایک کفریہ فعل ہے۔ اور گفتگو میں تو یہاں تک تجاوز عن الحد کر جاتے ہیں کہ ان کی عقل نارسا بیعت لینے والے مشائخین اور بیعت ہونے والے ارادتمندوں کو نعوذ باللہ کسی بڑے سے بڑے مشرک سے کم نہیں سمجھتی۔ پھر اس پر خود ساختہ دلائل کا وہ بہکاوا کہ خدا کی پناہ۔ جو بھی مشرکین و بت پرستانِ عرب کے حق کی آیات و احادیث ملتی ہیں۔ تمام تر صوفیوں، فقیروں اور پیروں پر جڑ دی جاتی ہیں۔ باور نہ ہو تو کتاب صراطِ مستقیم اسد الرحمٰن صاحب بھوپالی کو دیکھیے جس میں اسی عیاری سے کام لیا گیا ہے۔ صٓ۲ پر لکھا ہے۔ اگر تم نے اپنی دعاؤں اور عباداتوں میں کسی دوسری ہستی کو شریک کر لیا، خواہ وہ نبی ہو یا ولی۔ جیسا کہ اہلِ تصوف کا طریقہ ہے۔ تو تم نے توحید کا اعتقاد درہم برہم کر دیا اور تم اتقاء کے دائرے سے نکل گئے۔ پھر صٓ۱۷ پر زیر آیت وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَآءَ۔ الآخر۔ لکھا ہے کہ جو لوگ اللہ کے سوا اور ولیوں کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس لئے ان کی پرستش کرتے ہیں کہ اللہ کے قریب ہم کو پہنچا دیں گے۔ اللہ اُن کے اس اختلافی عقیدہ کا فیصلہ کرے گا۔ اللہ ایسے جھوٹے منکروں کو نیک راستہ نہیں دکھاتا۔

خدا کی قدرت ہے کہ یہ لوگ قرآنِ کریم میں بھی اپنی کج فہمیٔ نفس کے ماتحت غلو کرنے سے باز نہیں آتے۔ اور نہ خوفِ خدا رکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس غلط بیانی کے بدلے قیامت کو کیونکر جواب دہ ہوں گے۔

پھر صٓ۲۸ پر زیر آیت وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ..... الآخر۔ لکھا ہے کہ کیا مسلمان اور اہلِ تصوف حضرات خصوصاً وہ لوگ جو پیروں کو اللہ کے ہاں سفارشی اور دین و دنیا کا حاجت روا سمجھتے ہیں۔ ان آیات

شریفہ پر غور کر کے اپنا موازنہ کریں گے ۔ گویا اسد الرحمٰن صاحب بھوپالی کے نزدیک یہ آیات شریفہ صرف اللہ کے نیک بندوں اور پیرانِ عظام ہی کے حق میں نازل ہوئی ہیں ۔ جو پرلے درجے کی خیانت دینی ہے ۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ۔ یہ ایک وہ فریبِ نفس ہے جس کی زد سے یہ فریب خوردہ افراد بغیر کسی درویش ہی کی توجہ کے قیامت تک نیکی کو نہیں پہنچ سکتے ۔ پھر ایک اور چیز بھی اس جماعت میں قابلِ ذکر ہے ۔ کہ پیرانِ عظام کی بیعت کو حرام کہتے ہوئے اپنی جماعت کے بعض حضرات کی بزرگی کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں ، اور ان سے بیعت ہونے کی لوگوں کو دعوت بھی دیتے ہیں ۔ اور وہ حضرات خود بھی قادری ، چشتی ، سہروردی ، نقشبندی فقراء کی بیعتوں کو شرعاً ناجائز فرماتے ہوئے اپنا بے بنیاد سلسلۂ بیعت جاری کر لیتے ہیں ۔ اور اتباعِ نفس کی تعلیم کو مسنون بیعت کا رنگ چڑھا کر یوں تبلیغ کرتے ہیں کہ ان پیروں کی بیعت خلافِ شریعت ہے ۔ اور ہماری مطابقِ سنّت ۔ سبحان اللہ ۔ صداقت وہ جو سر چڑھ کر بولے ، کوئی پوچھے ۔ ایں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند ۔ وہی کام دوسرے کریں تو حرام اور خود کریں تو ثواب

چونکہ اس جماعت کا تمام تر مدار الفاظ کے ذخیرے پر ہے اور شاید نہیں جانتے کہ بیعت کا حکم قرآن وحدیث میں ہے بھی یا نہیں ۔ اور اگر ہے تو متقدمین حضرات ، صحابہ کرام ، تابعین ، تبع تابعین اور ان سے متاخرین اصحاب نے اس کو کیا سمجھا ہے ۔ اور اگر جانتے ہوتے تو یوں شاید انکار نہ کرتے ۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے ، کہ ان کے اس ذخیرہ الفاظ کا جواب بھی دے ہی دیا جائے ۔ جس سے ثابت ہو جائے کہ مسئلہ بیعت کس قدر ضروری ہے اور کتاب اللہ جلّ وعلا شانہٗ و احادیث رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور اعمال اقوال متقدمین سے اسکی حقیقت کیوں کر منکشف ہوتی ہے ۔ وباللہ التوفیق ۔

یہ تو ایک مسلّمہ مسئلہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں رب العزت جلّ وعلا شانہٗ نے انسانی پیدائش کی علت غائی صرف اپنی عبادت اور معرفت قرار دی ہے ۔ اور وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ کے حکم سے یہ ثابت فرما دیا ہے کہ اس کے علاوہ دنیا میں انسانی پیدائش کی اور کوئی غرض و غایت نہیں کہ وہ اس کی عبادت کریں ۔ اور دوسرے لوازمات و اسبابِ زندگی اسی عبادت و معرفت کی تکمیل کے لئے ہیں ۔

چونکہ انسانی ڈھانچہ روح اور جسم کا مجموعہ اور ان ہی دو چیزوں سے مرکب ہے اور ان دونوں میں تغیرات و حوادثات کا آنا ممکن ہے ۔ اس لئے جسمانی علاج کی ضرورت کے ساتھ ساتھ روحانی قویٰ کی کمزوری بھی قابلِ علاج سمجھی گئی ہے

خوردو نوش کی بے اعتدالی اگر جسم کی صحت کو خراب کر دیتی ہے، تو ترکِ عبادت و ترکِ ذکر الٰہی اور بداعتقادوں کی صحبت سے روح بھی بیمار ہو سکتی ہے۔ جسم کی زندگی اگر پاکیزہ غذا اور صاف و شفاف پانی پر انحصار رکھتی ہے تو روح کی حیات و سلامتی کا دارومدار، عبادت الٰہی اور اعمالِ صالح پر موقوف ہے۔ پس جس طرح جسمانی امراض کے علاج کو حکیم جسمانی کی طلب ہوتی ہے عین اسی طرح روحانی آفات و بلیات سے بچنے کے لئے کسی طبیبِ روحانی کی بھی ضرورت ہوگی۔ اور وہ طبیب روحانی شیخ طریقت و مرشدِ حقیقت ہی ہو سکتا ہے۔ جس نے نبوت کے روحانیہ کالج سے ڈگری حاصل کی ہوئی ہو پس ایسے حکیم روحانی سے علاج کرانا بعیت اور شیخ کی حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔ متلاشیانِ حق کو چاہیئے کہ وہ ایسے شخص کی جستجو میں رہیں جو ان کی روحانی امراض کا علاج کر کے دربارِ رسالت کے قابل اور باخدا بنا دے۔ اقبال مرحوم نے کیا مزے کی بات کہی ہے۔ شعر

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے　　　بوسہ زن بر آستانِ کاملے

نیز فرمایا:۔ شعر

قدم را در تلاشِ آدمی زن　　　خدا ہم در تلاشِ آدمی ہست

کیونکہ اسلام نے تزکیۂ نفس کا جو طریق اختیار کیا اور ارشاد فرمایا ہے۔ اس میں علم و عمل کی دونوں طاقتیں شریک نظر آتی ہیں۔ اس کا علمی پہلو قرآنِ مجید اور احادیثِ نبوی کے نورانی صفحات میں نظر آتا ہے۔ اور عملی پہلو کو بانیٔ اسلام شارع علیہ السلام کے اعمالِ طاہرہ بے نقاب کرتے ہیں۔ لیکن اسلام کی صرف یہی خصوصیت نہیں کہ وہ نظری حیثیت سے علم و عمل کا جامع تھا۔ بلکہ اس کا اصلی معجزہ یہ بھی ہے کہ آنحضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم خود جس تعلیم کے مظہر حقیقی تھے۔ حضور نے صحابہ کرام اور بزرگانِ عظام کو بھی اس کا مجسم پیکر بنا دیا۔ اس بنا پر اگر آج ہم تعلیماتِ اسلام کی عملی تصویر دیکھنا چاہیں، تو جناب رسالت مآب علیہ السلام کی سیرت مبارک کے علاوہ اصحابِ پاک کے سوانح شریفہ اور بزرگانِ دین کے اعمالِ منیفہ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور ان آئینوں میں بھی ہم کو وہی آفتابِ ہدایت منعکس نظر آ سکتا ہے۔ جو خود صاحبِ شریعت علیہ السلام کے آئینہ خانہ میں ضیاء افگن تھا۔ مگر بصارت و بصیرت شرط ہے۔

قرآنِ کریم میں مسئلہ بعیت کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (پ ۶ - س مائدہ) ترجمہ۔ اے ایمان والو۔ اللہ کریم سے ڈرو۔ اور اسکی

طرف وسیلہ تلاش کرو۔ اور اس کی راہ میں (محنت و مجاہدہ) جہاد کرو۔ تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اس آیت شریفہ کی شرح میں کتاب قول الجمیل شاہ ولی اللہ محدث دہلوی میں لکھا ہے۔ کہ یہاں وسیلہ سے مراد نہ تو ایمان ہے۔ کیونکہ ایمانداروں سے تو پہلے ہی خطاب ہو رہا ہے۔ اور نہ ہی اعمال صالح، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ عباداتِ بدنی ہیں۔ کیونکہ یہ تقوے میں شامل ہیں۔ اسی طرح جہاد بھی مراد نہیں۔ وہ بھی تقویٰ میں شامل ہے۔ پس وسیلے سے مراد ارادت ہے۔ بیعت اور مرشدِ طریقت ہے۔ ایسے ہی منکرین کے راہنما مولوی اسماعیل دہلوی نے بھی رسالہ امامت میں وسیلہ سے مرد صالح مراد لیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"مراد از وسیلہ شخصے است کہ اقرب الی اللہ باشد"

یعنی وسیلے سے مراد وہ شخص ہے۔ جو بزرگی اور تقرب میں اللہ کریم کے بہت قریب ہو۔

قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ یَبۡتَغُوۡنَ اِلٰی رَبِّہِمُ الۡوَسِیۡلَۃَ اَیُّہُمۡ اَقۡرَبُ۔ (پ ۱۵۔ س بنی اسرائیل) یعنی اپنے رب کی جانب وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ ان میں کونسا اللہ تعالےٰ کے نزدیک اور زیادہ قریب ہے۔ جس کا وسیلہ اختیار کریں۔ تفسیر موضح القرآن میں اس آیت کے ماتحت لکھا ہے۔ وہ آپ ہی اللہ تعالیٰ کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے بہت نزدیک ہو۔ اس کا وسیلہ پکڑیں۔

پھر تیسری جگہ قرآن پاک میں ایک بیعت کے ذکر میں بشارت فرمائی گئی ہے۔ اور بشارت بھی کس جماعت کی بیعت پر جو انوارِ ازل کی روشن ضمیر، گنجینۂ اسرار کی خازن، قرآن کریم کی نقش پرداز، حدیث کی مصحفِ ناطق، دیوان خانہ نبوی کی دبیر، جانِ صدق، پیکرِ یقین، روانِ ایمان۔ صورتِ دین خلاصۂ کائنات اور عصارۂ ممکنات تھی۔ اور وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہو رہا ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰہَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا۔ پ ۲۶۔ ترجمہ۔ یعنی اے محبوب مکرم (علیک الصلوٰۃ والسلام) جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت آپ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں اور آپ کا نہیں، بلکہ خدا تعالیٰ کا ہی ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ پس جو شخص ایسا پکا قول و اقرار کرنے کے بعد اس کو توڑے گا۔ تو توڑنے کا وبال خود اسکی گردن پر ہی پڑے گا۔ اور جو اس عہد کو پورا کرتا رہے گا۔ جو اس نے خدا تعالیٰ

کے ساتھ کرلیا ہے۔ تو عنقریب خدا تعالیٰ اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے مطالب پر بحث کرتے ہوئے اہل تصوف کے بارہ اقسام بیان فرمائے ہیں۔ جن میں سے گیارہ مدعیوں کے عقائد و حالات بیان کر کے ان کو گمراہ اور شیطانی فرقے لکھا ہے اور بارہویں فرقہ کے متعلق فرمایا کہ وہ لوگ اہل قرآن وحدیث ہیں اور اہل سنت والجماعت کے عقائد میں راسخ وپختہ ہیں۔ جو دنیا کو آخرت کے لئے ترک کرتے ہیں اور اللہ کریم کے مطیع ومتواضع۔ آداب سنت پر عامل اور خلق خدا کے ساتھ نیکی کرنے والے جامع صفات وکمالات ہیں۔ ان کی خدمت میں بیٹھنا نوافل پڑھنے سے بہتر ہے۔

پھر فرماتے ہیں۔ اس آیت شریفہ میں بیعت کے مشروع ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہ امر مشہور ومتواتر اجماع امت سے ثابت ہے کہ بیعت امر شرعی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے چند قسم کی بیعتیں لی ہیں۔ کبھی کسی فعل کے کرنے پر کبھی ممنوعات کے ترک کرنے پر، کبھی ہجرت پر، کبھی جہاد پر، کبھی بیعت عام کبھی بیعت خاص کبھی کسی شخص خاص کی اور کبھی کسی قوم خاص کی۔ کبھی مردوں کی اور کبھی بحکم قرآن عام عورتوں کی۔ کہ ہم شرک نہ کریں گی چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، قتل اولاد نہ کریں گی اور ایک مرتبہ خاص انصار عورتوں سے بیعت لی کہ ہم نوحہ نہ کریں گی۔ کبھی مہاجرین کی بیعت لی کہ ہم کسی سے کچھ نہ مانگیں گے۔ اور منجملہ اقسام بیعت سے ایک بیعت خلافت بھی ہے۔ یعنی اہل ایمان متفق ہو کر صدق وصلاح کی نیت سے اپنے درمیان کسی ایسے شخص کو منتخب کرلیں جو دیانت وتقویٰ میں ممتاز۔ صائب الرائے اور عوام میں عظمت وامور سیاسیہ میں تحقیق تامہ رکھنے والا ہو۔ اور یہ انتخاب محض امور شرعیہ کے ماتحت ہو خلاف شریعت چھوڑا جا سکتا ہو۔

دوئم۔ بیعت اسلام۔ یعنی کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہونا۔ سوئم بیعت التقویٰ۔ یعنی کسی مرد صالح کے ہاتھ پر بدیں غرض بیعت کی کہ آپ مجھے جو تقویٰ کے متعلق ہدایات ہیں، وہ فرمائیں، میں عمل کروں گا۔ اور آپ میرے لئے دعا فرمائیں کہ رب العزت مجھے توفیق ومغفرت عطا فرمائے۔ یہ بیعت عام بندگان دین کا شعار رہا ہے۔

بعض لوگ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اگر یہ بیعت مسنون ہوتی تو زمانۂ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم میں جاری رہتی۔ سو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ سنت تین قسم کی ہے۔ قولی، فعلی، تقریری۔ پھر فعلی سنت کی دو قسمیں ہیں ایک موکدہ اور ایک زوائدہ یا مستحب۔ یعنی ایک وہ جس پر حضور علیہ السلام نے ہمیشگی فرمائی۔ اور ایک وہ جس پر

ہمیشگی نہیں فرمائی۔ سو یہ بیعت دوسری قسم سے ہے اور خلفائے راشدین کے ترک کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے مستفید ہو چکے تھے۔ اور کوئی بہت عرصہ بھی نہ گزرا تھا۔ اس لئے ان کو اس بیعتِ تقویٰ کی حاجت نہ تھی۔ بلکہ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ یہ بیعت فتنۂ حجاجیہ و مروانیہ کے باعث متروک رہی اور زوال بعد علماء صلحاء نے جب وقت فرصت دیکھا۔ اس طریقۂ مبارکہ کو جاری و زندہ کر دیا۔

حضرت واسطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ بیعت درحقیقت اللہ تعالےٰ کے ساتھ مقصود ہے۔ اور درمیان میں واسطہ حضور علیہ الصلوٰت والسلام فقط عارضاً ہے۔ یعنی جس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اس نے درحقیقت اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہٗ سے بیعت کی۔ کیونکہ حقیقتاً یہ بیعت بیعتِ الٰہی ہے۔ اس لئے کہ حضور علیہ السلام کا دستِ مبارک درمیان میں ایک واسطہ ہے۔ اور وہ بمنزلہ خدا تعالےٰ کے ہاتھ مبارک کے ہے۔

شیخ قاسم نصر آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بیعت ایک بڑی نعمت ہے۔ اور اس نعمت کی ہدایت کرنا اس سے زیادہ نعمت ہے۔ جو ہمیشہ مومنین وصادقین کا شیوہ رہا ہے۔

بیعت الرضوان کے متعلق یہ مشہور روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے جب عام صحابہ سے بیعۃ الرضوان لی تو اس وقت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ حضور کی طرف سے ایلچی ہو کر اہلِ مکہ کے پاس تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ لوگوں سے بیعت لینے کے بعد بلند آواز سے فرمایا۔ کہ الٰہی عثمان رضی اللہ عنہ تیرے رسول (علیہ السلام) کے کام پر گیا ہوا ہے۔ لہٰذا میرا یہ ایک ہاتھ عثمان رضؓ کا ہاتھ ہے۔ جس کو اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھ کر عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت لیتا ہوں۔ پس آپ نے اپنے ایک دستِ مبارک کو دوسرے دستِ مبارک پر رکھا اور حضرت عثمانؓ کی بیعت فرمائی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ حضور علیہ السلام کا دستِ مبارک حضرت عثمان کے لئے سب لوگوں کے ہاتھوں سے کس قدر افضل رہا۔ اس روایت سے اکثر مشائخین کرام نے بیعت کے اشد ضروری ہونے کی دلیل پکڑی ہے۔

پھر بعض مفسرین زیر آیت وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ لکھتے ہیں کہ اس کا اتباع کرو جس نے میری جانب رجوع کیا ہو۔ اور مقامِ قرب میں پہنچا ہوا ہو۔ اس سے مراد بیعت ہے۔ اللہ کریم جل مجدہٗ جس کی ہدایت چاہتا ہے۔ اسے کوئی سچا راہنما مل جاتا ہے۔ اور مرشد کے لئے ولی اللہ ہونا ضروری ہے۔ بیشک سچے مرشد اولیاء اللہ ہی ہوسکتے ہیں۔ پھر

جب کوئی ولی اللہ مرشد مل جائے تو اس سے بیعت اور راہِ رشد کی تعلیم حاصل کرو۔ اور اسکی ہدایت پر صبر و استقلال سے عمل کرو۔ تاکہ تم صراطِ مستقیم پر چل کر منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ۔ کیونکہ اصحابِ طریقت کے نزدیک انسان اسوقت تک کامل نہیں ہوسکتا۔ جب تک معقولات و منقولات کے محدود دائرہ سے نکل کر مشہودات کے میدان میں قدم نہ رکھے۔

اور یہ دولت بغیر مرشد و مجاہدہ کے حاصل نہیں ہوتی۔ محض علمِ ظاہر پر اکتفا کرنا کمالاتِ جنری سے محروم رہنا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر آدمی باوجود علمی رفعتوں پر فائز ہونے کے بھی اطمینانِ قلب جیسی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور آج تو کثرت سے اہلِ علم حضرات موجود ہیں۔ جن کے علامہ ہونے میں کلام نہیں۔ اور وہ اوامر و نواہی کے بھی نمونے سمجھے جاتے ہیں مگر نفس کی شرارتوں سے مامون نہیں ہیں۔ غصہ، حسد، غرور، حرص، ریا، بخل، تکبر اور عجب وغیرہ اوصافِ رذیلہ میں سے اکثر اوصاف میں ملوث نظر آتے ہیں۔ جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ نعمت قربِ ربانی سے محروم ہیں جس پر شرافت و طمانیت کا انحصار ہے۔ اگر ظاہری علوم ہی صلاح و فلاح کا ذریعہ ہوتے تو تمام اہلِ علم عارفینِ حق ہوجاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب انسان کو راہِ حق پیش کرسکتی ہے۔ مگر ہدایت یافتہ نہیں بنا سکتی۔ قانون کسی جرم کے عوض میں مجرم کو بیڑیاں ڈال سکتا ہے مگر اس کو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ پس یہی سبب ہے کہ قدرت نے تمام کتابوں کے ساتھ عملی نمونے مبعوث فرمائے ہیں۔ اور یہ آیتِ کریمہ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ راہ رشد مرشد کامل ہی سے مل سکتی ہے۔

بنابریں مطلب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے قبل حق سبحانہٗ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام سے راہ رُشد کی تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حسب الحکم باری تعالےٰ عزاسمہٗ حضرت خضر علیہ السلام سے ملے اور کہا کہ اگر آپ مجھے راہِ رشد تعلیم کریں تو میں آپ کی صحبت میں کچھ دن رہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کرسکیں گے۔ کیونکہ اس راہ کی بعض باتیں فہم سے بالاتر ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ اور میں آپ کے معاملات میں مداخلت نہیں کروں گا۔ اور نہ آپ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔ اس قصہ میں اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ نے طالبانِ حق کو جہاں راہ رشد کی کسی پیر کامل سے تعلیم لینے کی ہدایت فرمائی ہے۔ وہاں چند ایسی باتوں کی آگاہی بھی فرمائی ہے۔ جو راہبر و طریقت کے لئے نہایت ضروری و لابدی ہیں۔

۱- یہ کہ طریقت کی تعلیم مرشدِ کامل کے پانے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ خود بخود نہیں آتی۔

۲- یہ کہ طریقت یا راہ رشد کے حصول کیلئے صحبت و خدمت مرشد بھی ضروری ہے۔

۳- ہدایت و تعلیم مرشد میں صبر و استقلال سے کام لینا چاہئے۔

۴- اطاعتِ شیخ کا معاہدہ کرنا اور آئندہ ہمیشہ کے لئے اس معاہدہ پر قائم رہنا۔

۵- اگر بعض باتیں مرشد سے ایسی ظہور میں آئیں جو ارادتمند کے فہم و وہم سے بالاتر ہوں تو اعتراض نہ کرے۔ کیونکہ سالک راہ و رسم سلوک کی منزل میں بے خبر نہیں ہوتا۔

گویا ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر اقبال مرحوم کا یہ اشارہ۔ شعر

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے ۔۔۔ بوسہ زن بر آستانے کاملے

اسی مسئلہ اتباع و بیعت کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ جس کے بغیر میدان معرفت الٰہی میں کوئی چارہ نہیں۔

امام وہاب الدین شعرانی نے کتاب انوار قدسیہ میں شیخ کامل کی پیروی کو واجب ثابت کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اندرونی نجاستوں کا دور کرنا واجب ہے۔ پس اس کے لئے دور کرنے کا طریق بھی حاصل کرنا واجب ہوگا جس سے وہ دور ہو سکیں اور وہ سوائے اتباع شیخ کامل کے اور کوئی طریق نہیں۔ پھر لکھتے ہیں۔ وَلَو تَکَلَّفَ لَا یَنفَعُ بِغَیرِ شَیخٍ وَلَو حَفِظَ اَلفَ کِتَابٍ یعنی آدمی اگر خود بخود اپنی اصلاح کرنے لگے تو اسے کچھ فائدہ نہ ہوگا اگرچہ ہزاروں کتابیں حفظ کرے۔

صاحب جامع الاصول فرماتے ہیں۔ کہ قدیم سے رسم چلی آتی ہے اور تجربہ بھی اس پر گواہ ہے کہ اندرونی نجاستوں اور غلاظتوں مثلاً غرور، نخوت، عجب، ریا، کبر، حرص، طمع، شہوت، طلب جاہ وغیرہ جو امراض مہلکہ ہیں سے پاک و صاف ہونا اور نماز کو حضور قلب و خشوع و خضوع سے ادا کرنا، جسکو حدیث نبوی علیہ السلام اَن تَعبُدَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ میں لفظ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شیخ کامل کی تربیت کے سوا ممکن نہیں۔ کیونکہ شیخ ہی اندرونی امراض کا واقف اور ان کے علاج کی مہارت رکھتا ہے۔ یہ بات علم ظاہر کے حاصل کرنے اور کتابوں کے انبار اٹھا لینے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ نفس امارہ کی باریک راہزنیوں اور مخفی فریبوں سے بعض بڑے بڑے فقہ و حدیث کے علماء بھی محفوظ نہیں رہے ہیں۔ عیاذاً باللہ۔

حضرت قطب الاقطاب سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کتاب غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں کہ شروع سے اللہ تعالیٰ نے روحانی تربیت کا سلسلہ اسی طرح جاری کیا ہے کہ ایک فیض دیتا ہے اور دوسرا حاصل کرتا ہے جیسے انبیاء علیہم السلام اور ان کے جانشین، پھر ان کے تربیت یافتہ، علیٰ ہٰذا القیاس یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور بہ ارشادِ الٰہی ناممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کسی شخص کو دوسرے کی تربیت کے سوا مقامات عالیہ تک ترقی دے اور نہ ہی اس پر کوئی دلیل قائم ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اکثر یہی ہوا ہے کہ سوائے تربیت شیخ کے کوئی شخص منازلِ سلوک طے نہیں کر سکتا۔ فَلَا یَنْبَغِیْ لَہٗ اَنْ یَّنْقَطِعَ عَنِ الشَّیْخِ حَتّٰی یَسْتَغْنِیْ عَنْہُ بِالْوُصُوْلِ اِلٰی رَبِّہٖ عَزَّ وَجَلَّ یعنی شیخ کی خدمت وضرورت سے اس وقت تک علیحدہ نہیں ہونا چاہئے۔ جب تک کہ وصول الی اللہ یعنی منزل مقصود تک نہ پہنچ جائے۔ کیونکہ رسم و عادات کے خود ساختہ اسلام کو چھوڑنا۔ حقیقت کی جانب آنا اور تعصب سے پاک ہونا۔ بدظنی اور سنی سنائی منکرین کی بیہودہ باتوں کے اثر سے محفوظ رہنا سوائے شیخ کامل کی تربیت وصحبت کے ممکن ہی نہیں۔

چنانچہ اسی نظریہ کی تائید میں حافظ ابن حجر شارح صحیح بخاری بڑے زور سے لکھتے ہیں۔ حَیْثُ قَالَ فَلْیَتَّخِذْ لِقِبْلَتِہٖ وُجْہَۃً وَلَا یَلْتَفِتْ اِلٰی مَنْ یَّتَعَصَّبُ وَیَسْتَخِرُّ وَدَعِ الْمَشَائِخُ وَاَمْرُ فَہُمْ یَقُوْ بَیْنَ الشَّرِیْعَۃِ وَالْحَقِیْقَۃِ وَلْیَتْرُکْ رُسُوْمَہٗ وَلْیَدْخُلْ تَحْتَ اِشَارَتِہٖ وَمَنْ ظَفَرَ بِشَیْخٍ ھٰذَا الْوَصْفِ فَحَرَامٌ عَلَیْہِ اَنْ یَّتْرُکَہٗ وَیَدُلُّکَ عَلَیْہِ اِلَّا دِلَّۃُ الْاَرْبَعُ بَلْ یَشْہَدُ لَہُ الْکُتُبُ السَّمٰوٰتِیۃِ یعنی طالب خدا کو چاہئے کہ کسی شیخ عارف کامل کو اپنا رہبر مقرر کرے۔ اور اہلِ تعصب کی باتوں کو ہرگز نہ سنے۔ اور یہ خیال رکھے کہ شیخ عارف کامل ہو۔ اور احکام شریعت وطریقت سے پورا واقف ہو۔ اور چاہئے کہ رسم و عادت کے اسلام کو چھوڑ کر اپنے شیخ کے حکم پر چلے کیونکہ وہ اسے صحیح اسلام پیش کریگا۔ اور جب کسی شخص کو ایسا رہبر کامل مل جائے تو اس پر ایسے شخص کو چھوڑنا حرام ہے اور ہمارے اس دعوے پر کتاب و سنت و اجماع امت و قیاس صحیح چاروں دلیلیں شہادت دے رہی ہیں۔ بلکہ چاروں آسمانی کتابیں بھی گواہ ہیں۔

سوائے عزیز ہر ذی فہم کے لئے لازم ہے کہ کسی شیخ کامل کی تلاش کرے اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر سرکشی سے بچے اور راہِ آخرت میں غور سے کام لیتے ہوئے اس کی ہدایات پر طریقت وحقیقت کے میدان میں قدم مارے۔ کیونکہ

شیخ عزالدین محدث جو علماء دین کے گروہ میں بڑے پایہ کے عالم گزرے ہیں، فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام کی حقانیت پر یہی دلیل کافی ہے کہ یہ لوگ اہلِ حقیقت ہیں اور حقیقی علوم اور زہد وخشیت و اخلاص کے مالک ہیں جن سے ہم لوگ بے بہرہ ہیں۔ امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ اکثر حضرت بشر حافی ؒ کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ شاگردوں نے امام صاحب ؒ سے پوچھا کہ آپ تو خود بڑے عالم ہیں اور حدیث وفقہ واجتہاد میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ پھر آپ ایک شوریدہ حال کے پاس کیوں جاتے ہیں۔ امام صاحب نے جواب میں فرمایا۔ بیشک میں ان تمام علوم میں بشر سے بڑھا ہوا ہوں مگر اللہ تعالےٰ کو وہ مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ یعنی اسکو علم معرفت الٰہی مجھ سے زیادہ ہے۔

ایسا ہی آپ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ آپ شروع شروع میں اپنے بیٹے کو اس گروہ کی مخالفت میں تلقین فرمایا کرتے کہ بیٹا خبردار رہو۔ ان لوگوں کی صحبت میں نہ جانا جن کو لوگ صوفی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ شریعت کے احکام سے بے خبر ہوتے ہیں۔ مگر بعد ازیں جب خود امام احمد حنبل ؓ کو حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیٹھنے اور حقائق شریعت کو آپ سے حل کرنے کا موقعہ ملا۔ تو آنکھیں کھلیں۔ پھر اپنے صاحب زادے کو نصیحت فرمانے لگے کہ بیٹا دیکھنا کہیں ان لوگوں پر جنہیں صوفی کہتے ہیں، بدظنی نہ کرنا۔ اور کبھی ان کی صحبت سے غافل نہ ہونا۔ کیونکہ یہ حضرات ان اسرار ومعارف کے خزانوں پر مطلع ہوتے ہیں۔ جن پر علماء، فقہ وحدیث سینکڑوں دفتروں سے بھی نہیں ہو سکتے۔

مولوی عبدالجبار غزنوی امیر جماعت اہلِ حدیث اپنی کتاب اثبات الالہام والبیعت کے ص۱۵ پر اس آیت مبارکہ سے بعیت توبہ پر استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کل اقسام بعیت، بعیت توبہ ہی میں داخل ہیں۔ بعیت توبہ کیا ہے سب گناہوں سے توبہ کرنا اور امر شرعیہ کی تعمیل کا وعدہ کرنا۔ اور یہی ہے بعیتِ اسلام گویا شرک وکفر اور گناہوں سے تائب ہونا اور احکام شرعیہ کے بجالانے کے واسطے عہد کرنا پھر اسی طرح ہے بعیتِ جہاد۔ اثبات اور صبر کا وعدہ دینا اور نافرمانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونزاع باہمی اور میدانِ جنگ کے بھاگنے سے بیزار ہونا۔ پس بعیت توبہ، بعیت الاسلام، بعیتِ تقویٰ ایک ہی چیز ہیں۔ اور بعیتِ جہاد ان کی ایک فرد ہے۔

پھر چوتھی جگہ ارشاد ہوتا ہے لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ - ترجمہ - یعنی تحقیق اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہو چکا جس وقت وہ تجھ سے درخت کے نیچے بیعت کرتے تھے - پس ان کے دلوں میں جو کچھ تھا، جان لیا - پھر ان پر تسلی نازل کی - اس آیت سے معلوم ہوا کہ بیعت کرنے سے سکینہ کا نزول ہوتا ہے اور تسکین قلب نصیب ہوتی ہے

۵ - پیر طریقت کی متابعت کرنا مامور من اللہ ہے - جبکہ مولا کریم نے ارشاد فرمایا ہے - وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (پ۲۱ - س لقمان) ترجمہ - اے انسان تو اس شخص کی پیروی کر - جس نے اپنے دل کو میری جانب پھیر رکھا ہو - اور مقام قرب میں پہنچا ہوا ہو - پھر فرمان ہوتا ہے - کہ فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (پ۱۷ - س انبیاء) یعنی اگر تمہیں معلوم نہیں تو اہل ذکر سے معلوم کر لیا کرو - مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی مسئلہ شرعی کی تصدیق و تحقیق مطلوب ہے - تو علمائے مجتہدین کی جانب رُخ کرو اور اگر علوم مکاشفہ و مسائل طریقت کا مل چاہتے ہو، تو اصحاب کشف - اہل اللہ، پیران عظام اور اولیاء کرام کی خدمت میں جاؤ -

اس کے بعد یوں حکم ہوتا ہے کہ یٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (پ۱۱ - س توبہ) کہ جب بیعت شیخ اختیار کر چکو تو اس کی صحبت میں رہو - یعنی اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو تا کہ ان کے فیض صحبت سے دنیا و آخرت میں سعادت نصیب ہو کیونکہ جس سے آدمی محبت کرے گا - قیامت کو اس کا حشر و نشر اسی کے ساتھ ہوگا - قرآن کریم فرماتا ہے - يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ - یعنی قیامت کے دن ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے - پھر ایسے وقت کے لئے مردانِ کامل سے قلبی تعلق پیدا کرنا عین سعادت اور رضائے الٰہی ثابت ہوتا ہے - اور یہ آیت اس مسئلہ کی تصدیق میں نہایت فیصلہ کن اشارہ فرماتی ہے - شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر عزیزی جلد اول میں زیر آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (یعنی دکھا ہم کو سیدھی راہ، ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام فرمایا) لکھتے ہیں کہ یہ چار گروہ انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین ہی راہِ راست پر ہیں اور ان ہی کی راہ سیدھی ہے پس بندے کو چاہئے کہ خدا تعالیٰ سے مناجات کے وقت ان چاروں جماعتوں کو اپنے ذہن میں حاضر رکھے اور ان ہی کی راہ طلب کرے - جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورہ نساء میں فرماتا ہے وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (پ۵ س نساء) یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کریگا وہ قیامت میں ان لوگوں

کے ساتھ ہوگا - جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے - اور اس کو رسولوں، نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالح لوگوں کی معیت نصیب ہوگی - جو بہت اچھے رفیق ہیں - اور چونکہ انبیاء علیہم السلام کی رفاقت حاصل کرنے سے پہلے صدیقوں کی، اور صدیقوں کی رفاقت حاصل کرنے سے پہلے شہیدوں کی اور شہداء کی رفاقت حاصل کرنے سے پہلے صالحین کی رفاقت حاصل کرنا تدریجاً ضروری ہے - اس واسطے سلسلہ اولیاء اللہ میں بطریق بیعت داخل ہونا اور ان کے ساتھ وسیلہ ڈھونڈنا اہلِ اسلام کے نزدیک نہایت ضروری اور مستحسن ثابت ہوتا ہے - جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا - تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ط یعنی اے خداوندِ عالم مجھے فرمانبردار مار اور اپنے پاک بندوں سے ملا دے - اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ط یعنی اے ارحم الراحمین اپنی رحمت سے مجھے اپنے صالح بندوں میں داخل فرما اور سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ - یعنی اے میرے پروردگار مجھ کو حکم بخش اور صالحین کے ساتھ ملحق فرما دے - اس کی جانب ایک نہایت پاکیزہ اشارے سے ثبوت دیتی ہیں اور اسکی تائید میں وہ ارشادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یادداشت کے قابل ہیں - جو کتب صحاح ستہ میں مندرج ہیں - مثلاً ۱ بخاری شریف میں ایک حدیث حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم حضور علیہ السلام کے گرد بیٹھے ہوئے تھے تو آپ نے فرمایا - بَایِعُوْنِیْ عَلٰۤی اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَیْئًا وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْا فِیْ مَعْرُوْفٍ - یعنی تم لوگ مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور چوری و زنا اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا اور نہ ہی اپنی طرف سے بنا کر کسی پر بہتان باندھنا - اور کسی اچھی بات میں خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہ کرنا - پھر حضرت عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ ہم سب کے سب لوگوں نے انہی شرائط پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر لی ؎

۲ - اسی طرح بخاری شریف میں ہی عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ایک اور روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے بلا کر بیعت لی اور فرمایا - اَنْ بَایَعْنَا عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِیْ مَكْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَیُسْرِنَا الاٰخر - یعنی اقرار کرایا کہ کہو بیعت کی ہم نے سننے میں اور فرمانبرداری کرنے پر اپنی خوشی اور رنج تنگی اور فراخی

یں اور بادشاہوں سے اپنے واسطے عیش و آرام کی چیزیں اختیار کرنے میں اور سلطنت کے بارہ میں بادشاہوں سے جھگڑا کرنے میں مگر جب تم کفر کو ظاہر دیکھو۔ جس میں خدا کی طرف سے تمہارے پاس دلیل ہو۔

۳۔ ابنِ ماجہ میں روایت ہے کہ حضور اکرم رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے فقراء مہاجرین سے اس بات پر بیعت لی کہ عَلٰی اَنْ لَّا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ شَیْئًا اَحَدَهُمْ یَسْتَقِطُ سُوْطِهٖ فَیَنْزِلُ عَنْ فَرَسِهٖ فَیَاْخُذُهٗ وَلَا یَسْئَلُ اَحَدًا امر یعنی وہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کریں گے۔ پھر ان حضرات کا یہ حال تھا کہ اگر اُن کے ہاتھ سے کوڑا (چابک) بھی گر جاتا تو گھوڑے سے اُتر کر خود ہی اُٹھاتے اور کسی سے اس کے اٹھا دینے کا سوال نہ کرتے

۴۔ ایک اور روایتِ بخاری شریف سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ غزوۂ خندق کے دن حضور علیہ السلام نے سب مہاجرین و انصار کے لئے دعائے مغفرت فرمائی تو ہم سب نے عرض کیا نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَی الْاِسْلَامِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا۔ یعنی ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام پر بیعت کی ہے۔ جب تک ہم زندہ رہیں گے اور اس معرکہ میں تمام مہاجرین و انصار حاضر تھے، کوئی ایک بھی خادم غیر حاضر نہ تھا جس نے بیعت نہ کی۔

۵۔ اسی طرح کی ایک اور روایت بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ بخاری شریف میں مندرج ہے۔ کا نو خمس عشیرۃ مائۃ الذین بایعوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الحدیبیہ۔ یعنی پندرہ سو آدمی تھے جنہوں نے حدیبیہ کے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔

مندرجہ بالا دلائل قرآن و احادیث و اقوال متقدمین سے مسئلہ بیعت کی حقیقت اور جواز و عدم جواز کا پتہ چل گیا ہوگا۔ اور جو لوگ یہ کہہ کر عوام کو بہکایا کرتے ہیں کہ قرآن و حدیث کے ہوتے ہوئے بیعت پیر کی کیا ضرورت ہے ان کی ایمانی کیفیت بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ یہ نام نہاد عاملین حدیث کہاں تک پابندِ قرآن و حدیث ہیں اور ان کا عامل بالحدیث ہونا کہاں تک صحیح ہے۔ اور ان بہکانے والوں کا پروپیگنڈا جس تیزی اور سرعت سے لوگوں اثر انداز ہو رہا ہے۔ اسے ہر صاحب بصیرت اور درویشوں کا غلام اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔ فقیر پوری ذمہ داری سے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ ہمارے ہاں کا انگریزی خواں طبقہ اور خصوصاً وہ عوام جو علم دین سے بے بہرہ ہیں۔ سوائے محدودے چند اس بدعقیدگی کا پورا پورا شکار ہو چکے ہیں۔ بہکانے والے کی چکنی چپڑی باتیں، نئے نئے اجتہادی ڈھکوسلے۔

درویشوں اور صوفیوں سے عام بغاوت اہل حال وقال کے برخلاف نفرت کے جذبات وہ رنگ لائے ہیں، کہ اکثر سینے اہل اللہ اور اولیاء اللہ کی اطاعت ومحبت سے خالی ہو گئے ہیں اور بلاشبہ اکثر اہل اسلام تعلیمات کے اعتبار سے محروم اطاعت اور اپنی اعتقادی صورت میں علیٰ حالہ قائم ہیں۔ جو لوگ پاکستان و ہندوستان میں کانگرسی دین اور برہمنی سیاست کے دلدادہ ہو کر واردھا کے مہنت کی صدری تجلیات پر مرمٹے ہیں انہوں نے ایک مدت سے رائج وخاسر عقیدۂ ملت اور خود ساختہ ویدانتی نظریۂ فقر کے ساتھ وہ سازگاری اختیار کر رکھی ہے۔ جو حقیقتاً اسلام سے اتنا ہی دور ہے۔ جتنا مدنی اور واردھائی تعلیم کا فرق ہے۔

عورتوں کی بیعت

پھر مومنین کی بیعت کے علاوہ مومنات کی بیعت پر تو وہ کیچڑ اچھالا جاتا ہے کہ توبہ بھلی' ان کے نزدیک عورتوں کا سینماؤں' میلوں' کلبوں' ووٹنگ اسٹیشنوں کے دنگلوں' اسمبلی ہالوں' سرکاری بھرتیوں' سفارتخانوں' دفاتر کی ملازمتوں' فوجی اور ملکی اداروں میں جانا جائز تو درکنار مستحسن' موجب ثواب دارین' قوم وملت کی فلاح وبہبود اور دنیوی ترقی کا باعث ہو سکتا ہے۔ مگر جہاں کسی شریف خاتون نے کسی پیر طریقت سے خدا تعالیٰ و رسول خدا کی محبت اور عقبیٰ کی نجات کیلئے کوئی وظیفہ سیکھا اور کسی اللہ کے نیک بندے کی خدمت میں جا کر توبہ کی اور صراط مستقیم کی ہدایت چاہی' فوراً آوارہ' گمراہ' بدکارہ' مکارہ' فرین' کٹنی کے فتووں کا شکار ہوئی۔ حالانکہ اس کا یہ فعل قرآن وحدیث کے خلاف نہیں۔ اور وہ ایسا کرنے میں عنداللہ وعندالرسول قطعاً حق بجانب ہوتی ہے۔ اگر باور نہ ہو تو قرآن کریم کی اس آیت کو پڑھ کر اس کے حق پر ہونے اور کسی بزرگ کی بیعت کر کے تلاش حق کرنے کا شرعی فیصلہ کر لیجئے۔ جس میں پروردگار عالم جلشانہ اپنے محبوب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتے ہیں۔ يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ط یعنی اے نبی کریم محبوب رؤف ورحیم صلی اللہ علیک وسلم جس وقت تیرے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرتی ہوئی آئیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی اور چوری وزنا نہ کریں گی اور اپنی اولاد کو بھی قتل نہ کریں گی اور اپنے ہاتھ اور پاؤں سے کسی پر بہتان وطوفان نہ باندھیں گی۔ یعنی نہ تو کسی پر جھوٹا دعویٰ ہی کریں اور نہ

جھوٹی گواہی دیں۔ اور نہ ہی حکم شرع سے آپ کی نافرمانی کریں۔ پس ان سے بیعت قبول کر اور ان کے واسطے بخشش مانگ تحقیق اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (پ۲۸۔ س ممتحنہ) مستورات کی بیعت کے متعلق یہ آیت ایسی واضح دلیل ہے۔ جس سے انکار کا حق سوائے حاسد و مبغوض منکر کے کسی دوسرے کو نہیں پہنچتا۔ ممکن ہے کہ متعصبین اس سے متاثر نہ ہوں۔ مگر صاحب سعادت کیلئے اپنی غلطی کی اصلاح کر لینا بعید از قیاس نہیں۔ شعر

بمقبولی کسے را دسترس نیست　　　　قبول مقبلاں در دست کس نیست

خطیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ جو عورتیں ہجرت کر کے مدینے پہنچیں پہلے ان کی آزمائش کا اور پھر ان سے بیعت لینے کا حکم ہوا۔

اسی کے مطابق حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے کہ جو عورتیں ہجرت کر کے مدینے آئی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت سے ان کا امتحان فرماتے تھے۔ پس جس عورت مومنہ نے ان شرائط کے ساتھ اقرار کیا۔ آپ اس کو زبانی فرماتے کہ میں نے تجھ سے بیعت قبول کی۔ اس حدیث کو امام بخاری وغیرہم نے روایت کیا ہے

فتح البیان میں ابن الجوزی سے نقل کیا گیا ہے کہ تمام جن عورتوں نے بیعت کی ان کی تعداد چار سو ستاون تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت سے ہاتھ نہیں ملایا۔ بلکہ صرف کلام مبارک سے بیعت فرماتے تھے۔ بعض حضرات متاخرین نے ابن الجوزی کی اس تعداد کے متعلق یہ شبہ کیا ہے کہ یہ تعداد صحیح نہیں۔ ابن الجوزی کا یہ اندازہ یا تو صرف مکہ مکرمہ میں بیعت کرنے والی عورتوں کا ہے۔ یا کسی ایک مجلس بیعت کا۔ ورنہ بیعت کنندہ تمام عورتوں کی تعداد اس تعداد سے کہیں زیادہ ہے اور یا تحقیق ابن الجوزی کے ماتحت باقی مستورات نے بیعت نہ کی ہوگی۔ مگر یہ امر صحابیات کے حق میں قرین قیاس نہیں۔

حضرت اسماء بنت یزید انصاریہ فرماتی ہیں کہ میں ان عورتوں میں شامل تھی۔ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ پس میں نے ہی عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا دست مبارک بڑھائیے تاکہ ہم بیعت دیں تو آپ نے فرمایا کہ میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا ہوں۔

اسی طرح حضرت سلمیٰ بنت قیس انصاریہ رضی اللہ عنہا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں قدیم الاسلام اور دونوں قبلوں یعنی خانہ کعبہ اور بیت المقدس کی جانب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے والی تھیں

روایت فرماتی ہیں کہ جب میں ایک جماعت زنانِ انصار میں بیعت کرنے آئی۔ اور آپ نے اس بیعت کی چھ باتوں کا عہد لیا جو آیت قرآنی میں درج ہیں۔ تو اس کے بعد فرمایا۔ کہ تم لوگ اپنے خاوندوں سے غش نہ کرو۔ پھر جب ہم سب بیعت کر کے واپس ہوئیں تو میں نے ایک عورت سے کہا کہ واپس جا کر دریافت کر کہ یا رسول اللہ غش کیا چیز ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے شوہروں کا مال لے کر غیر کو پردے پردے میں نفع پہنچانا اور خود اس سے آنکھ نیچی رکھنا یہ فعل غش کہلاتا ہے۔

ابن جریر نے بطریق عوفی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا کے اوپر سے حضرت سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ عورتوں سے کہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے اقرارِ بیعت کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ پوری آیت پڑھی۔ اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے بیعت لی ہے۔ مگر کسی عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ مبارک میں لے کر اس کو بیعت نہیں فرمایا۔ اور بھی اکثر روایات سے ثابت ہوتا ہے مگر ایک روائت میں شعبی فقیہ تابعی نے کہا ہے کہ حضور سرورِ کائنات مفخر موجودات علیہ السلام والتحیات نے عورتوں سے بیعت لی درآنحالیکہ آپ کے ہاتھ مبارک پر کپڑا تھا۔ جبکو آپ نے ہتھیلی پر رکھ لیا تھا۔

رسم بیعت مسنون ثابت ہونے کے بعد اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ ہستی کیسی ہونی چاہئے جس کو پیر کا درجہ دیا جا سکے کیونکہ آجکل جن لوگوں کو پیر سمجھا جاتا ہے ان کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ اصحابِ اصول ۲۔ اصحاب وصول ۳۔ **اصحاب فضول**۔ ان میں سے اصحابِ اصول تو وہ لوگ ہیں جو تصوف کی مباحث علمیہ و اصطلاحات علمیہ میں مشغول رہتے اور ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور اصحابِ وصول وہ ہیں جو بغیر تعلیم شیخ کامل کے خود بخود اعمال و اشغال میں لگ کر وساوس کو واردات، تخیلات کو تجلیات خوابوں کو مکاشفات، مظنونات کو القا اور اضغاث کو الہام جانتے ہیں، اصحاب فضول وہ ہیں جو سلوک و تصوف سے ناواقف محض ہونے کے باوجود جلبِ منفعت یا وقارِ خاندانی کے لئے صوفیانہ وضع قطع اختیار کر لیتے ہیں۔ انکو عبادات و ریاضات اور مشاہدات و مجاہدات وغیرہ سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کی ناکامیوں سے مجبور ہو کر کوچہ فقر میں پناہ گزیں ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان کی پیری کا تمام تر مدار چند فالنامے، چند وظیفے، چند عملیات

حب وبغض اور چند شجرے ہوتے ہیں۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ عقائد متزلزل و متذبذب۔ اخلاق تباہ و خراب، علم مفقود، معاملات پراگندہ اور حالات ایسے ناگفتہ بہ کہ توبہ بھلی، مگر ولایت کے دعویدار پھر بھی ہوتے ہیں۔ بنا بریں ضرورت ہے کہ متقدمین کی زبان سے سنیں کہ وہ پیری کا مستحق کس کو فرماتے ہیں۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پیر وہ ہے، جب کچھ کہے تو اس کا کہنا اس کے حال کی حقیقت ہو اور جب چپ رہے تو اس کا معاملہ اس کے حال کو بیان کرے اور دنیوی علائق کو چھوڑ دینے پر اس کا حال گواہ ہو۔

حضرت عبید اللہ دینوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پیری کا حقدار وہ ہے جو ظاہری لباس سے عوام کو متعجب نہ کرے۔ جس نے درویشی و پیری کا انحصار ظاہری لباس پر رکھا اور ظاہر کو زینت دی۔ اس نے اپنے باطن کو خراب کر دیا یعنی جو شخص عزت کو باطل کے ساتھ طلب کرتا ہے تو خدا تعالےٰ اس کو خواری دیتا ہے۔

حضرت ابوالحسن بیروانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پیر وہ ہے جو مقامات و حالات سے گزر چکا ہو۔ اور سب اس کے زیر قدم اور حال میں جمع ہوں۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پیر وہ ہے جو ہمت کو یگانہ رکھے اور خلقت سے بیگانہ ہو کر جیئے۔

حضرت محمد جمال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پیر کا مقام یہ ہے کہ جن باتوں کا خدا ضامن ہو چکا ہے ان پر بھروسہ کرے خدا کے حکموں کی تعمیل اور محافظت کرے اور دونوں جہان سے علیحدہ ہو کر خدا سے ملے۔ غیر کی طرف التفات نہ کرے اور خدا کی علانیہ عبادت میں غیر کی اطاعت سے باطنی آزادی رکھے۔

حضرت ابوبکر ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے مشائخین نے پیر کی یوں تعریف فرمائی ہے کہ کسی چیز کی طمع نہ کرے اور اگر کسی چیز کو اپنے پاس آتا دیکھے تو منع نہ کرے۔ بشرطیکہ طیب ہو۔ اور جب لے تو جمع نہ کرے۔

حضرت عبدالخالق دینوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پیر کو چاہیئے، توفیقِ خدا کے ماتحت بڑوں سے ملے اور چھوٹوں کی ملاقات کا خواہشمند نہ ہو۔ یعنی عمر رسیدہ افراد سے موانست کرے اور امرد بچوں سے مجتنب رہے بعض درویش جو اس کو علتِ مشائخی کہکر ایسا کرتے ہیں یہ ان کی ذلت و حماقت اور کم عقلی کی دلیل ہے۔

شیخ لقمان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، وہ پیر نہیں جو جاہل ہو۔ بغیر علم شرعی و لدنی کے پیری کا بار اٹھانا بعض اوقات کفر کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پیر وہ ہے جو سر سے قدم تک خدا کی یاد میں ہو اور متابعت سنت سے باہر نہ پایا جائے۔

حضرت خواجہ مشکلکشا بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ پیر وہ ہے جو خلوت در انجمن کے اصول پر کام کرے۔ اگر اس سے بے بہرہ اور ناواقف ہو تو اسکی صحبت سے پرہیز بہتر ہے۔

خواجہ علاؤالدین عطارؒ فرماتے ہیں۔ پیر وہ ہو سکتا ہے، جسکی صحبت و حسن تربیت سے ہر طالب نقصان و دوری کے عذاب سے نکل کر قرب وکمال کی درگاہ تک پہنچ جائے۔

حضرت جلال الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پیر ہونے کے لئے کم ازکم یہ وصف ہونا چاہئے کہ بے بھوک کھانا نہ کھائے۔ اگر ایسا کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

حضرت قبلہ شیخ الشیوخ شیخ العالم شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پیر وہ ہے جو آدم علیہ السلام سے لیکر وقت حاضری تک مرید کے تمام حالات وانتظامات ارحام وگذشتہ ایام سے واقف ہو اور یہ جانتا ہو کہ یہ کن کن کیفیتوں سے ہر زمانہ میں گزرا ہے۔

شاہ عبدالرزاقؒ فرماتے ہیں کہ پیر وہ ہے جو پہلی نگاہ سے طالب کے ہفت اندام کو بہتے پانی کی طرح پاک کر دے

حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ پیر وہ ہے جو مجاہدہ میں مشاہدہ منکشف فرما دے

حضرت علاؤالدین مظہریؒ فرماتے ہیں کہ جو پیر طالب کو حضوری کے مرتبہ تک نہ پہنچا سکے اور حضور علیہ السلام سے تلقین نہ دلا سکے۔ وہ پیری کے قابل نہیں بلکہ وہ ناقص ہے۔ لیکن مرید کو بھی استعداد شرط ہے۔ جلد بازی نہ کرے۔ کیونکہ سالک راہ سے بے خبر نہیں ہوتا۔

جناب سید اسعد الدینؒ لکھتے ہیں کہ پیر وہ ہے جو طریقت کے چاروں مراتب جن میں طالب کو بھٹکنے کا خوف ہے سلامتی سے عبور کرا دے۔ کیونکہ مرید اگر اس فتنۂ نفس میں مبتلا ہو جائے تو اس کا پھسل جانا یقینی ہوتا ہے۔ یعنی

۱۔ محض نفس سے کشف وکرامات کا ظہور میں آنا۔

۲۔ خلق خدا کا رجوع

۳۔ تسخیر چرند و پرند و بہائم وغیرہ۔

۴۔ عالمِ بالا کی وہ سیر جس میں طالب کو اپنے آپ پر قطب وغوث ہونے کا شبہ ہونے لگے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں۔ کہ پیر وہ ہوسکتا ہے۔ جسکی صحبت میں خدا یاد آجائے اور محبت دنیا کم اور محبت حق زیادہ ہو۔

حضرت ابو عبداللہ سجزیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ کی تین علامات ہیں۔ بلند ہوکر تواضع اختیار کرنا۔ مال کی قدرت رکھ کر زہد کو لازم پکڑنا اور قوت ہوتے ہوئے بھی انصاف کو عمل میں لانا۔

فقیر مولف کہتا ہے کہ مندرجہ بالا ارشادات بالکل صحیح اور بجا ہیں، مگر جب تک مندرجہ ذیل امور میں پیر کی ظاہری امتیازی حیثیت بھی نہ ہو اور یہ اوصاف اس میں موجود نہ ہوں۔ وہ راہنما کہلانے کا اہل ہی نہیں ہوسکتا۔

۱۔ پیر خود کسی سلسلہ میں نسبت صحیح اور اجازت وخلافت رفیع رکھتا ہو جس میں کوئی شبہ صورت نہ ہو جیسا کہ فی زمانہ ان لوگوں کا حال ہے جو عوام کو پیری مریدی سے منع کرتے ہیں اور ساتھ ہی خود بیعت کرنیکی دعوت بھی دیتے ہیں۔ انکی پیری متقدمین اور سچے پیروں کی عداوت میں اپنی ذات سے ہی خودساختہ وخود کاشتہ ہوتی ہے جسکا انجام کار گمراہی ہوتا ہے۔ یہاں یہ ذکر کردینا بیجا نہ ہوگا کہ مریدوں کا مشائخین کی طرف منسوب ہونا تین طریقوں سے ہوتا ہے۔

۱۔ خرقہ سے ۲۔ تلقین ذکر سے ۳۔ محبت وادب وخدمت سے۔ پھر خرقہ کی تین صورتیں ہیں۔ ایک خرقہ ارادت ہے۔ جس کو ایک شیخ کے سوائے دوسرے سے حاصل کرنا جائز نہیں۔ دوسرا خرقہ صحبت ہے جسکو بہت سے مشائخین سے بحیثیت پیر صحبت بطور نشان امتیازی وعطا وسرفرازی طالب کا حاصل کرلینا جائز ہے۔ تیسرا خرقہ تبرک جو بغیر طلب کے کوئی شیخ وقت کسی دوسرے اولوالعزم درویش کو ہدیہ وتحفہ عنایت فرمائے۔ جیسے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمایا۔ غور طلب بات صرف یہ ہے کہ خرقہ، تلقین، خدمت تینوں صورتوں میں نسبت شیخ لازمی ظاہر ہوتی ہے۔ جو شخص بغیر اختیار کسی طریق کار کے پیری کا مدعی ہوجائے گا۔ وہ راہ خدا اور رسولؐ میں زنار داری کریگا۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت فرماتے ہیں۔ مَنْ مَاتَ لَيْسَ فِىْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً وَمَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِىَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا حُجَّةَ لَهٗ۔ یعنی جو شخص مرگیا اور اسکی گردن میں بیعت نہیں ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرگیا۔ اور جس نے اپنے ہاتھ اللہ کی اطاعت سے اٹھالئے وہ بروز قیامت اللہ تعالیٰ سے ملیگا اور کوئی حجت اس کے پاس نہ ہوگی پس معلوم ہوا کہ اس راہ میں بیعت شیخ کامل لازمی ہے۔ جو خود بے مرشد وبے پیر ہو وہ دوسرے کا پیر ومرشد نہیں ہوسکتا۔ پہلے خود پیر کامل کی نسبت حاصل کرے پھر مرتبہ پیری پر فائز ہو۔ ورنہ تمام عمر محرومی کا سامنا ہوگا۔ مولانا جلال الدین

رومی نے جاہل اور بے پیر پیر کے متعلق کیا خوب کہا ہے۔ شعر

علم باطن ہمچو مسکہ علم ظاہر ہمچو شیر
کے شود بے شیر مسکہ کے شود بے پیر پیر

کتاب ارشاد المسترشدین میں ارشاد ہوتا ہے کہ طالب کو معلوم ہونا چاہئے کہ مرشد کو اکیس ۲۱ صفتوں کے ساتھ متصف ہونا لازم قرار دیا گیا ہے۔ جن کے بغیر اسکا گدی نشین ہونا حرام اور ممنوع ہوگا۔

اوّل :- احکام شریعت کے علم سے کماحقہٗ واقفیت یعنی شیخ کے لئے حدیث اور فقہ کی تحصیل نہایت ضروری ہے۔ تاکہ اگر کسی شخص کو کوئی ضروری مسئلہ درپیش ہو تو یہ ناسخ و منسوخ اور امر و نہی میں کلام الہٰی کی روشنی سے صحیح فیصلہ دے سکے۔

دوم :- اعتقاد اہلسنت والجماعت رکھتا ہو تاکہ مرید کو بدعتوں میں گرفتار نہ کردے جس سے مرید دونوں جہانوں میں مردود ہو جائے

سوم :- عاقل ہو تاکہ مریدوں کو صحیح سمجھ سے کلام اور شعور کی تعلیم دے سکے۔

چہارم :- سخی ہو، تاکہ مریدوں کو اپنی خوراک و پوشاک وغیرہ دیگر خانگی ضرورتوں سے مکلف نہ ہو اور فارغ رکھے۔

پنجم :- شجاع ہو، تاکہ حق گوئی میں خوف نہ رکھے اور اپنے مریدوں کو حاسدوں کے حسد سے بچائے۔

ششم :- عفت والا ہو، کیونکہ نیکو کار مرشد سے مرید بدظن نہیں ہوتا۔

ہفتم :- بلند ہمت ہو جو دنیا کی طرف التفات نہ کرے اگر طاقت ہو کہ مال و دولت سے نقصان کا خطرہ نہ ہو، تو بھی مال جمع نہ کرے۔ اور مرید کے مال کی طرف طمع سے نہ دیکھے۔

ہشتم :- شفقت والا ہو تاکہ مرید کے ساتھ نرمی سے برتاؤ کرے اور آہستہ آہستہ ہدایت کی طرف لائے۔

نہم :- بُردبار اور حلیم ہو۔ تاکہ مرید ہدایت کے راستہ سے بھٹک نہ جائے۔

دہم :- اعلیٰ خلق والا ہو اور قصور معاف کرنے والا ہو تاکہ ترش روئی سے مُرید کنارہ کش نہ ہو۔

یازدہم :- چشم پوش ہو، تاکہ مرید سے اگر خطا ہو تو بخشدے۔

دوازدہم :- ایثار والا ہو۔ تاکہ مرید اور دیگر لوگوں پر ان کی ضرورتوں کیلئے اپنی ضرورت قربان کردے۔

سیزدہم :- کریم ہو، تاکہ مرید کو اپنے کرم سے ولایت تک پہنچادے۔

چہاردہم :- توکل والا ہو، تاکہ مرید کے رزق میں اسے افسوس نہ ہو کہ اسے کس جگہ سے رزق حاصل ہوتا ہے۔

پانزدہم :- تسلیم والا ہو یعنی جو کچھ ملے یا کھو جائے اسے مولائے کریم کی طرف سے سمجھے۔

شانزدہم:۔ رضا والا ہو کہ احکام الٰہی پر معترض نہ ہو۔

ہفدہم:۔ وقار اور دبدبہ رکھتا ہو تاکہ مرید بے ادب اور گستاخ نہ ہو جائے۔

ہیژدہم:۔ طبعیت میں سکون ہو تاکہ کسی معاملہ میں تعجیل نہ کرے۔

نوزدہم:۔ ثابت قدم ہو۔ کہ ہر کار دین و دنیوی میں پھسلنے والا نہ ہو۔ اور وہ عہد کہ خالق یا مخلوق سے کرے، اس پر وفا کرے۔

بستم:۔ ہیبتِ ولایت رکھتا ہو تاکہ مرید کے حال میں تصرف کرے اور کر سکنے کے قابل ثابت ہو۔

بست ویکم:۔ سب سے اہم شرط یہ ہے کہ اسکی اجازت سلسل اپنے پیر سے آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ثابت ہو، تاکہ یہ نسبت دست بدست آنحضرتؐ تک پہنچے۔ مطمئن رہے۔ کیونکہ اگرچہ تمام مندرجہ بالا صفتوں سے متصف ہو لیکن یہ صفت نہ ہونے سے اسکا کسی سے بعیت لینا حرام اور ناجائز ہوگا۔

ان صفتوں کے بیان میں کہ مرید میں ہونی لازم ہیں۔ اور وہ بھی اکیس ہیں:۔

۱۔ شریعتِ نبوی کے خلاف توبہ کرنیوالا ہو۔ اور توبہ بھی ایسی کہ دوبارہ اس سے وہ گناہ سرزد نہ ہوں۔

۲۔ زہد رکھتا ہو تاکہ دُنیا و مافیہا سے کنارہ کشی کرتے ہوئے مطلب کی طلب میں سرگرم ہو۔

۳۔ تجرید کی صفت والا ہو، کہ دنیوی معاملات و علائق سے علیحدہ رہے، سوائے کسبِ حلال کے تاکہ نان و نفقہ سے فراغت والا ہو۔

۴۔ عقیدہ حقہ اہل سنّت والجماعت سے متعلق ہو، اور بدعت سے گریز کرنے والا۔

۵۔ تقویٰ ہے کہ پرہیزگار اور کھانے پینے کے معاملہ میں ڈرنے والا، حلال کا متلاشی، ہمت سے کام کرنے والا، اور طہارت و لطافت و پاکیزگی ظاہری و باطنی میں بے حد کوشاں رہنے والا ہو۔

۶۔ مجاہدہ، نفس کو بھکنے نہ دے اور اسکی لگام قابو میں رکھے۔

۷۔ صبر، شرع کے قانون پر ثابت رہے، اور تکلیفوں اور سختیوں پر ڈگمگانے والا نہ ہو اور جزع فزع نہ کرے۔

۸۔ شجاعت۔ مردانہ وار مقابلہ کرنیوالا اور دلیر ہو تاکہ نفس اور اس کے فریب پر پنجہ مار سکے۔

۹۔ بذل۔ یعنی مرید میں بُخل اور کنجوسی نہ ہو کہ یہ قیدِ عظیم ہے۔ کیونکہ ارادت مند کو بعض مرتبہ دُنیا و آخرت کے معاملات میں جان تک دینی پڑتی ہے اور یہ ایک بُخیل اور شحیح کے لئے امرِ ناممکن ہے۔

۱۰۔ قوت ہے۔ یعنی عالی ہمت ہو تاکہ حق بحقدار پہنچا سکے اور بقدر وسعت اور نسبتِ حق ادا کرنے کے بعد کسی سے طمع نہ رکھے۔

۱۱۔ صدق۔ یعنی مرید کا صادق ہونا اس بات پر لازمی ہے کہ جو کچھ کرے حق کے لئے کرے اور تمام خلقت سے طمع منقطع کرنے والا ہو۔

۱۲۔ علم ہے:۔ کہ احکامِ شریعت، فرض، واجبات، سُنن اور مستحبات، حرام وحلال، مکروہات وشبہات کا اسے علم ہو۔

۱۳۔ نیاز ہے، کہ اگر خداوندِ عالم سے مقام ناز نصیب نہ ہو تو بھی دامنِ نیاز ہاتھ سے نہ دے اور یہ معاملہ ایسا عجیب ہے کہ اس کی مٹھاس اور حلاوت صاحبِ نیاز ہی کو معلوم ہو سکتی ہے۔

۱۴۔ چالاک، دانشمند اور معاملہ فہم اس راستہ میں گامزن ہو اور کتنی ہی خطرناکیاں پیش آئیں سب میں بے پرواہ ہو کر اپنے آپ کو اُن میں ڈال دے اور اپنی جان سے خوف نہ کھائے۔ کیونکہ جان خدا کے راستہ میں کوئی چیز نہیں۔

۱۵۔ ملامت ہے۔ کہ ننگ وناموس، مدح وذم، مذمت وتعریف خلق خدا سے بے نیاز ہو اور درویشی کے راستہ میں کسی کی دوستی ودشمنی پر نظر نہ رکھے۔

۱۶۔ عقل ہے۔ کہ اپنے شیخ کے سامنے ان کی مرضی کے مخالف کوئی بات منہ سے نہ نکالے اور نہ کوئی حرکت وسکون کام میں لائے۔

۱۷۔ باادب ہو، تاکہ مرشد کے سامنے ادب وتہذیب سے رہ سکے اور مرشد کی خوشی کو اپنی خوشی پر مقدم سمجھے اور جب تک اجازت نہ پائے نہ کچھ پوچھے اور نہ کچھ کہے۔ شیخ کے اشارات کو سمجھے اور ظاہر وباطن میں استغفار پڑھتا رہے دوستوں سے تکبر سے پیش نہ آئے بلکہ کسی کا بوجھ خود اٹھالے، لیکن اپنا بوجھ کسی پر نہ ڈالے۔ اگر خطا یا غلطی سرزد ہو تو عاجزی سے استغفار پڑھے اور توبہ کرے۔

۱۸۔ عجز اور فروتنی ہے۔ کہ عجز سے لڑائی جھگڑے کے دروازے بند ہوتے ہیں اور اختلافی مسائل میں اپنی شرعی زبان کو روکے۔

۱۹۔ تسلیم ہے۔ یعنی تصرفات ولایت شیخ کو ہمیشہ اپنے سامنے سمجھے اور اپنے آپ کو تصرفات شیخ میں جذب کر دے اگر کوئی بات خلاف شرح شیخ سے سرزد ہو تو لوگوں کے سامنے نہ کہے بلکہ نہایت عاجزی سے علیحدہ کہے کیونکہ بعض

مرتبہ مرشد کی باتیں مرید کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔ جو مرید کی سمجھ میں فی الوقت نہیں آسکتیں۔

۲۰- تفویض ہے۔ یعنی اپنے آپ کو اور اپنے تمام معاملات کو شیخ کے سپرد کردے۔ جیسے مردہ بدست زندہ ہوتا ہے۔ اور یہ حکم مبتدی کے لئے ہے اور منتہی کو حق تعالیٰ کے سپرد کرنا چاہئے تاکہ اس کے معاملات ضائع نہ ہوں اور مکھی کی طرح شیخ کی خدمت میں حاضر ہو۔ اگر ہزار بار اسکو نکالا بھی جائے پھر بھی دروازہ نہ چھوڑے۔ نہ جا بے جانے پر بھی جھڑکیاں کھائے اور وہیں رہے۔

۲۱- عدم ہے۔ یعنی اپنے آپ کو بالکل کچھ نہ سمجھے اور یہ بات بڑی ہی اہم اور مشکل ہے۔

۱- حضرت ابوعلی وقاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس کا کوئی پیر نہ ہو۔ اس کا سلوک طریقت حق تعالیٰ کے ساتھ نہایت کو نہیں پہنچتا تاوقتیکہ وہ کسی پیر کی اقتداء نہ کرے۔ کیونکہ اس طریق میں ایک رہبر کا ہونا لابدی وضروری ہے تاکہ از راہ حال کے اس کو طریقت ومجاہدہ میں پوری دسترس حاصل ہو۔

۲- پیر علم شریعت کا حامل اور عمل طریقت کا عامل ہونا چاہئے۔ کیونکہ بغیر علم شریعت کے مکر نفس وشیطان کا ہر وقت خدشہ ہوگا اور وہ منازل کی شناخت اور مقامات ومشاہدات کی تصدیق نہیں کرسکیگا۔ حضرت سلطان العارفین سلطان باہو رح فرماتے ہیں کہ بغیر علم کے پیری کرنے سے کفر پر موت ہونے کے مرادف ہے۔

۳- پیر عقیدہ کے لحاظ سے صحیح اور پکا اہل سنت والجماعت ہو۔ ورنہ بیعت ناجائز ہوگی۔ کیونکہ اس فرقہ حقہ کے علاوہ تمام نام نہاد اسلامی فرقوں کے بھیک منگ پیر اس مسئلہ بیعت کے متعلق بدعت ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ دنیوی لالچ اور بزرگان دین سے منحرف کرنے کے خیال سے خود بھی بیعت لیتے ہیں تو ایسے بدعتی پیر کی بیعت بھی انہی کے قول کے مطابق ناجائز وبدعت ہوگی اور بعض پیران ریاکار تو وہ ہیں جو پیری مریدی کو بدعت تو نہیں کہتے مگر تمام متقدمین اسلام پر خیانت ومنافقت کا الزام دھر کر طعن کرتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ جن حضرات سے اسلام و نور اسلام ہم تک پہنچا ہے، اگر وہ سرتاپا گمراہ تھے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ تو تم یہ انوار کی تقسیم کس بارگاہ سے لیکر کرتے ہو۔ متقدمین حضرات کو گمراہ کہنے والا خود نہ پیر بن سکے نہ صراط مستقیم پر چلنے کا دعویدار ہو سکے۔ کیونکہ وہ خود گمراہ ہے۔

۴- پیر کو شریعت اسلامیہ مصطفویہ علیہ السلام کا سخت پابند ہونا چاہئے۔ کیونکہ معرفت الٰہی کی صحیح راہ بغیر پابندی شرع کے محال بلکہ ناممکن ہے۔ حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں حضور سرور کائنات مختار شش جہات محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اے بشر! تم کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے معاصرین میں سے تمہاری اتنی عزت افزائی کیوں کی ہے؟ میں نے عرض کیا مجھے معلوم نہیں۔ تو حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اس کا سبب میری سنت کی پیروی صالحین کی خدمت گذاری، اپنے بھائیوں کی خیر اندیشی اور میرے اصحاب و اہلبیت کے ساتھ محبت ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے تجھ کو ابرار کے مرتبہ پر فائز کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی ساری بنیاد اسی پر ہے کہ آداب شریعت کی پابندی رہے، حرام اور مشتبہ چیزوں سے ہاتھ کھینچا جائے ناجائز اوہام و خیالات سے حواس کو آلودہ نہ کیا جائے اور غفلتوں سے بچکر اللہ کریم کی یاد میں وقت گزارا جائے۔ ترک شہوات کے مجاہدہ میں دواماً مشغولیت ہو اسکو ہمیشہ یاد رکھا جائے کہ خواہشات کی پابندی اور روح کی پاکیزگی کا ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ایک انتہائی پستی ہوتی ہے کہ درویش جس خواہش کو اللہ کے لئے چھوڑ چکا ہو اسکی جانب پھر رجوع کرے، کسی عہد کو اللہ تعالیٰ سے کر لینے کے بعد توڑنا طریقت میں وہی درجہ رکھتا ہے جو شریعت ظاہری میں ارتداد کا ہے۔ جو درویش شریعت کے ابتدائی اصولوں سے واقف نہیں، وہ طریقت و حقیقت اور معرفت سے کیونکر واقف ہو سکتا ہے۔ اسکی مثال اس زمیندار کی سی ہے، جو نہ کھیتی میں ہل چلاتا ہے، نہ زمین بناتا ہے نہ بیج ڈالتا ہے، نہ راتوں کو جاگ کر کھیتی کو پانی دیتا ہے، نہ دوپہر کو اسکی صفائی کرتا ہے، نہ حفاظت کے لئے باڑ دیتا ہے، مگر موسم پر تمنا ضرور کرتا ہے کہ میں بھی بڑے بڑے زمینداروں کی طرح خرودار اٹھاؤں اور غلے سے اپنے گھر کو بھر لوں، بھلا جس شخص نے درخت ہی نہیں بویا وہ پھل اور شاخ کی تمنا کیوں کر کرے گا۔ اس کے متعلق مفصل بحث کسی گذشتہ باب میں گزر چکی ہے۔ شعر

خشت اول چوں نہد معمار کج — تا ثریا مے رود دیوار کج

۵۔ پیر طامع اور خواہشات نفسانیہ پر حریص نہ ہو۔

۶۔ پیر میں بے جا غرور اور ناجائز تعلّی و تکبّر نہ ہونا چاہئے۔ جس سے ہر وقت فخر و پندار میں مستغرق رہے، کیونکہ یہ اہل اللہ کی تعلیم کے منافی ہے۔

۷۔ پیر خود اپنے بزرگوں کا معتقد اور محبت رکھنے والا ہو۔ جب کلام کرے اس کی گفتگو سے اہل اللہ و بزرگان دین کی عظمت کا اظہار ہوتا ہو۔

۸۔ پیر اخلاق باطنی و محاسن ظاہری میں اتنا بلند ہو کہ اس کے اپنے اقربا و اعزا بھی پس پردہ اچھا یاد کریں۔

۹۔ پیر ایسا ہو کہ اس کی صحبت میں دل گرم اور عقبیٰ کی رغبت پیدا ہو اور اس کے دیکھنے سے خدا یاد آجائے، کسی شاعر نے

کیا خوب لکھا ہے۔ شعر

چہ باید مرد را طبع بلندے مشرب نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے

فضلِ ایزدی اور خوش قسمتی و نیک نصیبی ہے اگر ان اوصاف کا موصوف پیر مل جائے تو مرید کو اس کی بیعت کرنے سے مندرجہ ذیل ظاہری فوائد حاصل ہوں گے اور باطنی کی تو حد ہی نہیں رہتی :-

۱۔ طالبِ صادق بوقتِ بیعت گناہان سابقہ سے تائب ہو کر ایسا پاک ہو جاتا ہے کہ اس کے ذمے کوئی گناہ رہتا ہی نہیں حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ یعنی گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسے کہ اس کے ذمہ گناہ تھے ہی نہیں اور شیخ طریقت سب سے پہلے بیعت کے وقت توبہ ہی کراتا ہے۔

۲۔ جب ارادتمند اپنے شیخ کیساتھ ایک نسبت اختیار کر لیتا ہے اور اسکی محبت دل میں جما لیتا ہے تو ابتدا میں یہ محبت ہی طالب کو صالح مزاج بناتی اور آخرت میں وسیلہ نجات ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت انس رضؓ کو فرمایا۔ اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ یعنی تو حشر میں ان کے ساتھ ہوگا، جن سے محبت رکھتا ہے۔

۳۔ بزرگانِ دین کے ہر چہار سلاسل میں سے کسی کی نسبت اختیار کر لینا ہی موجب نجات ہو سکتا ہے کیونکہ سرکارِ دو عالم فرماتے ہیں هُمُ الْجُلَسَاءُ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ۔ یعنی وہ، وہ لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا بھی بدبخت اور غیر نجات یافتہ نہیں رہتا

۴۔ مرید جب ایک پیر سے تعلق قائم کر لیتا ہے تو تمام بزرگانِ دین کی عزت اور منزلت اس کے دل میں گھر کر جاتی ہے۔ اور وہ ان کے ذکر سے اپنا وقت خوش رکھتا ہے اور اسی کی نسبت حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے تَتَنَزَّلُ الرَّحْمَةُ عِنْدَ ذِكْرِ الصّٰلِحِيْنَ یعنی صالحین کا ذکر کرنے پر رحمت نازل ہوتی ہے۔

۵۔ مرید بیعت کرنے کے بعد اگرچہ اپنی غفلت کی وجہ سے شیخ کے راہ روشن پر پوری طرح مستعد نہ ہو اور قدم اٹھانے میں کوتاہی کرے تاہم بعض امورات میں صرف پیر کی تشبیہہ ہی اس کے لئے فائدہ بخش ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ کہ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ یعنی جو شخص کسی قوم کی مشابہت پیدا کرے گا وہ انہی میں داخل ہوگا۔

ان فوائد ظاہری کے علاوہ مرید اپنی باطنی غرض وغائت کے ماتحت جو نفع حاصل کرے گا وہ مزید برآں ہوگا مگر یہ یاد رہے کہ اتباعِ شیخ میں تساہل کرنے سے یہ سب کچھ، کچھ بھی نہ ہوگا۔ اتباعِ شیخ شرطِ اولین ہے۔ کیونکہ شیخ کے حضور میں جب اپنے آپ کو پیش کرے گا، تو اب نہ اسکا اپنا ارادہ ہوگا۔ بقولِ اَلْمُرِيْدُ لَا يُرِيْدُ لِنَفْسِهٖ اور نہ وہ اپنے ارادے اور خیالات

نفسانیہ کو کام میں لا سکے گا۔ حسب ارشاد اَلطَّالِبُ عِنْدَ الْمُرْشِدِ کَالْمَیِّتِ بَیْنَ یَدِ الْغَاسِلِ (طالب مرشد کے نزدیک ایسا ہوگا، جیسے میت غسل دینے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے) کے مصداق بالکل بے اختیار ہو جائے گا۔

اب اس کا یہ فرض ہوگا کہ تعلیم شیخ پر آمادۂ عمل ہو جائے اور ان اعمال و اوراد اور وظائف و لطائف کی طرف رجوع کرے جن پر چلانا اور عمل کرانا شیخ ضروری سمجھے، کیونکہ اس راہ میں مرید کی اپنی مرضی کوئی شے نہ ہوگی۔ حافظ نے کیا خوب لکھا ہے۔

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید　　　　که سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

(ترجمہ) ؎ نال شراب رنگ مصلٰے جے ہادی فرماوے

کیوں، جو واقف کار حقیقی دھوکھا مول نہ کھاوے

گویا جب تک مرید اپنی مرضی اور نفسانی تمیز کو دور کر کے ہر لحظہ آداب شیخ کو ملحوظ نہ رکھے گا کبھی کامیاب نہ ہوگا۔ بدیں وجہ بزرگانِ طریقت نے آداب شیخ میں مرید کو یہاں تک پابند کیا ہے کہ:-

ا۔ اگر پیر کا کوئی فعل مرید کے فہم اور ادراک میں نہ بھی آئے تو اس وقت حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کے قصہ کو مدِنظر رکھ کر خاموش رہے۔ اور اس وقت تک انتظار کرے جب تک شیخ خود بیان نہ فرماوے۔

ب۔ مرید اپنے شیخ سے کوئی راز پوشیدہ نہ رکھے کیونکہ اس کی حیثیت مریض کی ہے۔ جب تک مریض معالج سے تمام تر حالات ذکر نہیں کرے گا شفاء عاجل حاصل نہ کر سکے گا۔

ج۔ مرید اپنے پیر پر ہمیشہ ایسا اعتقاد رکھے کہ ہدایت و ارشاد میں کوئی دوسرا ایسا کامل نہیں ورنہ اس اعتقاد کے بغیر اس کا غیر کی جانب رجوع کر جانا ممکن ہوگا۔ جس کا نتیجہ فیضِ باطنی سے محرومی ہوگی، اس باریکی کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ مبداء و معاد میں فرماتے ہیں کہ مرید کا اعتقاد اپنے پیر کو اکمل و افضل جاننے میں اس محبت کے ثمرات اور اس نسبت کے نتائج میں سے ہے۔ جو افادہ و استفادہ کا سبب ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ کوئی مرید اپنے پیر کو ان لوگوں پر فضیلت نہ دے جنکی فضیلت شرع میں مسلّمہ و مقرر ہے۔ کیونکہ یہ امر محبت میں افراط کا موجب ہوگا اور افراط فعل مذموم ہے۔

د۔ مرید تصرفات پیر میں اپنے آپ کو سپرد کر دے اور ہر حال میں پیر کا تابعدار رہے اور شیخ کے تصرفات پر کوئی اعتراض نہ کرے۔ اس لئے کہ کامل کا ہر قول و فعل کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

ہ- کوئی ورد و وظیفہ کسی دوسرے بزرگ سے حاصل نہ کرے - اور نہ ہی بغیر اجازت شیخ کے ان پر عمل کرنے والا ہو، نہ ہی مراقبہ، چلّہ کشی اور وظائف میں سبقت کرے۔ ایسا کرنا بسا اوقات مرید کو سخت نقصان دیتا ہے۔

و- جو امور ترکِ ادب کے ہیں ہر وقت نگاہ رکھے۔ شلاً مجلس شیخ میں کسی ہم نشین سے ایسا کلام نہ کرے جو شیخ کے کلام میں خلل ڈالنے والا ہو۔ شیخ کے سامنے بلند آواز سے گفتگو نہ کرے۔ پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھے، اکڑ کر نہ چلے آدابِ مجلس کے خلاف کھانا پینا ممنوع سمجھے۔ بغیر اجازت کے شیخ کے برابر یا اسکی مسند پر نہ بیٹھے۔ شیخ کے ساتھ کھانے پینے میں بے ادب اور گفتگو میں بے تکلف اور بیباک نہ ہو۔ زانو ننگے نہ کرے۔ تفوق کے پہلو پر نقل و حرکت کرنا بے ضرورت اور بے مطلب باتیں بنانا اور بوقت رخصت شیخ کی جانب پشت کر کے روانہ ہونا بھی اسی طرح منع ہے جیسے باقی امور مذکور ہوئے ہیں۔ غرضیکہ بزرگانِ دین نے آدابِ شیخ میں اور بہت کچھ بیان فرمایا ہے۔ جس کی اس مختصر تصنیف میں گنجائش نہیں۔ حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ لاہوری کا قصہ مشہور ہے کہ آپ کے پیر حضرت داؤد بندگیؒ جس جنگل میں مجاہدہ فرمایا کرتے تھے حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ ان کی وفات کے بعد بھی کبھی اس جنگل سے گزرتے تو ادب شیخ سے ننگے پاؤں چلتے کہ جوتے سے کہیں قدم شیخ کے نشان کی بے ادبی نہ ہو۔

ز- مرید کو چاہئے کہ ہمیشہ شیخ کے باطن میں خدا کو دیکھے۔ کیونکہ شیخ آئینۂ خدا ہے۔ اگر وہ اپنی ارادت و مراد کی راہ پر چلے گا تو وہ اپنی مراد کا مرید کہلائے گا، نہ کہ پیر کا۔

ح- مرید اپنے شیخ سے ہمیشہ طالبِ حقیقت رہے، ورنہ طلبِ دنیا اس کے لئے اس کے باطن کا ایک حجاب ہو جائے گی جس سے از خود کبھی نجات نہیں پاسکیگا۔

ط- مذاہب کے جھگڑوں سے علیحدہ رہے اور جس طریق پر شیخ گامزن ہو اس کو لازم پکڑے۔ کیونکہ بعض اوقات تحریکات دنیا اور مذہبی جھمیلوں کا الجھاؤ طالب معرفت کو اس کے مقصد سے بہت دور پھینک دیتا ہے۔ ہم نے لاکھوں اور ہزاروں نہیں تو سینکڑوں لوگ ایسے ضرور دیکھے ہیں جو اس الجھن میں پھنس کر پھر تو درکنار راہ معرفت ہی کا انکار کر کے گمراہ ہو گئے ہیں۔ العیاذ باللہ۔ مذہبی جھمیلوں کی علیحدگی سے آخر میں خود بخود تمیز مذہب و ملت اٹھ جائے گی اور حضرت منصور حلاج کی طرح یہ بھی اَنَا عَلَی الْمَذْھَبِ رَبِّیْ یعنی "میں اپنے رب کے مذہب پر ہوں" کہنے لگ جائے گا۔ کیونکہ

اہل معرفت خدا ہی کے مذہب پر ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں یہ تمیز من و تو اور مذہب و ملت نہیں ہوتی ہی۔ بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ باطنی آداب شیخ کے سات ہیں۔

اول - یہ کہ پیر کے ساتھ نیت خالص اور عقیدہ پاک رکھے۔ اور دل خیالات فاسدہ سے خالی ہو کیونکہ یہ لوگ طبیب الٰہی ہیں۔ دل کے امراض کو مرید کے وجود میں اسباب و علامات سے معلوم کر لیتے ہیں۔ اور خطرات کو تاڑ جاتے ہیں۔ لِاَنَّھُمْ جَوَاسِیْسُ الْقُلُوْبِ فَجَالِسُوْھُمْ بِالصِّدْقِ یعنی یہ لوگ دلوں کے جاسوس ہوتے ہیں تم ان کے پاس صدق سے بیٹھا کرو۔

دوم - یہ کہ پیر کے کلام کو برضا و رغبت دل کے کانوں سے سنے نہ گوش جسم سے۔ کیونکہ ایسا کرنا مرید کے لئے مفید نہ ہوگا۔

سوم - یہ کہ پیر کے اسرار کو پوشیدہ رکھے اور نااہلوں سے بیان نہ کرے۔

چہارم - یہ کہ پیر کے ارشاد کو بسر و چشم تسلیم کرے اور اس کے ظہور کے لئے انتظار میں رہے کیونکہ جلدی میں فساد کا امکان ہوتا ہے

پنجم - یہ کہ شیخ کے کسی قول و فعل پر معترض نہ ہو بلکہ اس کو حقیقت پر منتج کرے کیونکہ شیخ کامل کا ہر ارادہ حق تعالیٰ کے ارادہ میں فانی ہوتا ہے۔

ششم - یہ کہ پیر کو عیب کی آنکھ سے نہ دیکھے اور کسی فعل میں زبان طعن نہ کھولے اور کسی منتہی کی تقلید کر کے اپنا ریاضت و مجاہدہ نہ چھوڑ دے کیونکہ یہ منتہی کے لئے مفید اور مبتدی کے لئے موجب نقصان و ضرر ہوتا ہے۔

ہفتم - یہ کہ کسی امر میں شیخ کا امتحان نہ کرے کیونکہ امتحان ایک قسم کا تصرف ہے اور ناقص کو کامل میں تصرف نہیں ہوتا۔ ایک نقشبندی درویش فرمایا کرتے تھے کہ مرید کو چاہئے کہ شیخ کو بے دلیل مانے کیونکہ حضرت شیخ المشائخ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیخ رسول ؐ کا نائب ہے اور اس کی متابعت و حفظ مراتب خدا و رسول علیہ السلام کی متابعت ہے اور نائب کی تعظیم عین منیب کی تعظیم ہوتی ہے اور سلوک طریق اس کی متابعت کے سوا محال ہے۔

کتاب مرصاد العباد میں مرقوم ہے کہ ارادتمند میں جب تک یہ بیس اوصاف نہ ہوں اس کو سلوک کی راہ نہیں مل سکتی۔

۱۔ سچی توبہ جو اعمال صالح کی جڑھ ہے ۲۔ زہد یعنی تھوڑے پر قناعت کرنا ۳۔ تجرید یعنی تمام نفسی علاقوں کا انقطاع کرنا۔ ۴۔ عقیدہ، یعنی اہل سنت والجماعت کا صحیح عقیدہ رکھنا۔ ۵۔ تقویٰ یعنی پرہیزگاری میں ہر لقمہ و لباس و طعام و کلام میں

محتاط رہنا۔ ۶۔ صبر یعنی مشکلات راہ میں بددل نہ ہونا۔ ۷۔ مجاہدہ یعنی نفس کے ساتھ نرمی نہ برتنا۔ ۸۔ شجاعت یعنی محاربۂ نفس میں قیام کرنا۔ ۹۔ بذل یعنی ایثار پر حوصلہ مند اور بخل سے علیٰحدہ ہونا۔ ۱۰۔ فتوت یعنی جوانمرد و عالی ہمت ہونا۔ ۱۱۔ صدق یعنی اپنا تمام معاملہ راستی پر رکھنا۔ ۱۲۔ علم یعنی فرائض سے عہدہ برائی کیلئے بقدر ضرورت معلومات حاصل کرنا۔ ۱۳۔ نیاز یعنی اطاعت ناز کا پابند رہنا۔ ۱۴۔ عیاری یعنی خطرات و وساوس کو ہر لحظہ نگاہ رکھنا۔ ۱۵۔ ملامت یعنی نیک و بد اور ردّ و قبول میں یکساں رہنا اور اضداد کو ایسا یکرنگ جاننا کہ خلقت کی دوستی و دشمنی سے فربہ و لاغر نہ ہو (جو لوگ ملامت کی تعریف غیر شرع امور کا ورد اور تخالف شروع کرتے ہیں وہ گمراہی ہے) ۱۶۔ عقل یعنی کوئی ایسا فعل نہ کرنا جو غیر معقولیت پر ظاہر ہو کر شیخ کی رنجش کا باعث بن جائے۔ ۱۷۔ ادب یعنی ظاہر و باطن میں شیخ کے اشارات وارشادات کا منتظر رہنا۔ ۱۸۔ حسن خلق یعنی تکبّر و رعونت، عجب و غرور، تفاخر و دعویٰ اور طلب وجاہ سے دور رہنا۔ ۱۹۔ تسلیم یعنی تصرفات شیخ پر ایمان رکھنا اور اپنے تصرت سے علیٰحدہ رہنا۔ ۲۰۔ تفویض یعنی ہر حالت خوف و کمال میں از روئے صدق خدا ہی کا ہونا اور اپنے وجود سے بالکل قطع نظر کر لینا۔

مصنف کتاب مطلوب الطالبین فرماتے ہیں کہ پیر کے حضور میں مرید کو اپنی نسبت کوئی گفتگو نہ کرنی چاہئے اور نہ پیر کی اجازت کے بغیر ان کے مقام میں جائے بالخصوص جو اوقات ان کے ذکر و فکر میں مشغول ہونے اور قیلولہ وغیرہ کے ہیں تاکہ ان کے حال کا مانع نہ ہو۔

خواجہ عبیداللہ احرار فرماتے ہیں کہ مرید وہ ہے جو ارادت کی آگ میں جلا ہؤا ہو اور اس کی کوئی مراد باقی نہ رہی ہو۔ ہمیشہ اپنے پیر کا ملازم در رہے اور اپنے تمام امور کے کشائش کی امید اسی دوازہ سے رکھے۔ کتاب معدن المعانی میں مذکور ہے کہ ایک روز حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ سے مرید کی نسبت سوال کیا گیا کہ مرید کس کو کہتے ہیں تو آپ نے فرمایا مرید وہ ہے۔ جو قولاً فعلاً، قلباً، قالباً پیر کی متابعت کرے، اور ان کلمات کی یوں تشریح فرمائی کہ قولاً۔ یعنی دین کے فروع واصول میں اسکی وہی بات ہو جو پیر کی ہو۔ جیسا کہ آج کل دیکھا جا رہا ہے کہ مذہبی و سیاسی، تمدنی و معاشری، علمی و عملی، اعتقادی و ایمانی اور فروعی و اصولی مسائل و معاملات میں شیخ کسی ایک راہ کا پابند ہے تو مرید کسی دوسری جانب ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ ایسا ہونا اور ایسا کرنا اتباع پیر کے منافی ہے۔

فعلاً:۔ یعنی تمام دینی و دنیوی کام پیر کے اشارہ کے موافق کرے اگرچہ اطاعت ہی ہو۔

قلباً:- یعنی اپنے دل کو اپنے پیر کے دل کی مانند تمام صفات ذمیمہ سے پاک وصاف کرلے۔

قالباً:- یعنی ظاہری وباطنی اعضاء، حواس کو بھی پیر کے اعضاء، وحواس کی طرح معصیت کی آلودگی سے علیحدہ رکھے۔ کیونکہ جو مرید اپنے آپ کو ہر حال میں پیر ہی کے حرکات وسکنات کے تابع کر دیتا ہے اسکو علیحدہ کسی علم کے حصول کی حاجت نہیں رہتی اور وہ پیر کی ایک ساعت کی متابعت ومجلس سے وہ کچھ پالیتا ہے جو ہزاروں چلّوں اور مجاہدوں سے بھی حاصل نہیں ہوتا، بلکہ بعض مشائخین کا قول ہے کہ پیر کی یکروزہ صحبت وخدمت مرید کے تنہا چالیس چلّوں سے بہتر ہوتی ہے۔

شیخ جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ میں فرماتے ہیں کہ مرید وہ ہے جس کا ارادہ شیخ ہی کا ارادہ ہو۔ کیونکہ شیخ امر ہے اور مرید مامور ہے اور جو امر شیخ سے صادر ہوتا ہے وہ گویا اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پس مرید پر واجب ہے کہ بلا تاخیر وتقصیر اس کی متابعت کرے۔ اس لئے کہ مرید پر نفس کا مغلوب کرنا شیطان کے دفع کرنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ مرید اگر کسی قول وفعل میں شیخ کے خلاف ہوگا۔ تو صدق وارادت کے لائق نہیں رہے گا۔

جو مرید مقصود کے موتی ہاتھ میں لانا چاہے۔ اس کو لازم ہے کہ شیخ کی متابعت اور نفس کی مخالفت کو واجب سمجھے۔ رات کو جاگے، دن کو روزہ رکھے تاکہ اس میں شیخ کے تخالف کا ارادہ ہی پیدا نہ ہو جس نے شیخ کی اطاعت کی اور اس کی مخالفت سے بچا وہ مراد حقیقی اور فوز وفلاح کو پاگیا۔

نفائس الفنون کا حوالہ دیتے ہوئے کتاب فیض الکریم میں مرید کے لئے چند آداب ایسے بیان فرمائے گئے ہیں جن کے بغیر سالک مرید کی کوئی حیثیت ارادت قابل قبول نہیں سمجھی جاتی۔ ان میں سے اول یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے خداتعالیٰ کی جناب میں استغفار وطلب رحمت کے وقت امر ونہی سے خطاب نہ کرے۔ کیونکہ یہ ترکِ ادب ہے۔

دوئم۔ یہ کہ کلام الٰہی جب اسکی یا کسی اور کی زبان پر جاری ہو تو اس کو متکلم حقیقی سے سنے اور زبان کو درمیان میں وسیلہ اور واسطہ سمجھے

سوئم۔ یہ کہ اپنے نفس کو آثار رحمت الٰہی کے اظہار کرنے میں مخفی رکھے۔

چہارم یہ کہ اگر اسرار ربوبیت میں سے کسی سِر پر واقفیت ہو جائے تو اس کو بطور امانت محفوظ رکھے اور اس کا ظاہر کرنا جائز نہ سمجھے ورنہ مرتبہ قرب سے گر جائیگا۔

پنجم۔ یہ کہ سوال ودعا وسکوت کے اوقات کی رعایت رکھے۔ کیونکہ درویش کے لئے پابندئ اوقات بحد لازم وواجب ہے

ششم۔ یہ کہ جس طرح رب العزت جل وعلاشانہٗ کو اپنی ظاہری وباطنی کیفیات وحالات پر مطلع جانتا ہے اسی طرح

حضور پُرنور شافع یوم النشور سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھی اپنے ظاہری و باطنی حالات و کوائف پر مطلع و واقف تصور کرے اور ہر قول و فعل میں حضورؐ کی مخالفت سے شرم کھائے۔

ہفتم۔ یہ کہ اس کا یہ ایمان ہو کہ کسی مخلوق کو حضور علیہ السلام کا سا کمال منزلت و علو مرتبت ممکن ہی نہیں اور کوئی سالک خدا تعالیٰ جلّ وعلا شانہٗ کی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی راہنمائی کے بغیر ہدایت نہیں پا سکتا۔ اور نہ ہی کسی ولی کو حضور علیہ السلام کی سی قوت تکمیل و ارشاد ہو سکتی ہے۔

ہشتم۔ یہ کہ متابعت سنت میں ہر لحظہ ساعی رہے۔ اور اس میں سستی و غفلت کو راہ نہ دے۔ اور یہ یقین رکھے کہ درجہ محبوبیت حضور علیہ السلام کی اطاعت کے سوا ممکن ہی نہیں۔

نہم۔ یہ کہ جو لوگ سرکار انبیاء علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات سے ظاہری و باطنی نسبت و تعلق رکھتے ہیں، مثلاً سادات و مشائخ و علماء کرام سب کے ساتھ محبت و موانست رکھے۔ بشرطیکہ ان کے اعمال و عقائد بھی حق و صحت پر مبنی ہوں۔

دہم۔ شیخ کے حق میں یہ اعتقاد کامل رکھے کہ اس کے سوا میدانِ تربیت و ارشاد میں کامل جہان میں اور کوئی نہیں کیونکہ رابطہ محبت ضعیف ہونے سے اس کے لئے شیخ کے اقوال و افعال کی تاثیر بھی ضعیف ہی ثابت ہو گی۔

یازدہم۔ یہ کہ شیخ کی صحبت کا ملازم رہے اور اس کے رد و طعن سے دل شکستہ ہو کر منہ نہ موڑ جائے۔

دوازدہم۔ یہ کہ شیخ کے تصرفات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے ظاہر و باطن پر معترض نہ ہو۔

سیزدہم۔ یہ کہ اپنا اختیار بالکل چھوڑ دے اور دینی و دنیوی امور میں شیخ کے فرمان و ارادہ کے ماتحت رہے۔

چہاردہم۔ یہ کہ کلام شیخ کو کلامِ حق کا واسطہ جانے اور بے واسطہ اس امر کا منتظر رہے کہ شیخ کے منہ سے کیا ارشاد ہوتا ہے۔

پانزدہم۔ یہ کہ شیخ کے حضورؐ میں آواز بلند نہ کرے اور اپنے نفس کو ظرافت و خوش طبعی اور ناموزوں گفتگو سے روکے اور اپنا کلام شروع کرنے سے پہلے یہ سوچ لے کہ شیخ کو مجھ سے کلام کی فرصت ہے یا نہیں اور بیان میں اپنے کلام کو مہمل کر دے۔

شانزدہم۔ یہ کہ اپنے مرتبہ کو نگاہ رکھے اور گفتگو میں اپنے حال و مقام سے بڑھ کر کلام نہ کرے۔

ہفدہم۔ یہ کہ جو حال و اسرار از قسم کشف و کرامات و کیفیات و واقعات شیخ کو پوشیدہ رکھنا چاہے مرید اُن کو ظاہر نہ کرے۔

ہژدہم۔ یہ کہ اپنی کیفیات و اسرار کو شیخ سے پوشیدہ نہ رکھے، اور جو کرامت و عطا مولا کریم کی جانب سے اسکو بخشش ہو بحضور شیخ صراحت سے بیان کر دے۔

نوازدہم - یہ کہ اپنے پیر کے مخالفین سے صحبت و مخالطت نہ رکھے اور اُن سے کنارہ کش رہے۔

بستم - یہ کہ تبرکاتِ شیخ کی انتہائی قدر کرے کہ اس میں بھی محبت و طاعت کا ایک پہلو پوشیدہ ہے اور اگر اپنے شیخ کا پس خوردہ پانی پلائے تو اس کو از راہِ ادب کھڑا ہو کر پئے۔

اس کے علاوہ خواجہ علاؤ الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مرید کے لئے پیر کی صحبت سنّت مؤکدہ ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس کو برقرار رکھے تاکہ کلّی غیبت واقع نہ ہو جائے۔

الغرض تعلیم طریقت سیکھنے سے ہی حاصل ہوتی ہے اور اس کے لئے صحبت و خدمت مرشد کے بغیر چارہ نہیں اور جب تک ارادتمند صبر و استقلال سے اطاعت کے معاہدہ پر قائم اور متابعتِ شیخ کو دائم نہیں پکڑے گا، راہِ رشد و ہدایت کو نہیں پا سکے گا۔

بیعتِ نابالغاں و اہل القبور

یہاں یہ مسئلہ بھی ذکر کر دینا انسب معلوم ہوتا ہے۔ جو بزرگانِ دین نے نابالغوں کی بیعت کے متعلق فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نابالغوں کے باپ یا بھائی اگر اپنے بچوں کو مرشد کی خدمت میں حاضر کریں تو روا ہے۔ لیکن اگر باپ یا بھائی نہ ہوں اور شیخ کسی نابالغ کو خود بخود بیعت کرے تو ہوش میں آنے کے بعد ایسا مرید اس بیعت سے انکار کرنے میں حق بجانب ہوگا اور اسی قیاس پر نکاح نابالغاں کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر ولی جائز نکاح کرتا ہے تو بالغ ہونے کے بعد نکاح کا فسخ کرنا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر جائز ولی نے نہ کیا ہو تو بلوغت کے بعد نکاح کا فسخ کرنا اس کے اختیار میں ہوتا ہے۔ لیکن بیعت مراہق بالکل واجب و صحیح ہے اور فسخ نہیں ہو سکتی (جو کہ قریب بلوغ کے ہو) یعنی بارہ سال کی عمر میں بیعت قابلِ فسخ نہیں ہے۔ اگرچہ دوسرے مشائخ کے نزدیک اس کے عدم جواز کے بھی بہت سے مقولے ہیں مگر آثارِ نبوی علیہ السلام سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دس گیارہ سال کے عقلمند بچوں کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے داخلِ بیعت فرمایا ہے۔ جیسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو ۹ سال کی عمر میں حضور علیہ السلام نے بیعت فرمایا اور وہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صحبت میں مدت العمر حاضر رہے۔ ہاں بے سمجھ بچوں کو ان کے والدین کی نسبت سے حکم لگا سکتے ہیں۔ یعنی اگر والد یا بھائی بیعت کر دلائے تو صحیح ورنہ نہیں اور اسی طرح بیعت قبور بھی ناجائز ہے کیونکہ اگر بیعتِ قبور واجب و روا ہوتی تو مسلمانانِ عالم روضۂ نبی کریم علیہ الصلوات والتسلیم سے بیعت کرتے اور ظاہری شیخ کی کوئی حاجت نہ رہتی۔ درآنحالیکہ اولوالعزم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور تابعین ابرار نے جیسا کہ اوپر

بیان ہو چکا ہے اکثر مقدس حضرات کی بیعت کی ہے۔ اس لئے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے، اگر کسی نے خواہ وہ صائم الدہر قائم اللیل، زائر حرمین الشریفین بھی ہو، حافظ قرآن ہو، عالم تفسیر و احادیث و فقہ بھی ہو اور اس نے اپنا ہاتھ کسی حق پرست شیخ کے ہاتھ میں نہ دیا ہو تو اس کا ہاتھ شیطان کے ہاتھ میں ہو گا۔ اور اس دن بمصداق "یوم ندعوا کل اناس بامامھم" ہر شخص اپنے پیشوا کے ساتھ ہوگا اور وہ بیعت سے محروم شخص شیطان کے ساتھ بلایا جائے گا، جو کسی کی پناہ میں نہ ہوگا کیونکہ اگر وہ ٹھوکر کھا جائے اور اس سے لغزش سرزد ہو تو اس کا پیر ظاہری نہ ہونے سے وہ کیونکہ اس وسوسۂ شیطانی سے خبردار ہوگا اور کس طرح تاریکی سے نور کی طرف آ سکے گا۔ حضرت سہل بن عبداللہ التستری نے کتاب معرفۃ المریدین میں لکھا ہے "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من لا شیخ لہ فشیخہ الشیطان" یعنی جس کسی کا کوئی مرشد نہیں ہے اسکا شیخ یا مرشد شیطان ہوتا ہے۔

شیخ العالم حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کتاب عوارف المعارف میں فرماتے ہیں "من لم یکن لہ استاد فامامہ شیطان" کسی کا اگر ظاہری استاد یعنی شیخ نہ ہو تو اس کا امام و پیشوا شیطان ہوتا ہے پس لازم ضروری ہے کہ کسی بزرگ سے جو سطور بالا صفتوں سے متصف ہو بیعت ضرور کی جائے جو سعادتِ دارین کا موجب ہو۔

وباللہ التوفیق



خلافت خرقہ

جمیع حضرات صوفیاء کرام بیعت اور خرقۂ درویشی کے متعلق متفق ہیں اور انکا عمل رہا ہے کہ بعد بیعت مستحق ارادتمندوں کو جن کو اس قابل سمجھیں کہ وہ سلسلہ کی خدمت کے قابل ہو گئے ہیں۔ اپنی خلافت کا خرقہ عطا فرما دیں۔ مشہور ارباب تصوف سے صاحب کشف المحجوب حضرت گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ اہل اس خرقہ کے صرف دو گروہ ہیں۔ ایک منقطعان دنیا دوسرے مشتاقان مولیٰ، اور عمل مشائخین عظام کا اسی طرح جاری ہے کہ جب کوئی مرید بحکم ترک تعلق ان کی طرف رجوع لاتا ہے تو اس کی تادیب تین امور، خدمتِ خلق، خدمتِ حق، مراعاتِ دل میں کرتے ہیں پس خدمتِ خلق کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو سب کا خادم اور تمام خلق کو اپنا مخدوم سمجھے۔ یعنی بلاتمیز سب کو اپنے سے بہتر جانے اور سب کی خدمت اپنے آپ پر واجب گردانے اور خدمتِ حق کے لئے یہ لازم ہے کہ تمام حظوظ دنیا اور عقبےٰ کو اپنے سے منقطع کر دے اور خاص طور پر حق تعالیٰ کی پرستش ہی بجالائے اور اگر یہ پرستش کسی دوسرے سبب سے ہوگی تو حق تعالیٰ کی پرستش نہ ہوگی بلکہ اپنی ہوگی اور مراعات دل کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی ہمت مجتمع رہے اور سارے ہموم و افکار کو دل سے دور کر دے اور تمام اسباب غفلت سے دل کو محفوظ رکھے اور ہر لحظہ اس کی نگہبانی کرتا رہے۔ پھر جب ان تینوں امور پر متصرف و قابض ہو جائے اور تینوں ہی حاصل ہو جائیں تو وہ ارادتمند طریق طریقت کے قابل سمجھا جاتا ہے اور ارباب تصوف اس کو خرقہ پہنانا سزاوار سمجھتے ہیں۔ اور خرقہ پہنانے والا وہ صوفی مستحق ہوگا جو خود مستقیم الحال اور تمام نشیب و فراز طریقت سے گزر چکا ہو۔

حسب روایت حضرت خلیفہ سیف الدین قدس سرہٗ جو صاحب فصوص الآداب ہیں۔ اس خرقۂ درویشی کی اصل وہ گلیم سیاہ ہے جو سرکار دو عالم سرورِ کونین محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضور سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کو اوڑھائی تھی اور وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ قدس سرہٗ نقل کرتے ہیں کہ خرقہ کی اصل وہ عبا ہے جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے حضرت شیر خدا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو اور ان سے مابعد کے مشائخین عظام علیہم الرحمۃ کو یکے

بعد دیگرے پہنچی۔ اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ حقیقتِ خرقہ یہ ہے کہ رب العزت جلّ جلالہٗ نے خرقہ کو واسطہ طہارت اور تشریف پوشیدہ اہلِ خرقہ کا کیا ہے۔ پس سرکارِ دوجہاں مختارِ کون و مکان محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حقائق اسرارِ نبوت اور دقائق رازہائے ولایت اس خرقہ میں ودیعت فرمائے۔ جو شاہ ولایت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کو پہنایا اور راحت القلوب اور سیر الاولیا اور دیگر کتب اہلِ سلوک میں ہے کہ خرقہ درویشی حضور علیہ السّلام کو شبِ معراج میں حضرت رب العزت جل مجدہٗ سے مرحمت ہوُا تھا جو ایک گلیم سیاہ کی صورت میں تھا۔ مگر اس روایت کو محدثین ثابت نہیں کرتے۔ اور اس کے غلط ہونے پر متفق ہیں۔ جیسا کہ مجمع بحار الانوار اور موضوعاتِ کبیر ملا علی قاری سے ظاہر ہے اور خرقہ اور بعیت کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں لکھتے ہیں کہ اصل اس کی سنتِ سنیہ ہے۔ یعنی خرقہ کی اصل تو حضور علیہ السّلام کا لباس ہے جو حضور نبی کریم رؤف رحیم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو امیرِ لشکر بنایا تھا تو اپنا عمامہ عطا فرمایا تھا۔ اور بعیت کا وجود خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت و یقینی ہے جو پچھلے باب میں تفصیلاً بیان ہو چکا ہے اور رسمِ خرقہ و بعیت جیسا کہ مرسوم ہے اس کی نسبت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ حضرات صوفیا صافیہ جو پہلے زمانہ میں ہوئے ہیں ان کا ارتباط صحبت و تعلیم و تادب بہ آدابِ تہذیبِ نفس سے تھا نہ خرقہ و بعیت سے۔ بلکہ یہ رسم خرقہ حضرت سید الطائفہ ابوالقاسم جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ظاہر ہوئی اور اس کے بعد رسمِ بعیت پیدا ہوئی اور فرماتے ہیں کہ حضرات صوفیا کرام کی رسم قدیم ہے کہ اپنے احباب کو خرقہ پہناتے ہیں۔ کلاہ، عمامہ، قمیص، چادر وغیرہ جو بھی وقت پر میسّر ہو۔ اور یہ خرقہ پوشی تین طرح پر ہوتی ہے۔ ایک خرقہٗ اجازت ہے، جو تلقین اور صحبت میں اپنے کسی دوست (مرید) کو اپنا نائب مقرر کرنے اور طریقت کی اجازت دینے میں دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ طالبوں سے آگے بعیت لینے کا اپنے آپ کو مجاز سمجھے۔

دوسرے خرقہٗ ارادت اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی عزیز صوفیوں کے زمرہ میں داخل ہوتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چل کر منزلِ مقصود پر جدوجہد میں مصروف ہو جاتا ہے تو اس کی استقامت دیکھ کر اس کو خرقہ عطا کر دیتے ہیں کہ اس کے لئے صوفیوں میں قیام کرنے کی علامت ہو۔

تیسرے خرقہٗ تبرک ہے کہ کوئی شیخِ طریقت جب کسی پر مہربان ہو تو اس کو خرقہ عطا فرما دے تاکہ حضرات صوفیائے کے برکات اس کے شاملِ حال ہوں، بلا لحاظ اس کے کہ وہ شخص بادشاہ ہو یا امیر ہو یا تاجر یا کوئی درویش ہو۔ پھر حضرات صوفیائے کرام نے بعیت کی بھی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

نمبر۱۔ بیعت توبہ ہے۔ جو گناہوں سے توبہ کرنے کے لئے ہر نیک آدمی کے ہاتھ پر کی جاسکتی ہے۔ اور ہر مسلمان جس صالح آدمی سے چاہے بیعت کر سکتا ہے اور بیعت لے سکتا ہے۔

نمبر۲۔ بیعت تبرک ہے کہ کوئی صالحین کے سلسلہ میں داخل ہونے کیلئے کسی سے بیعت کرے۔

نمبر۳۔ بیعت تحکیم ہے۔ کہ شیخ کو سلوک طریق مجاہدہ میں اپنے آپ پر حاکم کرے یعنی اپنے ارادہ اور اختیار کو چھوڑ کر اسی کی تابعداری میں قدم مارے اور خوب کوشش سے اس راہِ سلوک کو طے کرے۔ یہ بیعت خاص ارباب ارادت کیلئے ہے

سلاسل فقراء

مولا کریم جل وعلا شانہٗ کی بے شمار نعمتوں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے اپنی معرفت کا راز کھولنے کے لئے خود بخود بذریعہ انبیاء علیہم السلام ایک ایسے سلسلہ کا اجراء اور اظہار فرمایا جس سے اس تک پہنچنے میں ایک گونہ آسانیاں ہو جائیں اور تمام انبیاء علیہم السلام سے خاص امتیازی حیثیت اپنے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی اور حضورؐ کے ذریعہ اپنے تک پہنچنے کے لئے بعض سلسلوں کا ربط ثابت فرمایا۔ حضور علیہ السلام حقیقتاً خلیفۂ رب العالمین ہیں اور آپ ہی نے رازِ درویشی اور عشق و محبت خداوند حقیقی جل وعلا شانہٗ کو عالم میں ظاہر فرمایا۔ اور خلق خدا کو خدائے خلاق تک پہنچانے کا سبب بنایا۔ پس یہ سلسلہ پشت بہ پشت اور سینہ بہ سینہ آپ کے خلفاء مہدیین سے الی یوم الدین قائم ہے اور رہے گا۔ آپ کے خلفاء انام آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔ جو بحکم شریعت و تربیت خاص چار مذکور ہیں۔ اول یارِ غار سفر و حضر، رازدارِ ہجرت حضرت سیدنا امیر المومنین ابن ابی قحافہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ دوئم عدلِ مجسم اشداء علی الکفار سیدنا امیر المومنین فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔ سوئم مولائے ذی النورین جامع القرآن سیدنا امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ چہارم باب علم مدینۃ النبی اسد اللہ الغالب، فاتح خیبر، داماد رسول، زوج بتول، والد حسنین سیدنا امیر المومنین علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ صاحب کتاب مسالک السالکین لکھتے ہیں کہ سوائے سلسلہ نقشبندیہ عالیہ کے جو سیدنا امیر المومنین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ہے۔ باقی سارے سلسلے امیر المومنین حضرت شیرِ خدا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے جاری ہیں جن کی تفصیل آگے مذکور ہوگی۔

چار پیر اور چودہ خانوادے

صاحب مسالک السالکین و لطائف اشرفی و تذکرۃ الاولیاء و فوائد الفواد و اوراد غوثیہ و دیگر اکثر مشائخ کبار اس بات پر متفق ہیں کہ خرقۂ خلافت سیدنا حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے چار اولوالعزم اصحاب کو پہنچا ہے۔ اول سیدنا امیر المومنین حضرت امام حسن علیہ السلام، دوئم سید الشہداء امام حسین علیہ السلام، سوئم خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ، چہارم خواجہ کمیل بن زیاد رضی اللہ عنہ۔ اور یہی چاروں حضرات چار خلفاء طریقت

اور چار پیر بیان کیے جاتے ہیں - حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کو بعد رحلت و وفات شریف حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہ کے فیض و خرقہ خلافت سیدنا امیر المومنین حضرت حسن علیہ السلام سے بھی پہنچا ہے اور حضرت خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ' بسبب منظورِ نظر حضرت شیر خدا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہ' ہونے کے مقتدائے مشائخین ہوئے اور چودہ خانوادے آپ کے خلفا، حضرت عبدالواحد بن زید حضرت خواجہ حبیب عجمی رضی اللہ عنہما سے بایں تفصیل جاری ہوئے کہ حضرت عبدالواحد بن زید سے پانچ خانوادے، زیدیہ، عیاضیہ، اُدھمیہ، ہبیریہ، چشتیہ، جن پانچوں کو خانوادے زیدیہ بھی کہتے ہیں اور حضرت حبیب عجمی سے نو خانوادے - حبیبیہ، طیفوریہ، کرخیہ، سقطیہ، جنیدیہ، گازرونیہ، طوسیہ، فردوسیہ سہروردیہ جو خانوادے حبیبیہ بھی کہلاتے ہیں - مزید تفصیل پانچ خانوادوں زیدیہ کی اور جو اُن سے شاخیں اور گروہ ظاہر ہوئے صاحب مسالک السالکین نے یوں بیان فرمائی ہے -

خانوادہ زیدیہ - خاص عبدالواحد بن زید رضی اللہ عنہ' سے ، خانوادہ عیاضیہ حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ' سے

خانوادہ ادھمیہ حضرت ابراہیم ادھم رضی اللہ عنہ سے - خانوادہ ہبیریہ حضرت خواجہ امین الدین ہبیرۃ البصری رضی اللہ عنہ سے خانوادہ چشتیہ حضرت ابو اسحٰق شامی چشتی رضی اللہ عنہ سے جاری ہوئے ہیں - نیز خانوادہ ادھمیہ سے ایک گروہ خضرویہ بھی حضرت احمد خضرویہ سے جاری ہوا ہے - یہ حضرت احمد خضرویہ خلیفہ حضرت حاتم الاصم کے تھے - اور وہ خلیفہ حضرت خواجہ شفیق بلخی کے اور وہ خلیفہ حضرت سلطان ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے تھے - خانوادہ چشتیہ سے مندرجہ ذیل بارہ[۱۲] شاخیں جاری ہوئیں - یعنی کرمانیہ حضرت شاہ عبداللہ کرمانی سے - کریمیہ - حضرت پیر کریم سیلونی سے - صابریہ حضرت مخدوم علاؤ الدین صابر سے - قلندریہ - حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی سے - نظامیہ - حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخ نظام الدین اولیا دہلوی سے - مخدومیہ - حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیا پانی پتی سے حسامیہ - حضرت مخدوم حسام الدین ملک پوری سے - نظام شاہی - حضرت شیخ نظام الدین نارنولی سے - قلندر شاہی حضرت عزیز مکی سے - جیلیلیہ - حضرت پیر جیلیل شاہ سے - حمزہ شاہی - حضرت شیخ حمزہ شاہ سے - فخریہ - حضرت خواجہ فخر الدین فخر جہاں شاہ جہان آبادی سے ظہور پذیر ہوئیں -

تصریح نو خانوادوں حبیبیہ کی اور ان سے جو گروہ نکلے یوں تحریر فرماتے ہیں -

خانوادہ حبیبیہ - خاص حضرت خواجہ حبیب عجمی سے - خانوادہ طیفوریہ - حضرت خواجہ طیفور بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے

خانوادہ کرخیہ حضرت خواجہ اسدالدین معروف کرخی سے ۔خانوادہ سقطیہ ۔ حضرت خواجہ ابوالحسن سری سقطی سے ۔ خانوادہ جنیدیہ ۔ حضرت سیدالطائفہ ابوالقاسم جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے ۔خانوادہ گازرونیہ ۔ حضرت خواجہ ابواسحٰق گازرونی رحمۃ اللہ علیہ سے ۔خانوادہ طوسیہ ۔ حضرت خواجہ ابوالفرح طرطوسی رحمۃ اللہ علیہ سے ۔ یہ یاد رہے کہ اس خانوادہ میں حضرت محبوب سبحانی سیدنا غوث الاعظم محی الدین ابو محمد سید عبدالقادر پیران پیر جیلانی رضی اللہ عنہ بھی ہیں خانوادہ فردوسیہ ۔ حضرت خواجہ نجم الدین کبریٰ فردوسی اور خانوادہ سہروردیہ ۔ حضرت شیخ العالم شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رضی اللہ عنہ سے جاری ہے پھر خانوادہ طیفوریہ ۔ سے حسب ذیل گروہ نکلے ہیں ۔ جن کو صاحب اورادالاولیاء نے بڑے وثوق سے یوں بیان فرمایا ہے ۔شطاریہ ۔ حضرت خواجہ عبداللہ شطاری رحمۃ اللہ علیہ سے ۔ طبقاتیہ ۔ یا مداریہ حضرت شمس العارفین قطب مدار شاہ بدیع الدین رحمۃ اللہ علیہ سے ۔ ان کے آگے پانچ خلفاء تھے ۔ خانوادہ سقطیہ سے ایک گروہ نوریہ ۔ حضرت خواجہ ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ سے جاری ہوا ۔ خانوادہ جنیدیہ سے تین گروہ اوّل انصاریہ حضرت شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری سے ۔ دوئم رفعیہ ۔ حضرت سید احمد کبیر رفعی سے ۔ سوئم بسوویہ حضرت خواجہ احمد بسوی رحمۃ اللہ علیہ سے نکلے ہیں ۔ اور اسی طرح خانوادہ گازرونیہ سے تین گروہ اوّل زاہدیہ حضرت خواجہ فخرالدین زاہد سمرقندی سے ، دوئم اولیائی حضرت اولیاء سے ، سوئم چشتی ایک نامعلوم الاسم چشتی صاحب سے نکلے ۔ خانوادہ طوسیہ سے حسب ذیل اکیس ۲۱ گروہ نکلے جن کو صاحب مسالک السالکین نے اس تفصیل سے بیان فرمایا ہے کہ :-

قادریہ ۔حضرت غوث الاعظم محی الدین سیدنا ابو محمد عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ۔

رزاقیہ ۔حضرت سید عبدالرزاق خلف الرشید حضرت پیران پیر محی الدین عبدالقادر جیلانی رضؓ سے ۔

وہابیہ ۔حضرت سید عبدالوہاب خلف الرشید حضرت غوث الاعظم عبدالقادر جیلانی رضؓ سے ۔

قبلشیہ ۔ حضرت خواجہ قبیش رحمۃ اللہ علیہ سے ۔

میاں خیل ۔حضرت خلیل شاہی سلیمان جہاز گرمک سے (جہاز گرک ایک قلعہ کا نام ہے جہاں مقیم تھے)

محمد شاہی ۔ حضرت بزرگوار شاہ محمد حیات رحمۃ اللہ علیہ سے ۔

غفور شاہی ۔حضرت شیخ عبدالغفور رحمۃ اللہ سے ۔

نعمت شاہی - حضرت شاہ نعمت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے -

سید شاہی - حضرت سید محمود حضوری لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے -

بہلول شاہی - حضرت سلطان العارفین بہلول دریائی رحمۃ اللہ علیہ سے -

قمیصیہ - حضرت سید شاہ قمیص الدین ابی الحیات جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے -

میاں خیل - حضرت زبدۃ العارفین میاں میر بالا پیر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے -

حسین شاہی - حضرت شاہ لعل حسین لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے -

ہاشم شاہی - حضرت میر علی ہاشم قادری چہار ضربی رحمۃ اللہ علیہ سے -

مقیم شاہی - حضرت سید محمد مقیم محکم الدین ابن سید ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ سے -

نوشاہی - حضرت خواجہ فضیل نوشاہی قادری رحمۃ اللہ علیہ سے -

جباری - حضرت سید عبدالجبار شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے -

محمود شاہی - حضرت محمود بونٹے سے - اس گروہ کے درویش گلے میں ایک مونج کی رسّی باندھتے ہیں -

سدّو شاہی - حضرت شاہ سدّو رحمۃ اللہ علیہ

خاکساریہ - حضرت شاہ خاکسار ارم پاری رحمۃ اللہ علیہ سے -

قاسم شاہی - حضرت حاجی محمد قاسم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے - اس گروہ کے درویش سر پر سیاہ رومال رکھتے ہیں -

خانوادہ فردوسیہ سے ایک گروہ نے دو نام پائے ہیں ایک حبیب شاہی اور دوسرا بُڈھن شاہی یہ گروہ حضرت شاہ بُڈھن دیوان خلیفہ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ فردوسی رحمۃ اللہ علیہ سے جاری ہوا ہے حضرت شاہ بُڈھن دیوان کے تیرہ خلفا تھے - ان میں سے دس خلفاء یعنی میر سید صدرالدین، شاہ شمس الدین، سید شاہ بغدادی - بایزید خاں ابدالی - شاہ عشق اللہ، شاہ عبدالقادر، شاہ درگاہی، شاہ داؤد، سید جعفر مکی - سید داؤد میران رحمۃ اللہ علیہ سے صاحب سلسلہ گزرے ہیں اور ان کے تمام مرید اپنے اپنے شیخ کے ناموں سے مشہور ہیں - باقی تین خلفاء حضرت احمد مجذوب، چھوڑ خاں مجذوب، پہاڑ خاں مجذوب بے سلسلہ ہوئے ہیں - خانوادہ سہروردیہ سے سترہؔ گروہ پیدا ہوئے - جن کی تشریح صاحب سلسلہ حضرات نے یوں بیان فرمائی ہے -

صوفیہ - حضرت قاضی حمید الدین صوفی ناگوری رحمۃ اللہ علیہ سے -

جلالیہ - حضرت سید جلال بخاری سے جس کے درویش ایک سیلی سر پر باندھتے ہیں اور ایک سینگ ہرن کا بطور نشان اپنے پاس رکھتے ہیں - اور حالت ذوق وشوق میں اس کو بجاتے ہیں اور مہر نبوت کا تمغہ ان کے بازو پر رہتا ہے -

لعل شہبازیہ - حضرت لعل شہباز سیون شریف سندھ والوں سے -

مخدومیہ - حضرت سید جلال الدین ملقب بہ مخدوم جہانیاں رحمۃ اللہ علیہ سے -

کرم علی جہلی - حضرت شاہ کرم علی جہلی سے اس سلسلہ کے درویشوں کے پاس ایک کوڑا ہوتا ہے - جو بوقت غلبہ عشق وہ اپنے آپ پر مارتے ہیں -

موسیٰ شاہی - حضرت شاہ محمد موسےٰ رحمۃ اللہ علیہ سے - اس گروہ کے درویش سدا سوہاگی کہلاتے ہیں - اور زنانہ لباس بھی پہنتے ہیں -

رسول شاہی - حضرت سید شاہ رسول الوری رحمۃ اللہ علیہ سے اس گروہ کے فقراء اپنے چہروں پر خاک لگاتے ہیں - اور رومال سر پر باندھتے ہیں اور رات کو سونا حرام سمجھتے ہیں -

میران شاہی - حضرت شاہ میران موج ہری بندگی سے -

عید روسیہ - حضرت سید عبداللہ مالکی عید روسی سے -

قاسم شاہی - حضرت حاجی محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے - اس سلسلہ کے درویش رقص وسرود میں زیادہ حصہ لیتے ہیں - بلکہ پاؤں میں گھنگرو باندھ کر مجالس فقراء میں ناچتے ہیں - جس کو پنجابی میں دھمال کہتے ہیں -

رزاق شاہی - حضرت شاہ عبدالرزاق مخدومی رحمۃ اللہ علیہ سے -

دولا شاہی - حضرت شاہ دولا دریائی رحمۃ اللہ علیہ سے - اس گروہ کے فقیر خاک سے ایک الف اپنی پیشانی پر کھینچتے ہیں - جس سے الف اللہ کے فقیر بھی کہلاتے ہیں -

سید شاہی - حضرت سید سادات خان بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے -

اسمٰعیل شاہی - حضرت شاہ اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ سے -

حبیب شاہی - حضرت شاہ حبیب ملتانی رحمۃ اللہ علیہ سے -

مرتضیٰ شاہی - حضرت آنند بخاری سے - جنکو آنند چرخی والا بھی کہتے ہیں -

ناتھہ شاہی - اس سلسلہ کا بعض مقامات پر کوئی درویش ملتا ہے - مگر پوری کیفیت معلوم نہیں ہو سکی کہ یہ کن حضرات سے جاری ہوا ہے -

خاندان نقشبندیہ

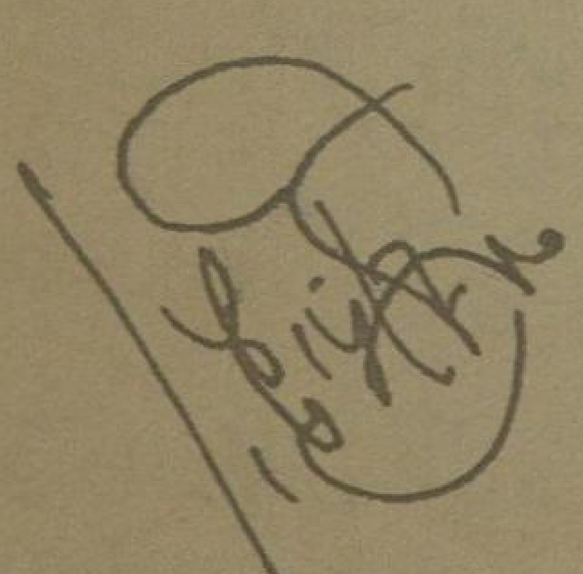
یہ خاندان حضرت محمد قاسم بن محمد بن حضرت امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے جاری ہوا ہے اور اس سلسلہ کے تین گروہ ہیں :-

نقشبندیہ - حضرت خواجہ مشکلکشا بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے -

مجددیہ - حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ بدرالدین احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ سے -

ابوالعلائی - حضرت سید میر ابوالعلاء اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے - اس سلسلۂ عالیہ کی مزید بحث دیگر کتب سلسلہ نقشبندیہ میں دیکھنی چاہیئے -





روابطِ مصاحبینِ شیخ

کسی گذشتہ باب میں آدابِ شیخ اور فرائضِ مرید پر مفصّل بحث ہو چکی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس ضمن میں پیر بھائیوں کے باہمی تعلقات کا ذکر نہ کرنا کتاب میں ایک خامی کا موجب ہوگا۔ لہٰذا یہ چیز بڑی قابلِ وضاحت معلوم ہوتی ہے کہ ان حالات و تعلقات کا بھی ذکر کر دیا جائے جو ایک شیخ کے دو ارادتمندوں میں پیدا ہُوا کرتے ہیں یا ہونے چاہئیں۔

یہ ایک مسلّمہ مسئلہ ہے کہ انسان صحبت کے لحاظ سے بہت کچھ تاثرات قبول کرتا ہے جس میں سے بعض اس کی متجسس طبع پر مطابق اور بعض مخالف ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ پھر مطابق تاثرات بھی اس کی طبیعت دو طریق پر قبول کرتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ خواہ اس کے لئے طریقتہً ناجائز ہی ہوں مگر اس کی نفسانیت انہیں پسند کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی بات اس کی سمجھ میں مفید مطلب آئے یا نہ آئے، وہ محض یہ سمجھ کر کہ اس کے شیخ کی تعلیم کی ترجمانی ہو رہی ہے۔ اسے اعتقاداً قبول کر لیتا ہے۔ حالانکہ یہ میدان محض علم کا نہیں بلکہ اس میں جہاں تک عملی طور پر کسی چیز کو پایا جائے وہی قابلِ قبول ہونی چاہیئے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ بعض نئے آنے والے ارادتمند پرانے ارادتمندوں کی محض گفتگو ہی سے متاثر ہو کر کسی شیخ کی بیعت کا تہیہ کر لیتے ہیں۔ جو ایک نمایاں خامی کے مرادف ہے۔ کیونکہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ کسی شیخ کی مجلس میں جانے سے پہلے یا اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے سے قبل ارادتمند کو کسی صحیح اور شرعی معیار کی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔ محض شنید پر عرفانِ الٰہی کی تلاش میں کسی شخص کی غلامی کا قلادہ گلے میں ڈالنا اور اس کی اطاعت کا اقرار کر لینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ علومِ شرعی حاصل کرنے کے لئے جب ہم ایک مستند عالم باعمل استاد اور نیک عقیدہ راہنما اور پاکباز انسان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو علمِ طریقت کا حصول اور معرفتِ الٰہی کا دائرہ اس سے زیادہ عقیدت، پاکبازی اور حسنِ عمل کا مقتضی ہے۔

جہاں تک اس حقیقتِ کبریٰ کا تعلق ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صحیح شیخ اور سچے راہنما کی حیثیت ایک ہی بہترین عطر کی طرح ہے جو اپنی خوبیوں پر خود شاہد ہے۔ کوئی دوسری چیز اس پر گواہ ہو یا نہ ہو۔ ایک مشہور مقولہ ہے "پیراں نے پرند مریداں می پرانند" جب کسی درویش کی درویشی اور شیخ کی مشیخیت اس امر کی محتاج ہو جائے کہ وہ کسی دوسرے پروپیگنڈے کے زیر اثر اپنی آواز کو ذریعہ معاش بناتے ہوئے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرے۔ اور اس کا مقصد محض جلبِ منفعت اور دکانداری ہو، تو وہ پیری و مشائخی نہیں۔ بلکہ ایک مجرمانہ فریب ہے جو اس راستے کے سراسر منافی اور اھل اللہ کے صراطِ مستقیم کے قطعاً برخلاف ہے۔ ایسے بناوٹی اور دنیادار مدعی اور ان کے کاسہ لیس شرعاً قابلِ نفرین اور عنداللہ ماخوذ ہونے کے مستحق ہیں۔ ایسی دکھاوے کی درویشی اور نام نہاد طریقت کا نتیجہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ سادہ لوح انسان ایسے لوگوں کے دامِ تزویر میں پھنس کر تباہ حال ہو گئے ہیں اور وہ ایک غیر معین مدت تک اتباع کرنے کے باوجود بھی کسی منزلِ مقصود کو نہیں پا سکے۔ اور "ہنوز روزِ اول" کا مصداق بن کر کسی دوسرے راہنما کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

پنجابی میں ایک مشہور مقولہ ہے۔ "پیر پکڑ چھن کر اور پانی پیویں پن کر" یعنی ہر طالب کو چاہیئے کہ وہ میدانِ طریقت میں قدم رکھنے سے پہلے شیخ کے متعلق ان شرائط کو معلوم کرے جو سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ ذکر کی گئی ہیں۔ پھر جب وہ دیکھے کہ کوئی اللہ کا بندہ ان حقائق و خصائص کی موجودگی میں اسکی دستگیری کرنے کے لئے سامنے موجود ہے تو تلاشِ حق کے پیشِ نظر وہیں زانوئے ادب تہ کر دے۔ اس کے بعد اس کے سامنے تعلیم کی دو راہیں ہوں گی۔ ایک یہ کہ وہ اپنے پیر بھائیوں سے استفادہ حاصل کرے جو اس کی ابتدائی حیثیت کے عین مطابق ہو گا۔ دوسرا یہ کہ جو وہ صحبتِ شیخ سے پا سکے اور شیخ کی وہ تعلیم جو ایک مبتدی ہونے کی حیثیت سے اس کو ملے عملی طور پر اُس کی شدت کے ساتھ متابعت کرنے کا اپنے آپ کو اہل بنائے۔

متابعت شیخ تو ایک لابدی چیز ہے۔ جس سے کسی حالت میں بھی وہ سرِ مو انحراف کرنے کا مجاز نہیں ہو گا۔ مگر پیر بھائیوں کے تمام تر تذکار اور ان کی صحبت میں رہ کر تمام اعمال کو اپنانا بعض اوقات ایک مبتدی کے لئے مفید ہونے کے بجائے مضراثرات بھی پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اس کو یہ لازم ہو گا کہ پیر بھائیوں کے وہ ارشادات اور معاملات اپنانے کی کوشش کرے جو اس کی ابتدائی کوائف کے عین مطابق ہوں۔ ورنہ ہر پیر بھائی کے معاملات و حالات اور مقامات کو دیکھ کر اگر پیروی کے لئے آمادہ ہو گا تو نہ وہ پچھلوں کے اتباع کے قابل رہے گا اور نہ اگلوں کی مطابقت کر سکے گا۔ کیونکہ یہ ایک یقینی امر ہے

کہ کسی شیخ کے تمام متبعین طریقت کسی ایک منزل پر ہی چلنے والے نہیں ہوتے۔ ان میں سے اکثر وہ لوگ ہوں گے جو مبتدی ہوں گے اور بعض وہ جو انتہائی منازل پر چل رہے ہوں گے۔ فلہذا اس کے لئے اپنی حقیقت اور ابتدائی منزل کا احساس ایک نہایت ضروری شئے ہو گی۔

مبتدی کا فرض ہے کہ سب سے پہلے آداب شیخ میں وہ یہ تمیز حاصل کرے کہ مجھے اس مجلس میں گفتگو کرنے کیلئے اٹھنے، بیٹھنے کیلئے اپنی حقیقت کو شیخ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے اور کسی آئندہ کی ضرورت کے لئے کیا سلیقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اگر وہ خود اس بات کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اسے اپنے کسی منتہی پیر بھائی سے مشورہ کر لینا نہایت موزوں رہتا ہے۔ کیونکہ وہ اس مجلس میں سب سے واقف کار اور سب سے زیادہ نفع اٹھانے والا ہوتا ہے۔ مبتدی اگر کسی پیر بھائی کو شیخ سے آزادانہ طور پر گفتگو کرتے دیکھے۔ یا بعض حالات و معاملات میں بے باکانہ طور پر حد سے بڑھتا ہوا معلوم کرے تو خود اس بات میں اس پیر بھائی کا نقش دل میں رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ کیوں کہ ممکن ہے اس پر شیخ کی التفات و عنایات کا کوئی خاص سبب ہو۔ اور اگر یہ ایسا کرے گا تو نقصان اٹھا جائے گا۔

پیر بھائیوں میں بعض ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں۔ جن کا ظاہر ان کے باطن سے بالکل الگ تھلگ ہوتا ہے جس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ان کی موافقت کرنے سے بھی پرہیز کرے۔

شیخ کے حلقۂ ارادت میں بعض وہ پیر بھائی بھی ہوتے ہیں جن کو اپنے دوسرے پیر بھائیوں سے ان کے حالات و مقامات کے تذکار معلوم کرنے کا ذوق ہوتا ہے۔ اور وہ ہر پیر بھائی سے ازراہِ محبت یہ پتہ لگانے کی سعی کرتے رہتے ہیں کہ آنے والا نیا ارادت مند کچھ عرصے کے بعد حصول صحبت شیخ سے کیا کچھ حاصل کر سکا ہے۔ یا اس میں کیا تبدیلی واقع ہوئی ہے اور یہ ارشاد شیخ کے ماتحت صحیح جا رہا ہے یا اپنی نو آموزی سے کسی مغالطے میں گرفتار ہو گیا ہے۔ یہ امر ایک منتہی پیر بھائی کے لئے نہایت موزوں اور مبارک ہے کہ وہ اپنے نو آمدہ پیر بھائیوں کی وقتاً فوقتاً نگہداشت کرتا ہے یا کم از کم ان کی تعلیم ہی کی تحقیق اس کے مدِنظر ہو۔ لیکن وہ افراد جو منتہی نہیں ہیں اور محض اسی ذوق میں اپنے آپ کو مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ ہر نئے آنے والے دوست کے حالات سن کر اس کو شاباش دیں اور وہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو تو یہ ایک ہیچ سا فریبِ نفس ہے جس سے مبتدی کو بعض اوقات نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے اور نام نہاد منتہی اس بنا دی حظِ نفس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا جو اس کے لئے ایک معنوی زہر سے کم نہیں۔ بزرگانِ دین

نے لکھا ہے کہ ہر منتہی درویش کا فرض ہے کہ وہ پس ماندہ راہروؤں کو از راہ محبت و مودت منزلِ مقصود تک ساتھ ملانے کی اور منزل پر پہنچانے کی سعی کرے اور مبتدی کا یہ فرض ہے کہ وہ عدم موجودگی شیخ میں اس سے نفع اٹھانے کی سعی کو عمل میں لائے۔ اس طریق سے دونوں خوشنودیٔ باری تعالےٰ کے ماتحت تلاشِ حق میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر مبتدی کو کسی پیر بھائی سے ایسی اعانت کی توقع نہ ہو تو اس کے لئے ایسی صحبت غیر سے تجرد و تنہائی بہتر ہے۔ جو اسے فریبِ نفس سے بچا دے گی۔ کیونکہ اس راہ کے راہرو کے لئے قال سے حال اور علم سے عمل بہتر ہوتا ہے۔

ایک شیخ کے سب ارادتمندوں کے لئے یہ بات نہایت مستحسن ہے کہ وہ مل کر ایک حلقے میں ذکر و فکر کرنے کے علاوہ بزرگانِ دین کے ان تذکار کو بھی پڑھیں اور سنیں جو اپنے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہوں اور اس پر غور کریں کہ وہ لوگ اس راہ میں کیونکر کامیاب ہوئے ہیں۔ اور یہ چیز سب کے لئے شیخ کی موجودگی میں بطریق احسن اور عدم موجودگی میں بھی ایسی مفید مطلب ہوتی ہے کہ بعض اوقات ان تذکار کی شنید بھی طالب کی تلاش کے انکشاف کا باعث بن جاتی ہے۔ اور وہ جتنا عرصہ اس حال و قال کی محفل میں بیٹھیں گے رب العزت کی رحمت سے بہرہ وافر پائیں گے۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہو کہ کسی کو یہ مجلس اور صحبت میسر نہ آئے تو اس کے لئے بزرگانِ خاندان کا شجرہ اور ان کے کمالات کی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے شیخ کی تعلیم پر شدت سے عمل پیرا ہونا بھی موجبِ سعادت ہوگا۔

فی زمانہ کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو طریقت کی پیچیدگیوں کو نہ سمجھتے ہوئے بعض اوقات کسی دنیوی مقصد کی ناکامی سے صحبتِ شیخ اور اوامرِ شیخ سے انحراف کر جاتے ہیں مگر کبھی کبھی الحاق کا دعوےٰ بھی ان کی زبانوں سے ثابت ہوتا رہتا ہے۔ جس کی غرض محض یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے دوسرے ان پیر بھائیوں کو الٹی راہ پر ڈال سکیں۔ اور شیخ سے علیحدگی کا سبق دے سکیں جو موجودہ وقت تک شیخ کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہیں۔ ایسے پیر بھائیوں کو ان کی حالت پر چھوڑتے ہوئے نہ تو ان سے الجھنا چاہئے اور نہ ہی اُن کی اس دوری کے لئے ان کو ملامت کرنی چاہئے۔ کیونکہ ممکن ہے انہیں مولا کریم بعض حالات کے ماتحت پھر کسی وقت ہدایت فرمائے اور وہ اپنی کمی کو محسوس کرتے ہوئے پھر دربارِ شیخ میں آنے کی جرأت کر سکیں۔ ان کے ساتھ الجھنے سے بعض اوقات ان کے انحراف کی خلیج اور حائل ہو جاتی ہے اور بعض اوقات ان کی باتوں کو کان دھر کر سننے والا مبتدی بھی انہی کی طرح بہک جاتا ہے۔ ایسی لغو اور بیہودہ گفتگو شیخ کے متعلق سننا اور اس پر ایک ساعت کے لئے غور و پرداخت کو دل میں جگہ دینا ایک بڑی گمراہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

کہ کسی شیخ کے تمام متبعین طریقت کسی ایک منزل پر ہی چلنے والے نہیں ہوتے۔ ان میں سے اکثر وہ لوگ ہوں گے جو مبتدی ہوں گے اور بعض وہ جو انتہائی منازل پر چل رہے ہوں گے۔ فلہذا اس کے لئے اپنی حقیقت اور ابتدائی منزل کا احساس ایک نہایت ضروری شئے ہوگی۔

مبتدی کا فرض ہے کہ سب سے پہلے آداب شیخ میں وہ یہ تمیز حاصل کرے کہ مجھے اس مجلس میں گفتگو کرنے کیلئے اٹھنے بیٹھنے کیلئے اپنی حقیقت کو شیخ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے اور کسی آئندہ کی ضرورت کے لئے کیا سلیقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اگر وہ خود اس بات کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اسے اپنے کسی منتہی پیر بھائی سے مشورہ کر لینا نہایت موزوں رہتا ہے۔ کیونکہ وہ اس مجلس میں سب سے واقف کار اور سب سے زیادہ نفع اٹھانے والا ہوتا ہے۔ مبتدی اگر کسی پیر بھائی کو شیخ سے آزادانہ طور پر گفتگو کرتے دیکھے۔ یا بعض حالات و معاملات میں بے باکانہ طور پر حد سے بڑھتا ہوا معلوم کرے تو خود اس بات میں اس پیر بھائی کا نقش دل میں رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ کیوں کہ ممکن ہے اس پر شیخ کی التفات و عنایات کا کوئی خاص سبب ہو۔ اور اگر یہ ایسا کرے گا تو نقصان اٹھا جائے گا۔

پیر بھائیوں میں بعض ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں۔ جن کا ظاہر ان کے باطن سے بالکل الگ تھلگ ہوتا ہے جس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ان کی موافقت کرنے سے بھی پرہیز کرے۔

شیخ کے حلقۂ ارادت میں بعض وہ پیر بھائی بھی ہوتے ہیں جن کو اپنے دوسرے پیر بھائیوں سے ان کے حالات و مقامات کے تذکار معلوم کرنے کا ذوق ہوتا ہے۔ اور وہ ہر پیر بھائی سے ازراہ محبت یہ پتہ لگانے کی سعی کرتے رہتے ہیں کہ آنے والا نیا ارادت مند کچھ عرصے کے بعد حصول صحبت شیخ سے کیا کچھ حاصل کر سکا ہے۔ یا اس میں کیا تبدیلی واقع ہوئی ہے اور یہ ارشاد شیخ کے ماتحت صحیح جا رہا ہے یا اپنی نو آموزی سے کسی مغالطے میں گرفتار ہو گیا ہے۔ یہ امر ایک منتہی پیر بھائی کے لئے نہایت موزوں اور مبارک ہے کہ وہ اپنے نو آمدہ پیر بھائیوں کی وقتاً فوقتاً نگہداشت کرتا رہے یا کم از کم ان کی تعلیم ہی کی تحقیق اس کے مدنظر ہو۔ لیکن وہ افراد جو منتہی نہیں ہیں اور محض اسی ذوق میں اپنے آپ کو مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ ہر نئے آنے والے دوست کے حالات سن کر اس کو شاباش دیں اور وہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو تو یہ ایک ہیچ سا فریب نفس ہے جس سے مبتدی کو بعض اوقات نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے اور تمام نہاد منتہی اس بنا دئی حظ نفس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا جو اس کے لئے ایک معنوی زہر سے کم نہیں۔ بزرگان دین

نے لکھا ہے کہ ہر منتہی درویش کا فرض ہے کہ وہ پس ماندہ راہروؤں کو از راہ محبت و مودت منزلِ مقصود تک ساتھ ملانے کی اور منزل پر پہنچانے کی سعی کرے اور مبتدی کا یہ فرض ہے کہ وہ عدم موجودگی شیخ میں اس سے نفع اٹھانے کی سعی کو عمل میں لائے۔ اس طریق سے دونوں خوشنودئ باری تعالےٰ کے ماتحت تلاش حق میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر مبتدی کو کسی پیر بھائی سے ایسی اعانت کی توقع نہ ہو تو اس کے لئے ایسی صحبت غیر سے تجرد و تنہائی بہتر ہے۔ جو اسے فریب نفس سے بچاوے گی۔ کیونکہ اس راہ کے راہرو کے لئے قال سے حال اور علم سے عمل بہتر ہوتا ہے۔

ایک شیخ کے سب ارادتمندوں کے لئے یہ بات نہایت مستحسن ہے کہ وہ مل کر ایک حلقے میں ذکر و فکر کرنے کے علاوہ بزرگان دین کے ان تذکار کو بھی پڑھیں اور سنیں جو اپنے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہوں اور اس پر غور کریں کہ وہ لوگ اس راہ میں کیونکر کامیاب ہوئے ہیں۔ اور یہ چیز سب کے لئے شیخ کی موجودگی میں بطریق احسن اور عدم موجودگی میں بھی ایسی مفید مطلب ہوتی ہے کہ بعض اوقات ان تذکار کی شنید بھی طالب کی تلاش کے انکشاف کا باعث بن جاتی ہے۔ اور وہ جتنا عرصہ اس حال وقال کی محفل میں بیٹھیں گے رب العزت کی رحمت سے بہرہ وافر پائیں گے۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہو کہ کسی کو یہ مجلس اور صحبت میسر نہ آئے تو اس کے لئے بزرگان خاندان کا شجرہ اور ان کے کمالات کی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے شیخ کی تعلیم پر شدت سے عمل پیرا ہونا بھی موجب سعادت ہوگا۔

فی زمانہ کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو طریقت کی پیچیدگیوں کو نہ سمجھتے ہوئے بعض اوقات کسی دنیوی مقصد کی ناکامی سے صحبت شیخ اور اوامر شیخ سے انحراف کر جاتے ہیں مگر کبھی کبھی الحاق کا دعوےٰ بھی ان کی زبانوں سے ثابت ہوتا رہتا ہے۔ جس کی غرض محض یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے دوسرے ان پیر بھائیوں کو الٹی راہ پر ڈال سکیں۔ اور شیخ سے علیحدگی کا سبق دے سکیں جو موجودہ وقت تک شیخ کے دامن ارادت سے وابستہ ہیں۔ ایسے پیر بھائیوں کو ان کی حالت پر چھوڑتے ہوئے نہ تو ان سے الجھنا چاہئے اور نہ ہی اُن کی اس دوری کے لئے ان کو ملامت کرنی چاہئے۔ کیونکہ ممکن ہے انہیں مولا کریم بعض حالات کے ماتحت پھر کسی وقت ہدایت فرمائے اور وہ اپنی کمی کو محسوس کرتے ہوئے پھر دربار شیخ میں آنے کی جرأت کر سکیں۔ ان کے ساتھ الجھنے سے بعض اوقات ان کے انحراف کی خلیج اور حائل ہو جاتی ہے اور بعض اوقات ان کی باتوں کو کان دھر کر سننے والا مبتدی بھی انہی کی طرح بہک جاتا ہے۔ ایسی لغو اور بیہودہ گفتگو شیخ کے متعلق سننا اور اس پر ایک ساعت کے لئے غور و پرداخت کو دل میں جگہ دینا ایک بڑی گمراہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اس ضمن میں ایک چیز پیر بھائیوں کے بعض وہ ذاتی تعلقات ہیں جو اُن کی اپنی ضروریات و بود و باش اور ملاقاتوں سے متعلق ہیں، ایسے مواقع پر جب وہ ایک دوسرے سے ملیں تو ان کے لئے حسب مراتب ایک دوسرے کا احترام و اکرام لازم و واجب ہوتا ہے جب وہ کسی اپنے پیر بھائی کی کسی ضرورت کو محسوس کریں کہ وہ اس میں ان کی اعانت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے تو حتی الامکان اس کی مدد سے دریغ نہ کریں اور یہ سمجھیں کہ میں نے ایک پیر بھائی کی اس لئے اعانت کی ہے کہ وہ عندالضرورت اس کا مستحق ہے اور مجھے اس نیکی سے عنداللہ ماجور ہونے کی توقع ہے نہ از روئے احسان اور ایذا کے جس سے کبھی معاوضہ حاصل کرنے کی بُو آئے یا کم از کم اس پر احسان جتا کر اس کا دل دکھایا جاسکے گویا ہر پیر بھائی کی مدد و تعظیم اور احترام و اکرام محض للہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نقش قدم پہ ہونی چاہئے۔ اور یہ وہ فعل ہے جس سے جماعت کی تعمیر ہوتی ہے اور سلسلے کا شیرازہ مستحکم ہو جاتا ہے۔

تمام پیر بھائیوں کو اپنے آپ پر یہ لازم کر لینا چاہئے کہ وہ کسی دوسرے پیر بھائی کی عیب جوئی نہ کریں اور نہ اسے شیخ کے سامنے بصورت شکوہ لائیں۔ بلکہ ملاطفت اور نرمی سے ہر وہ رنگ اختیار کریں جس سے اس کا وہ عیب ثواب سے بدل جائے۔ کیونکہ مبتدیوں میں بعض خامیوں کا پایا جانا ایک یقینی امر ہے جو اصلاح طلب تو ہوتی ہیں مگر شکوہ ساز اور طعن طلب نہیں ہوتیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں غیبت کرنا بھائی کے خون چوسنے سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ ہاں ہمدردانہ رنگ میں کسی پیر بھائی کی سفارش جس میں ہجو و شکایت کا پہلو نہ پایا جائے دربار شیخ میں گزراننا ایک مستحسن فعل ہے مگر اس میں بھی محتاط رہنے کی اسی قدر ضرورت ہے۔ جس قدر اس کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو سکے۔

پیر بھائیوں کے لئے یہ امر بھی موجب پرہیز ہے کہ اگر وہ کسی پیر بھائی پہ شیخ کے انعام و اکرام کو زیادہ دیکھیں تو حسد کریں۔ ان کے لئے بہتر یہ عمل ہوتا ہے کہ وہ ان معاملات کو اپنانے کی کوشش کریں جو شیخ کے دربار میں ان کی ظاہری و باطنی عزت افزائی کا موجب ہوں۔ کسی مقبول کو ہٹا کر اس کی جگہ لینے کے بجائے یہ بہتر ہوتا ہے کہ ان اقوال و افعال کو اختیار کیا جائے جو شیخ کی قلبی راحت اور قبولیت خدمت کا موجب ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ہر شخص بفضلہ تعالیٰ اپنی منزل مقصود کو پا سکتا ہے۔ اور کسی دوسرے کا نقصان بھی نہیں ہوتا۔ دو پیر بھائیوں میں تنفر ایک وہ مذموم فعل ہے، جو بعض اوقات دونوں کو انتہائی پستی میں ڈال دیتا ہے۔

پیر بھائیوں کے لئے یہ امر بھی موجب احساس نہیں ہونا چاہئے کہ ان کے اسباق و وظائف جداگانہ کیوں ہیں، اور

پیچھے آنے والے اگلی صف میں کیوں جگہ پا گئے ہیں ۔ یہ چیز شیخ کی ذرہ نوازی اور عمل شناسی کی دلیل ہوتی ہے ۔ جس کو وہ جس شے کا اہل سمجھتا ہے اس کے لئے ویسی ہی تلقین فرماتا ہے ۔ بعض مبتدی وہ ہوتے ہیں جن کی استعداد فطری طور پر اگلی صف میں جگہ پانے کی مقتضی ہوتی ہے ۔ اور بعض پیشین آنے والے منتہی وہ ہوتے ہیں جن میں استعداد بھی شیخ کو خود ہی پیدا کرنی پڑتی ہے ۔ لہٰذا ان نوازشات پر پیچ و تاب کھانا گویا شیخ کی حقیقت شناسی و کرم گستری پر معترض ہوتا ہے ۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں "سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا" کا پتہ چلتا ہے ۔

اسی باب صحبۃ الاخوان میں سیدنا قطب الاقطاب غوث الاعظم حضرت میراں محی الدین سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے فرمودات مزید توجہ کے قابل ہیں جو آپ نے "غنیۃ الطالبین" میں ارشاد فرما کر ایک شیخ کے ملنے والوں کو ان کے فی مابین تعلقات سے آگاہ فرمایا ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ ہر ارادتمند اپنے پیر بھائی کے لئے ایثار، جوانمردی، درگزر اور خدمت کا التزام رکھے کسی پیر بھائی پر اپنا حق نہ جتائے اور ہر ایک کا حق اپنے اوپر ملحوظ سمجھے ۔ اس کے پیر بھائی جو کچھ کریں، یا کہیں ان کی موافقت کرے کسی پیر بھائی سے مخالفت نہ کرے ۔ نفرت نہ رکھے ۔ جھگڑا نہ کرے اور سخت گیری نہ کرے اور ان کے عیوب سے چشم پوشی کرے ۔ اگر کوئی پیر بھائی کسی معاملہ میں اس کی مخالفت کرے تو بظاہر اس کے ادب کے لحاظ سے تسلیم کر لے ۔ خواہ حقیقت امر اس کے خلاف ہی ہو ۔ ہمیشہ اپنے پیر بھائیوں کے جذبات کا لحاظ کرے ۔ اور ہر اس چیز سے احتراز کرے جو انہیں ناپسند ہو ۔ کسی سے کسی قسم کا کینہ نہ رکھے اور اگر کسی پیر بھائی کے دل میں اس کے متعلق ناپسندیدگی پیدا ہو تو اس کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آیا کرے ۔ اور اس کے ساتھ نیکی اپنے اوپر لازم کر لے ۔ تاکہ وہ ناپسندیدگی اس کے دل سے زائل ہو جائے ۔ اور اگر اپنے دل میں کسی پیر بھائی کی طرف سے غیبت وغیرہ کے باعث کوئی اذیت محسوس کرے ۔ تو اپنی طرف سے اسے ظاہر نہ ہونے دے بلکہ اپنا عمل اس کے خلاف ظاہر کرے ۔

اعمال واشغال

عقائد

جس طرح کسی گذشتہ باب میں چند ظاہری اعمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو عادت میں داخل کر لینے سے ایک متلاشی انسان ولایت کی راہ پا سکنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہاں ان اشغال وعقائد کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو افعال واعمال اور اوراد ووظائف اور تذکار وافکار میں اہل اللہ نے اختیار فرما کر مجاہدے کئے اور منصب ولایت اور مسند قرابت پر متمکن ہوئے۔ جب تک متجسّین اس طریق کار پر اپنے نفوس کو پابند نہ کر سکیں گے۔ تب تک قرب الٰہی وقرب محبوب الٰہی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور رہیں گے ان میں سے چند وہ ہیں۔ جو ظاہری طور پر کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے ماتحت عادات واخلاق میں شامل کر کے اپنی اصلاح کی جاتی ہے۔ اور چند وہ جو خفیہ طور پر اعمال قلبی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں سب سے پہلے عقائد کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ جب تک عقائد صحیح نہ ہوں ولایت وتقرب بارگاہ تو درکنار بندہ مومن بھی نہیں ہو سکتا۔ ایک سچے اور پکے درویش کو چاہئے کہ اقرار لسانی اور تصدیق قلبی سے ہر اس ارشاد پر جو حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ بدیں صورت ایمان رکھے کہ حق سبحانہٗ تعالےٰ صانع عالم واجب الوجود ازلی وابدی ہے۔ ذات وصفات میں اس کی مثل نہ ہے نہ ممکن ہے۔ اور تمام کمالاتِ ممکنات اس کی عظمت ذاتی کے ظل وپرتو ہیں۔ حیات، قدرت، علم، کلام، سمع، بصر، ارادہ، جن سے وہ ازلاً متصف ہے اسکی صفات ذاتیہ اور باقی صفاتِ فعلیہ، نفسیہ، سلبیہ، اضافیہ ہیں۔ وہ کائنات کو خلعتِ وجود بخشنے سے پہلے بھی ایسا ہی کامل تھا۔ جیسے بعد میں ہے۔ مریض کو شفا بخشنا، رزق کا عطا فرمانا، تکلیفوں کا دور کرنا مستقل طور پر اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ لیکن یہ امر شرعاً ثابت ہے کہ مقربانِ بارگاہِ خدا کی دعا وہمت اور ذات مبارک مظہر فیضان ذات الٰہی ہے۔ صرف اسباب کو مدِنظر رکھنا اور مسبب جلشانہٗ کی قدرت کاملہ کا نہ ماننا یا قدرتِ کاملہ کو بعض اسباب میں ہی منحصر ومحدود خیال کرنا کفر ہے اور اسباب کا کلیتہً نفی کرنا سعادت دین ودنیا سے محروم رہنا ہے۔ اسباب ظاہری وباطنی (اولیا، مقربین) کو جلوہ گاہ صفات مان کر اُن سے مستفیض ومستفید ہونا بصیرت اور کمالیت ایمان کا نشان ہے۔ ذاتِ حق بے نیاز ہے کسی کا اس پر حق نہیں مگر اپنے فضل سے جو وعدہ فرمائے ایفا فرماتا ہے۔ اسکی

صفت عدل وفضل کی چھ صورتیں ہیں، ۱ وہ کسی پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں فرماتا۔ ۲ کسی کے اعمالِ حسنہ سے ذرہ بھر کمی نہیں فرماتا۔ ۳ کسی کو بغیر گناہ کے عذاب نہیں فرماتا۔ ۴ یہ اس کا فضل ہے کہ اپنے مسلمان بندوں پر جو مصیبت بھیجے اس میں بھی ان کے لئے اجر رکھتا ہے۔ ۵ کسی کو اطاعت یا معصیت پر جبر نہیں فرماتا۔ ۶ کسی کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ تمام اہلسنّت والجماعت کا اجماع ہے کہ جس اسم کے معنی میں تنقیص شانِ الوہیت ہو اس کا ذاتِ حق پر بولنا کلمۂ کفر ہے۔ حضور سرورِ عالم فخرِ آدم و بنی آدم نورِ مجسّم نبیٔ مکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم تمام انبیاء و مرسلین کے سردار اور سب سے افضل و خاتم الانبیاء ہیں میثاق توحیدِ الٰہی و ربوبیت ذاتِ حق جیسا کہ تمام بنی آدم سے لیا گیا ویسا ہی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت و تعظیم کا تمام انبیاء سے مؤکد طور پر عہد لیا جانا نصِ قرآنی سے ثابت ہے۔ اور آپ کی تعظیم ظاہری و باطنی سے ہر حالت میں متصف رہنا تمام اعمال و عبادات کی قبولیت کا اصل اصول اور آپ کے تمام کمالات ثابت النص کی تصدیق قلبی و اقرار لسانی اسلام و ایمان کا رکنِ اعظم ہے۔ جس کے بغیر کوئی بندہ کسی حالت میں بھی مومن یا مسلم نہیں ہو سکتا۔ آپ کی نبوت ایسی تامہ و خاتمہ و مستقلہ ہے کہ نہ تو آپ کے زمانہ میں اور نہ آپ کے بعد کوئی نبی قیامت تک ہو سکتا ہے۔ بلکہ حضور کی بعثت کے بعد اگر کوئی بندہ کسی باطل و کاذب مدعیٔ نبوّت سے اس کی نبوّت کی دلیل بھی از روئے شک و شبہ نبوت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام پوچھے گا تو اس پر کفر لازم آ جائے گا۔ اور تمام انبیاء علیہم السّلام بلحاظ بطون و تربیت روحانی تعین روحی جناب ختمی مآب خلفائے سرورِ عالم صلّے اللہ علیہ وسلّم کے ہیں جیسے ظاہر میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نیابتاً آپ کے فرمان سے اس عہدہ پر مختار ہوئے۔ ویسے ہی جمیع انبیاء کرام علیہم السّلام باوجود خلعت نبوت آپ کی باطنی شریعت کے نافذ فرمانے والے تھے۔ آپ کی اطاعت و محبت و تکریم و تعظیم فرض ہے۔ اور اسکی ترک پر عذاب الیم کا وعید منصوص ہے۔ جو ممکنات و مخلوقات احاطہ ربوبیت الٰہیہ میں داخل ہیں۔ سب کی جانب حضور پُر نور شافع یوم النشور صلّی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے ہیں اور کوئی حصّۂ مخلوقات آپ کی دعوتِ رسالت و رحمت سے خارج نہیں، بر بناء اوّلیت خلق و ختم نبوّت و افضلیت مطلقہ و خلافت کبریٰ و اوّلیت فی الشفاعۃ و دخول جنّت و اصالت فی کل فضل و وساطت فی کل نعمت وغیرہا صفات کثیرہ ناممکن الاشتراک کے آپ کی نظیر محال و ممتنع ہے۔ اور بہ نسبت علوم اوّلین و آخرین آپ کا علم اعلیٰ و اکمل ہے۔ جو ماکان و مایکون پر محیط ہو چکا ہے۔ چونکہ آپکا مغیبات پر مطلع ہونا آیات و احادیث سے بحد تواتر ثابت ہے۔ اس لئے اس کا منکر، منکر قطعیات ہے۔ آپ قبل اظہار

نبوت و بعد اعلانِ نبوت جمیع صغائر و کبائر سے معصوم اور تمام قبائح بشری سے مبرّا ہیں۔ اور رب العزت جل وعلا شانہٗ نے حضور سید المحبوبین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کو بے شمار معجزات غیر منحصر سے سرفراز فرمایا ہے۔ جن میں سب سے اعلیٰ و اقویٰ قرآن کریم ہے۔ جس کے مقابلہ سے تمام مخلوقات عاجز ہے۔ جمیع انبیاء و مرسلین و کتب سماوی و صحائف برحق ہیں اور سب کے سب قیام قیامت۔ موجودگی جنت و جہنم، عذاب قبر، حشر و نشر، اقسام طہارت، عبادات مالی و بدنی مانند نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، حلت نکاح، حرمت زنا پر متفق ہیں۔ قیام عدل و انصاف، قیام حدود شرعیہ انسداد ظلم و ستم، سب کی پاکیزہ تعلیم میں داخل ہے۔ تمام انبیاء علیہم السّلام اور ان کی کتابیں و شریعتیں ایک دوسرے کیلئے مصدق ہیں۔

فرشتے خداوند عالم جل مجدہٗ کی نوری مخلوق ہیں۔ جو ہر حال میں اس کے عبادت گزار اور تابع فرمان ہوتے ہیں ان سے نافرمانی نہیں ہوتی اور انکو جو حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل پوری سرگرمی سے کرتے ہیں۔ احکام باری تعالیٰ کی تعمیل اور ترسیل میں خیانت نہیں کرتے۔ ان کی پاکیزگی پر تہمت رکھنا یا ان کی دیانت احکام الٰہی میں شبہ کرنا کفر ہے۔ کیونکہ وہ مامور ہونے کی حیثیت میں کسی طرح کی خطا نہیں کر سکتے۔

توبہ قرآن کریم نے اصلاح یافتہ ہونے کے لئے سب سے پہلی چیز جو بیان فرمائی ہے۔ وہ سچی توبہ ہے۔ جس کا تعلق انسانی زندگی کے تین ہی زمانوں، ماضی، حال اور مستقبل سے متعلق ہے۔ زمانہ ماضی سے اس طریق پر کہ اگر اس سے کوئی ایسی چیز ضائع ہو چکی ہو جو قابلِ تلافی ہے تو فوراً اس کی تلافی کرے۔ زمانہ حال سے اس طرح کہ جو گناہ اس سے پیشتر سرزد ہو چکے ہیں ان کو قطعاً ترک کر دے۔ زمانہ مستقبل سے یوں کہ جن افعال کی وجہ سے محبوب کا حصول ناممکن ہو ان کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر ایسے وسائل اختیار کرے جن سے محبوبِ حقیقی کا وصال میسّر آ جائے۔ پھر توبہ تین چیزوں سے مرکّب ہے۔ اوّل علم، دوئم حال اور سوئم فعل۔ علم سے مراد یہ ہے۔ کہ توبہ کرنے والا معاصی کی مضرت سے بخوبی واقف ہو اور پورے طور پر سمجھے کہ گناہوں کی تاریکی سے دل مردہ اور ضمیر فنا ہو جاتی ہے اور انسانیت کا شرف و امتیاز جاتا رہتا ہے اور گناہ بندے اور خدا کے نزدیک ایک حجابِ اکبر بن جاتا ہے۔ پس جو شخص اپنے عیب و گناہ سے واقف نہیں وہ گناہوں سے مجتنب کیسے رہ سکتا ہے اور ان سے بچنے کا تدارک کیا کر سکتا ہے۔ معلوم ہُوا کہ عیوب و معاصی کا علم ضروری ہے۔ پھر جب اپنی غلط کاریوں کو سامنے رکھ کر گریہ و زاری کرے

اور ندامت پکڑے جو توبہ کا جزوِ ثانی ہے۔ تو یہ حال ہے۔ جب اس حالت میں آدمی کا دل گناہ پر پریشان ہو کر بیقرار رہتا ہے اور اس پر ایک نئی حالت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ جلد از جلد گناہوں کے چھٹکارے کا سرٹیفکیٹ چاہتا ہے۔ اور بخشش کی ڈگری کا متمنی ہو کر آہ و بکا کو لازم پکڑ لیتا ہے تو اس حالت کا نام قصد ہے۔ اور یہی توبہ کا جزوِ اعظم ہے جس کے متعلق ایک ارشاد ہے۔ کہ اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بعبدٍ خیراً بصرہ بعیوبہ یعنی جب خداوند عالم جلشانہٗ کسی بندے سے بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو پہلے اس کو اپنے عیبوں اور کوتاہیوں پر واقف فرما دیتے ہیں۔ کیونکہ گناہوں کی شامت عبادتِ الٰہی سے محرومی۔ راہِ سعادت سے دوری اور خداوندِ عالم سے علیحدگی کا موجب ہوتی ہے۔ پس جو کوئی گناہوں کی قساوت و شامت میں مبتلا اور معصیت پر مصر ہو وہ خدمت کا مدعی نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا گناہوں کی بُرائی کو دور کرنے اور آئندہ ان کا مرتکب نہ ہونے کا جو طریق سمجھایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ گناہوں کی برائی کو یاد کرو۔ خدا تعالےٰ کے عذاب کی سختی کو نہ بھولو۔ اور اپنی کمزوریوں کو سامنے رکھو۔ کیونکہ توبہ کی تعریف یہی ہے:۔ ان التوبۃ عبارۃ عن الندم علی فعل القبیح یعنی توبہ کے معنی فعل قبیح پر اظہار پریشانی و پشیمانی کے ہیں۔ اور امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں۔ توبہ کی تعریف یوں ہے۔ التوبۃ عبارۃ من الندم علی ما مضیٰ والعزم علی الترک فی المستقبل یعنی گذشتہ گناہوں اور نافرمانیوں پر نادم اور پشیمان ہونا اور آئندہ کے لئے گناہوں کے ترک کا پختہ ارادہ کر کے اس پر عامل ہو جانا توبہ کہلاتا ہے۔

بزرگانِ دین نے فرمایا ہے کہ توبہ کا مرتبہ تمام اعمالِ دین پر مقدم ہے۔ اور اسی لئے سرکارِ دوجہان، نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ۔ یعنی توبہ کرنے والا آدمی جب توبہ کرتا ہے تو وہ ماضی (گزرے ہوئے زمانہ) کے افعال پر نادم ہو کر حضور رب العزت میں معافی کی التجا کرتا ہے اور حال کے زمانہ میں اس پر قائم رہنے کا عہد باندھتا ہے اور آئندہ زمانے میں اس پر قائم رہتا ہے۔ تو ایسے صحیح اور سچے اقرار کے بعد وہ ایسا ہوتا ہے جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا گویا اس کے ذمہ گناہ تھے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طالب حق کو ہر مرشدِ کامل معاہدہ اطاعت جسکو بیعت کہتے ہیں کرانے سے پہلے توبہ کراتا ہے۔ کیونکہ مجاہدہ کی ابتداء ہمیشہ توبہ سے ہوتی ہے اور توبہ کا یہ مفہوم عوام کے لئے ہے۔ مگر اہل اللہ نے توبہ کا جو مفہوم رہروانِ طریقت و حقیقت کے لئے ارشاد فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماسوائے اللہ کے مطلوبات و مرغوبات کو ایسا چھوڑ دے، جیسے مرنے کے

وقت انقطاع ہوتا ہے۔اس وقت مولا کریم اپنی قدیم عنایات و توجہات تائب پر منعطف فرما کر اس کے قلب کو ایسا صاف فرما دیتا ہے کہ تائب کے روح، قلب، عقل، سب اسی کے تابع فرمان ہو جاتے ہیں۔ اور راہِ سلوک کی تمام گھاٹیاں ایک سادہ اور آسان ترین راستہ سے بھی زیادہ آسان ہو جاتی ہیں۔ راہ کے مصائب مسرت سے بدل کر رحمت حق کے دروازے کھل جاتے ہیں اور آئینۂ قلب شفاف ہو کر مبداء حسنات بن جاتا ہے۔اور اس وقت تائب کے وجود میں ماسوائے امرالٰہی کے اور کچھ نہیں رہتا۔

فکرِ خود۔ توبہ کے بعد مبتدی کو سب سے پہلے یہ فکر کرنی چاہئے۔کہ میں کون ہوں۔ اور یہ فکر چار طریق پر ہوگی:۔

اوّل:۔ یہ کہ میں جسم ہوں۔ قدو قامت والا ہوں۔ کوتاہ و دراز ہوں۔لاغر و فربہ ہوں۔یعنی جسم کو اپنا اور اس کی صفات کو اپنی صفات ماننا۔جیسے برف اپنی صورت موہوم کو اصلی گمان کرے۔گویا یہ خاکی پتلا سمجھے کہ میں ہوں اور یہ حواس وخواص میرے ہیں یہ نادانی ہے۔اور یہ فکر ناقصین کی ہے جو بہت بُری ہے۔

دوم۔ یہ کہ میں لطیف ہوں اور جسم سے جدا ہوں جیسے برف اپنے آپ کو پانی سمجھے، یہ فکر کاملین کی ہے۔ اور بہت اچھی ہے۔

سوم۔ یہ کہ میں ذاتِ مطلق ہوں، کُل میں موجود ہوں، جیسے برف اپنے آپ کو دریائے بیکراں سمجھے یہ فکر اکملین کی ہے اور بہت خوب ہے۔

چہارم۔ یہ کہ میں نہ وہ ہوں نہ یہ ہوں اور تصوّر سے آزاد و فکر سے پاک ہوں یہ قسم اعلیٰ ترین سبحان اللہ وبحمدہٖ ہے ان افکار کی تشریح کچھ کچھ آئندہ ابواب میں واضح ہو جائے گی۔چونکہ اس فکر سے انسانی دماغ کا کھل جانا سینہ فراخ ہونا اور بابِ مشاہدہ وا ہونا مقصود ہے۔اس لئے راہِ معرفت میں اہلِ طریقت کے نزدیک فکر ایک بڑا قوی رکن ہے جو طالبِ حق کے لئے لابدی اور اشد ضروری ہے۔اہلِ طریقت فکر فی الآفاق کو اصطلاحاً "فکر" اور فکر فی الانفس کو مراقبہ کہتے ہیں۔فکر سے آیات اللہ مشاہدہ ہوتی ہیں۔اور مراقبہ سے انکشافِ حقیقت ہوتا ہے۔

زہد۔ زہد کے معنی دنیا و مافیہا سے کچھ غرض نہ رکھنے اور اس کی رغبت سے اعراض کرنے کے ہیں۔یعنی انسان جملہ ممنوعات سے اپنے آپ کو بچائے رکھے اور جن امورات کی شریعت نے اجازت دی ہے انہیں اختیار کرے اور جن سے روکا ہے ان کو ترک کردے۔اس زہد و ورع کے تین درجے ہیں:۔

۱۔ عام ۲۔ خاص ۳۔ خاص الخاص

۱۔ عام یہ ہے کہ انسان حرام اور مشتبہ اشیاء سے پرہیز کرے۔

۲۔ خاص یہ ہے کہ جملہ نفسانی خواہشات ولذائذ سے بچا رہے۔

۳۔ خاص الخاص یہ ہے کہ ہراس چیز سے جس کا وہ ارادہ کر سکتا ہے رُکا رہے۔ پھر اس کی دو قسمیں اور بھی ہیں ظاہری وباطنی۔ ظاہری یہ ہے کہ امرالٰہی کے بغیر اپنے قدموں کو حرکت نہ دے اور کوئی کام خلافِ حکمِ ربانی نہ کرے۔ باطنی یہ ہے کہ قلب میں ماسوائے اللہ کے کسی کا گذر نہ ہو اور بندہ اسوقت تک زاہد نہیں کہلا سکتا جب تک اس میں مندرجہ ذیل اور دس باتیں پیدا نہ ہوں۔

۱۔ زبان کو قابو میں رکھنا

۲۔ غیبت سے بچنا۔

۳۔ کسی کو حقیر جان کر اس کی ہنسی نہ اڑانا

۴۔ سب نامحرموں پر نظر نہ ڈالنا

۵۔ راست بازی وصداقت اختیار کرنا

۶۔ اپنی دولت خدا کی راہ میں صرف کرنا۔

۷۔ احساناتِ الٰہی و انعاماتِ ربانی کا اعتراف کرنا

۸۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند رہنا

۹۔ کبرو غرور سے اپنا سینہ پاک رکھنا

۱۰۔ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مضبوط اور اجماعِ امت پر قائم رہنا۔

توکّل ۔ یہ صوفیانہ اصطلاح کا ایک معروف اور غیر معمولی لفظ ہے۔ عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لئے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے اور چپ چاپ بیٹھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ خداوند تعالیٰ نے جو کرنا ہے خود بخود کر دے گا یا ہو کر رہیگا اور ہماری تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہمیں مل جائے گا۔ اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ عقیدہ سراسر وہم اور بے علم مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کُن مشغلہ ہے۔ جس کو اسلام کی فطری تعلیم سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

توکّل جمیع انبیاء علیہم السّلام کی سنت ہے۔ اس کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور یہ اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے جس کے سمجھنے کی ضرورت تھی۔ مگر بھیک منگ ملنگوں، رہبانیت کے عاملوں، مکار جوگیوں اور جاہل صوفیوں نے ترک عمل، اسباب وتدابیر سے لاپرواہی اور خود کوئی کام نہ کرنے اور دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکّل رکھ لیا ہے حالانکہ کسی کام کو پورے ارادہ وعزم اور تدبیر وکوشش سے انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ضرور ہی مجھے کامیاب فرمائے گا۔ کا نام توکّل ہے۔

مسئلہ توکّل تعلیم اسلام کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ جسکو طمع کی ضد اور حیا کی علامت کہنا چاہیئے۔ اور اس میں اہلِ اسلام کی کامیابی کا راز ہے۔ چنانچہ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ط یعنی کام میں ان سے مشورہ لو۔ پھر جب پکّا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بیشک اللہ اپنی ذات پر بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آسکے گا۔ اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے۔ جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے۔ اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان والے توکّل (بھروسہ) کریں۔

یہ ہے توکّل کی تعلیم اور اس کا صحیح مفہوم۔ گویا لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آجائے تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لو۔ مشورے کے بعد جب ایک نقطہ پر رائے ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا ارادہ کر لو۔ پھر اس عزم کے بعد پوری مستعدی سے اس کو کرنا شروع کر دو۔ اور خدا پہ توکّل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا خاطر خواہ نتیجہ پیدا فرمائے گا۔ اور اگر ایسا نتیجہ نکلے جو اپنی خواہش وضمیر کے خلاف ہو تو اس کو خدا کی حکمت ومصلحت اور مشیّت سمجھو اور اس سے مایوس ونا امید نہ ہو۔

ان آیات نے توکّل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کردی ہے کہ توکّل بے دست وپائی اور ترک عمل کا نام نہیں۔ بلکہ پورے مشورے اور مستحکم عزم وارادہ کے ساتھ کام کو انجام دینے اور اثر ونتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دینے کا نام ہے۔ اور یہ سمجھنے کا اگر خداوند عالم جل وعلا شانہٗ ہمارا مددگار ہے تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کر سکتا۔ اسلام کے شروع میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے تو مخالفوں کی کثرت

اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دو۔ گویا اغیار کو چھوڑ کر خدا سے لو لگانا اور ظاہری اسباب کو بھول کر اس کی واحد ذات پر بھروسہ کر کے ہر غیر سے بے پرواہ ہو جانا توکل کہلاتا ہے۔ مگر آج توکل کے غلط مفہوم نے عام مسلمانوں کو دنیوی ترقی سے محروم کر دیا ہے اور اس بربادکن نظریئے سے احساسات ہی مردہ ہو گئے ہیں۔ فی زمانہ سب سے زیادہ بزرگ وہ سمجھا جاتا ہے جو سب سے زیادہ ننگ دھڑنگ، بے حس اور نشیلی اشیاء کا مارا ہوا ہو۔ حالانکہ مسلمان کو جہاں ایک مردِ صالح، متخیر، عابدِ شب زندہ دار اور عارفِ حق ہونا ضروری فرمایا گیا تھا وہاں اس کو دنیوی ترقیات کا حامل ہونا بھی لازم قرار دے دیا گیا تھا۔

قناعت۔ اپنی تمام نفسانی خواہشات کو ترک کر دینے کے نتیجے کا نام ہے۔

عزلت۔ خلقت سے کنارہ کشی اور انقطاع بدیں غرض کرنا کہ ان کی دنیوی ناپاکی سے ملوّث نہ ہو اور تنہا بیٹھ کر ذکرِ الٰہی سے لو لگانا عزلت یا گوشہ نشینی کہلاتا ہے۔ مگر اسبابِ زندگی کا انقطاع یہاں بھی نہ ہوگا۔

توجہ۔ اللہ کے سوا کسی سے خوف وامید نہ رکھے اور ہر کام میں اسی کی جانب یکسو رہے۔

صبر۔ جس کی حقیقت پر عوام کی اس غلط فہمی نے تہ بہ تہ پردے ڈال رکھے ہیں اور عرفِ عام یا خیالِ خام میں ایک ایسی بے بسی و بے چارگی کا نام ہے جو لا علاج ہو۔ صبر عوام کے نزدیک بے بسی و بے کسی کی ایک بھیانک تصویر ہے اور اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنے کو صبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ صبر کی یہ تعریف سراسر غلط ہے۔

صبر کے لغوی معنی روکنے اور سہارنے کے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا۔ اور یہی صبر کا اصلی مفہوم بھی ہے۔ یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کا نام نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت، ثباتِ قدم، ہمت کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات و مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے پانچ مفہوم و مقام لیکر لفظ صبر کو انہی معنوں میں بیان فرمایا ہے۔ پہلا مفہوم سورۂ ہود میں ہے۔ فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ط یعنی صبر کرو۔ بیشک آخر کار کامیابی پرہیزگاروں ہی کی ہے۔

اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی و بے چارگی پاؤں کو ڈگمگا رہی ہو اور دوسری جانب باطل کی عارضی شورشیں اور ہنگامی غلبے دلوں کو کمزور کر رہے ہوں تو اس وقت حق پر قائم رہ کر اپنی کامیابی کی پوری توقع رکھنا صبر کہلائے گا۔

صبر کا دوسرا مفہوم سورۃ حج میں آتا ہے۔ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ۔ یعنی مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بےقراری نہ ہو۔ بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ کریم اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرمائیں گے۔

تیسرا مفہوم صبر یوں ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ یعنی اے چادر پوش! اٹھ اور لوگوں کو ڈرا اور اپنے پروردگار کے لئے صبر (یا مردی) کر۔ گویا منزلِ مقصود کی راہ میں جو خطرات پیش آئیں اور مخالفین طعن کریں ان کو خاطر میں نہ لایا جائے اور پست ہمتی کی بجائے مستقل مزاجی ہونی چاہئے۔ ایسی حالت میں مضبوطی کے ساتھ مقابلے کا نام صبر ہو گا۔

چوتھے مفہوم کی صورت سورہ نحل میں یوں ارشاد ہوئی ہے۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ط یعنی اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو دی گئی ہے اور البتہ اگر تم صبر کرو۔ تو صبر کرنیوالوں کے لئے یہ بہتر ہے گویا برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز کیا جائے اور بدخواہوں کی تکلیفوں کو برداشت کر کے معافی دی جائے اور تحمل میں پامردگی دکھائی جائے۔ یہ مصابرت ہے۔

پانچواں مفہوم صبر سورۃ بقر میں یوں بیان ہوا ہے۔ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ط یعنی صبر کرنے والے، ثابت قدمی دکھانے والے مصیبت میں اور پریشانی میں اور لڑائی کے وقت وہی سچ بولے اور وہی پرہیزگار ہیں۔ گویا جنگ و جدال اور لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور نفع و ضرر سے بے نیازی صبر ہے۔

ان تمام مطالب و معانی سے یہ معلوم ہوا کہ صبر کی حقیقت اعلیٰ یہی ہے کہ نفس کے ساتھ اطاعت و عبادت الٰہی میں مجاہدہ کرے۔ مصیبت و بلا میں استقلال سے رہے۔ آداب شریعت کو ہاتھ سے نہ دے۔ بلکہ نہایت خاطر جمعی اور خندہ پیشانی سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قائم رہے۔ اس کے علاوہ بزرگانِ دین نے

فرمایا ہے۔ کہ صبر کی تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ صبر باللہ ۲۔ صبر مع اللہ ۳۔ صبر علی اللہ

صبر باللہ۔ اس کے اوامر کو بجا لانے اور اس کے نواہی سے بچنے کو کہتے ہیں۔

صبر مع اللہ۔ قضائے الٰہی پر راضی اور ثابت قدم رہنے اور ذرہ بھی چون وچرا نہ کرنے کا نام ہے۔ فقر سے نہ گھبرائے اور خندیدگی سے اظہارِ غنا کرتا رہے۔

صبر علی اللہ یہ ہے کہ ہر امر میں ثابت قدم رہے اور بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی ڈگمگانے نہ پائے۔ کیونکہ اہل اللہ نے فرمایا ہے کہ دنیا سے آخرت کی جانب رجوع کرنا سہل ہے۔ مگر مجاز سے حقیقت کی طرف آنا مشکل اور خلقت کو چھوڑ کر حق سے محبت کرنا اور زیادہ مشکل ہے۔

رضا۔ یعنی اپنی مرضی کو چھوڑ کر اللہ کی رضا پر راضی رہے اور اس کے حکم کے آگے سرنگوں ہو۔ یعنی جس طرح اس کا خالق و مالک راضی ہو اسی طرح یہ بھی راضی رہے اور گلہ شکوہ نہ کرے۔

ذکر۔ یہ ایک بڑی نعمت ہے اور بڑی عظمت و شرف کی چیز ہے۔ جو انسان اس کی ترک پر جرأت کرتا ہے۔ خداوندِ عالم نے قرآنِ پاک میں اس کے لئے یہ وعید فرمائی ہے۔ فَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی۔ یعنی جس شخص نے ہمارے ذکر سے منہ موڑا اس کی معیشت تنگ کر دی جائے گی اور قیامت کے دن وہ اندھوں سے اٹھایا جائیگا۔ گویا یہ اس بلندیٔ ایمان کی منزل ہے کہ جس پر مولا کریم کی نظر کرم ہو اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ ذکر قلب اور اس کے بعد دیگر مقاماتِ جسمانی سے بھی کیا جاتا ہے۔ اور اس کی بسم اللہ یوں ہوتی ہے کہ قلب میں جب نسبت منتقل ہوتی ہے تو ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی۔ مگر یہ حرکت بھی اس حرکت کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو نسبت منتقل ہونے کے بعد پیر کامل کی توجہ اور نگاہ سے پیدا ہوتی ہے۔

پھر یہاں حرکت سے مراد وہ حرکت نہیں جو دورانِ خون سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ جس کو دل کا دھڑکنا یا حرکت کرنا کہتے ہیں۔ یہ اور شے ہے وہ اور۔ یہ نور کی ایک شعاع ہوتی ہے جو قلب کو صاف کر کے اس کے اندر رکھ دی جاتی ہے۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ فی زمانہ ایسے لوگوں کے قلوب میں بھی کوئی ایسی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ الا ماشاء اللہ جس

کو اوپر حرکت کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ جنہوں نے بیس سال تک صائم الدہر رہ کر اور قائم اللیل ہو کر ایک عمر عبادت میں گزار دی ہے۔ یہ محض ایک فضل ایزدی ہے۔ جسے چاہتا ہے ملتا ہے۔ سلسلہ عالیہ سہروردیہ میں لازمی امر ہے کہ ہر طالب و مرید کے قلب کو ذاکر کر کے اس کے اندر حرکت پیدا کر دی جائے۔ گویا یہ اس سلسلہ عالیہ سہروردیہ کی اساس و بسم اللہ ہے جو بہت بڑا عطیۂ خداوندی اور رحمت نبوی ہے۔ بزرگانِ دین نے لکھا ہے کہ جس کا قلب آخر وقت تک جاری رہ جائے اس کو تین اہم مفاد حاصل ہوتے ہیں:۔

۱۔ موت کے بعد اس کی نعش کو مٹی نہیں کھاتی اور قیامت تک جوں کی توں رہتی ہے۔

۲۔ اس وقت تک اس کا دم نہیں نکلتا جب تک اس کا شیخ اس کے پاس آ کر اور سامنے ہو کر اس کا وہ مقام اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں کر دیتا جہاں جنت میں وہ انتقال کے بعد قیام کرنے والا ہے۔

۳۔ اس کو ولایت صغریٰ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو یہ کچھ کم سعادت نہیں کہ انسان سوتے جاگتے، اُٹھتے، بیٹھتے ہر حالت میں اللہ کی یاد کا ثواب حاصل کرے اور اس کا قلب ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے۔

فی زمانہ لوگ اس ذکرِ جلیل سے بے پرواہ ہیں اور اس کی حقیقت و اہمیت کو بالکل نہیں سمجھتے اور اوراد و اعمال کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ کوئی لاکھ بار اغراضِ دنیا کے لئے آیت کریمہ پڑھ رہا ہے اور کوئی سورۃ اخلاص کسی نے سورۃ مزمل شروع کر رکھی ہے تو کوئی بسم اللہ شریف کا چلہ کاٹ رہا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ سب کچھ ثواب اور فائدے سے خالی ہے۔ ہرگز نہیں۔ ان کا ثواب ہوتا ہے اور ان سے فائدہ ضرور پہنچتا ہے۔ مگر کجا ذکرِ زبانی اور کجا ذکرِ قلبی۔ یہ بعد المشرقین ہے۔ شاہ عبدالرؤف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ذکرِ لسانی بمنزلہ الف و باء ہے۔ ذکرِ قلبی کے مقابلے میں اس کی حقیقت ایسی ہے کہ کوئی شخص بادام کے چھلکے پر قناعت کر لے اور مغز کو چھوڑ دے ایک عام آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ تمام اذکار و اشغال اللہ کریم جل مجدہٗ کا ذکر و اسم شریف زبان پر لانے سے مراد یہ ہے تاکہ بندہ اپنے مولا کی یاد سے غافل نہ رہے۔ مگر ذاکر کے زبانی ذکر و وظائف کی یہ حالت ہے کہ زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے پڑھنے کے بعد جب آنکھیں بند کرتا ہے تو فوراً غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن ذکرِ قلبی کو یہ فوقیت اور برتری حاصل ہے کہ انسانی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر ثانیہ عبادت میں گزرتا ہے اور وہ کسی شغل میں ہو مصروفِ عبادت

ہے اور یادِ الٰہی کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جارہا ہے۔ اسی کو اہل اللہ "دست بکار دل بیار" کے پاکیزہ الفاظ سے ذکر فرماتے ہیں۔ لوگ جتنی محنت عام وظائف میں کرتے ہیں۔ اگر اتنی ہی ذکرِ قلبی میں کریں تو ان کی حالتیں کیا سے کیا ہو جائیں اور وہ اندیشۂ معاصی و معائب سے بچکر ایسے غور و فکر والے ہو جائیں کہ مبادا کوئی لغزش ہو اور یہ دولت تقدس چھن جائے۔ کیونکہ گناہ میں ملوّث ہونے سے انسان اس شرف وجد سے محروم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ بخاری شریف میں ہے۔ مَثَلُ الَّذِیْ یَذْکُرُ رَبَّہٗ وَالَّذِیْ لَا یَذْکُرُ مَثَلُ الْحَیِّ وَالْمَیِّتِ ؕ یعنی ذاکر حق اور غافل ذکرِ الٰہی کی مثال فی الحقیقت زندہ اور مردہ کی سی ہے۔ اگر وہ توجہ کرتے رہیں اور غفلت سے کام نہ لیں تو ان کے مقامات بھی بلند ہوتے چلے جائیں اور تجلّیات ربانی اور انوارِ الٰہیہ کا نزول شروع ہو جائے۔ اور ان کو اس ذکر و عبادت میں وہ لذّت و سرشاری حاصل ہو کہ اس کے سامنے تمام نفسانی لذتیں ہیچ ثابت ہوں۔

اس کے بعد ذکرِ روح کا درجہ ہے۔ گویا ذکر کے تین مدارج ہیں۔ ذکرِ لسانی۔ ذکرِ قلبی اور ذکرِ روحی۔

ذکرِ لسانی وہ ذکر ہے جو عام مسلمان زبان سے کرتے ہیں اور ورد و وظائف میں مصروف رہتے ہیں۔

ذکرِ قلبی وہ ہے جس کا اوپر اشارہ کیا گیا ہے جو خواص کا حصّہ ہے۔

اور ذکرِ روحی جو خاص الخاص کا حصّہ ہے۔ جن کو عارفین کاملین کہا جاتا ہے اور یہ سعادت اُنہی کو نصیب ہوتی ہے اور وہ حضرات ایک سیکنڈ کے لئے بھی اللہ کی یاد سے الگ نہیں ہوتے۔ پھر ذکرِ لسانی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ذکرِ جہر اور ذکرِ خفی۔ ذکرِ جہر کی حسب قاعدہ وعمل بزرگانِ دین چار قسمیں ہیں۔ یک ضربی، دو ضربی، سہ ضربی و چہار ضربی۔

ایک ضربی کا طریقہ یہ ہے کہ ذاکر مؤدب دو زانو بیٹھ جائے اور سانس کو ناف کے نیچے سے بلند کرے اور لفظ اللہ کو شد و مد اور جہر کے ساتھ ناف سے اٹھا کر قلب پر چلائے۔ پھر اتنی ہی دیر ٹھہر جائے کہ سانس بھی ٹھہر جائے اور اسی طرح بار بار ذکر کرے۔

دو ضربی کا طریقہ یہ ہے کہ ذاکر دو زانو بیٹھ کر سانس کو بدستور سابق ناف کے نیچے روکے اور بسم اللہ کو بلند آواز اور سختی و قوت کے ساتھ اٹھا کر ایک ضرب زانوئے راست پر اور دوسری ضرب قلب پر لگائے۔

سہ ضربی کا قاعدہ یہ ہے کہ ذاکر چار زانو بیٹھے اور ایک بار دائیں زانو پر اور ایک بار بائیں زانو پر اور تیسری بار قلب پر ضرب لگائے۔ یہ تیسری ضرب سخت اور بلند تر ہونی چاہیئے۔

چہار ضربی کا طریقہ یہ ہے کہ ذاکر چار زانو بیٹھے - پھر تین تین ضربیں سہ ضربی کی طرح لگائے اور چوتھی ضرب بڑی شدومد سے اپنے روبرو زمین پر مارے - یہ ذکر اسم ذات کا ذکر کہلاتا ہے - اسی طرح کلمۂ طیبہ و بسم اللہ شریف کا ذکر جہر بھی بعض حضرات قادریہ نے ارقام فرمایا ہے -

ذکرِ خفی - اذکارِ جہر کے بعد اذکارِ خفی کی تلقین کی جاتی ہے - مگر اس شرط پر کہ ذکرِ جلی کا اثر ذاکر پر ظاہر ہو چکا ہو - اثر کا یہ مطلب ہے کہ قلب میں تحریک ذوق و شوق ہو اور خدائے واحد کے نام سے دل میں اطمینان اور تسکین حاصل ہو کر وساوس و خطرات دور ہو جائیں اور حق تعالیٰ کو جمیع ماسوا پر مقدم رکھے - تجربہ کار درویشوں اور مجاہد صوفیائے کرام نے لکھا ہے - کہ اگر تین چار مہینے تک روزانہ چار ہزار مرتبہ ایسے ہی ذکر کیا جائے تو مذکورہ اثر ضرور پیدا ہو جاتا ہے -

اذکارِ خفیہ میں سے سب سے پہلے اسم ذات کا ذکر ہے - جس کا طریق یہ ہے کہ پہلے دونوں آنکھوں کو اور دونوں لبوں کو بند کر کے دل کی زبان سے "اللہ سمیع" کہہ کر ناف سے سینے تک چڑھائے - پھر تصور میں "اللہ بصیر" کہہ کر سینے سے دماغ تک پہنچے اور پھر وہاں سے "اللہ علیم" کہہ کر عرش تک پہنچے - پھر یہی الفاظ خیال کرتا ہوا درجہ بدرجہ اترے اور اسی طرح بار بار کرے -

ذکرِ نفی اثبات - جب ذاکر اسمِ ذات کی مشق میں کمال کر لیتا ہے تو پھر اس کے بعد بعض مشائخین حضرات نے ذکرِ نفی اثبات کی تلقین فرمائی ہے - جس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ذاکر قبلہ رُخ اس طرح بیٹھے جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں - پھر آنکھیں بند کر کے اور سانس روک کر لفظ "لا" کو ناف سے اٹھا کر داہنے کندھے پر سے لیجا کر پسِ پشت ڈال دے - اور وہاں سے لفظ اللہ کو دماغ تک پہنچا کر خود دائیں طرف مخاطب ہو جائے اور خیال کرے کہ میں نے تمام عالم کو پسِ پشت ڈال دیا ہے - اور سب کچھ فانی ہو گیا ہے - یہاں تک کہ فوق و مین بھی طے ہو گیا ہے - پھر "الا اللہ" کو داہنی طرف سے بائیں طرف قلب پر لے جا کر بشدّ و مد ضرب کرے کہ یسار (بایاں) بھی طے ہو جائے - اور خیال کرے کہ سوائے اللہ کے تمام جہان فنا ہو گیا ہے - اور صرف اللہ کی محبت قلب میں ہے اور کچھ نہیں - اسی طرح جس قدر زیادہ کرتا جائے گا انوارِ معرفت کے قریب ہو گا - اس سے یہ سمجھ آگئی ہو گی کہ ذکرِ نفی اثبات سے مراد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ذکر کرنا ہے - اب یہاں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے مختصر طور پر معنی بھی سمجھ لیجئے - تاکہ ذکر میں کچھ اور لطف پیدا ہو جائے - مصنف کتاب آئینۂ خود شناسی فرماتے ہیں کہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں لَآ اِلٰهَ

ماسوا کی نفی اِلّا اللہُ ذات کا اثبات یعنی غیر اللہ سے دل کو خالی اور یادِ حق سے معمور کرنا اور عالم کو مثل لا کے دیکھنا اور سمجھنا کہ صورت میں موجود اور معنی میں نہیں۔ جیسے لا کی شکل کا ظہور بے الف کے محال ہے۔ اسی طرح عالم (جہاں) کی نمود بے ہستی ذات کے ناممکن ہے۔ کیونکہ جو کچھ نظر آرہا ہے اور عقل و خیال میں سمارہا ہے واقعی ذاتِ یکتا کے صفات و افعال سے ہے۔ ورنہ وہ بذاتِ خود ہیچ و لاشے ہے۔ گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ اِلّا اللہ سے موجودِ حقیقی یعنی ذاتِ یکتا جو عالمِ الوہیت ہے مراد ہے اور لَا اِلٰہَ سے اس کی ایجاد کی ہوئی اشیاء جو عالم عبودیت ہے مراد ہیں اور یہ نیست ہست نما ہے اور دراصل فانی و معدوم ہے۔ کیونکہ ذاتِ یکتا ہی نے ہر تعین میں متعین ہوکر یہ مختلف نام پائے ہیں۔ مگر اس اختلاف و کثرت سے ذات کی یکتائی میں کچھ فرق نہیں آتا۔ پس جب ذاتِ یکتا قیود و تعینات سے پاک و مجرد ہوتی ہے تو اس کو حق کہتے ہیں۔ اور جب قیود و تعینات کے لباس میں معلوم ہوتی ہے تو اس کو عالم یا خلق بولتے ہیں۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ عالم کیا ہے؟ ظاہر حق۔ اور حق کیا ہے؟ باطن عالم اور عالم قبل ظہور کیا تھا؟ عین حق اور حق بعد ظہور کیا ہے؟ عین عالم۔ غرضیکہ وہی ایک ذات ہے جس کے یہ نام ہوئے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہی ظاہر، وہی باطن، وہی اول، وہی آخر۔ باقی سب نسبتیں اور اعتبارات ہیں (جن کے سمجھنے اور مغالطے میں اکثر حضرات ہمہ اوست اور ہمہ از وست کی بھول بھلیوں میں الجھ جاتے ہیں) حقیقت یہی ہے جو اوپر ذکر ہوچکی ہے۔ لیکن جو کوئی فرق مراتب نہ کرے وہ درویشی سے شناسا نہیں۔ پس معنے لَا اِلٰہَ اِلّا اللہُ کے یہ ہوئے کہ سوائے ذاتِ حق کے کچھ نہیں اور ماسوا یعنی ایجاد شدہ اشیاء سب فانی و ہالک ہیں۔ اس کی نفیس ترین مثال یوں سمجھئے کہ آپ ایک ایسے کمرے کے وسط میں کرسی پر بیٹھے ہیں جس کی چاروں دیواروں میں آئینے لگے ہوئے ہیں۔ پس آپ دیکھیں گے کہ آپ کی ذات کا عکس ہر ایک آئینے میں موجود ہے۔ لیکن ذات کسی میں بھی نہیں۔ ذات ذات ہے اور ایجاد، ایجاد۔ ذات کے ایجاد میں منعکس ہونے سے ایجاد کا ذات بن جانا لازم نہیں آتا۔ شعر

گر ترا چشم است یکتا در نگر — بعد لا آخر چہ می ماند دگر

تا نہ خوانی لا و اِلّا اللہ را — در نیابی منہج ایں راہ را

پس جس نے فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ پر خیال جمایا اور باوجود کثرت کے اشیاء کو ذاتِ واحد سے جانا

اور سمجھا اس نے منزلِ قرب میں قدم رکھا اور جس نے کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ کا یقین کیا اور چشمِ بصیرت و دیدۂ حال سے ذاتِ واحد کے سوا کچھ نہ دیکھا اس نے زمرۂ صدیقین میں دم مارا۔ حضرت علاؤالدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے خوش وقت میں کتاب فتوحات کا حاشیہ لکھ رہا تھا اور جب میں اس تسبیح تک پہنچا کہ انہوں نے کہا ہے سُبْحَانَ مَنْ اَظْهَرَ الْاَشْیَاءَ وَهُوَ عَیْنُهَا یعنی پاک ہے وہ ذات کہ جس نے اشیاء کو پیدا فرمایا اور وہ ان کا عین ہے تو اس پر میں نے یہ حاشیہ لکھا۔ کہ اللہ تعالیٰ حیا سے شرماتا نہیں۔ اے شیخ اگر تو کسی سے سُنے کہ وہ یوں کہتا ہے۔ کہ شیخ کا فضلہ عین وجودِ شیخ ہے تو البتہ اس سے درگزر نہ کرنا اور اس پر ناراض ہونا۔ کیونکہ عقلمند کو ایسا ہذیان خداوند جل وعلا کی طرف منسوب کرنا جائز و لائق نہیں اور یہی وہ مغالطہ ہے جو ہمہ اوستیوں کو لگتا ہے۔ اس مسئلہ میں صوفیوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک وحدت الشہود کا قائل ہے اور دوسرا وحدت الوجود کا معتقد۔ وحدت الشہود والوں کے نزدیک یہ مسئلہ اس طرح ہے جیسے آدمی کا سایہ۔ اگرچہ وہ بظاہر ایک دیگر اور جدا شے نظر آتا ہے۔ مگر درحقیقت اس کا کوئی وجود نہیں جو کچھ ہے آدمی ہی ہے۔ پس یہی حقیقت اس مسئلہ کی ہے۔ کہ اصل میں ذاتِ باری ہی موجود ہے۔ باقی ممکنات اسی کی صفات کا ظہور ہیں۔ گو صفات ذات سے جدا اور غیر نہیں۔ لیکن عین ذات بھی نہیں۔ روشنی اور دھوپ آفتاب کی صفت تو حقیقتاً ہو سکتی ہے۔ مگر آفتاب نہیں ہو سکتی وغیرہ وغیرہ۔ اور وحدت الوجود والوں کا مذہب یہ ہے کہ سوا خدا کے کچھ بھی نہیں اور یہ جو کچھ نظر آتا ہے حقیقت میں سب خدا ہی کا وجود ہے۔ گویا ان کے نزدیک صفات عین ذات ہے اور یہ جو کثرت صفات نظر آتی ہے یہ کثرت نہیں بلکہ وحدت ہے جو شانِ کثرت دکھلا رہی ہے۔ یہ تمام جہان اسی ہستی مطلق کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں۔ پس اس بنا پر صرف ایک ہی ذات واحد موجود ہے۔ اس کے سوا دوسری کوئی شے نہیں' وغیرہ وغیرہ۔ جس پر انہوں نے بہت سے دلائل بھی لکھے ہیں اور بہت سی تاویلات سے کام لے کر مخلوق کو خالقیت' مملوک کو مالکیت اور عبد کو معبودیت کا درجہ بخشنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً آدم اس اعتبار سے کہ عالم کو راہِ خدا کی تربیت کرتا ہے اور مرتبہ خلافت رکھتا ہے۔ مظہر جامع جمیع اسماء و صفات الٰہی اور ذات ہویت کا آئینہ ہے' خود ہی رب ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ مخلوق میں داخل اور صفت عبدیت رکھتا ہے۔ بندہ ہے' پھر لکھا کہ انسان اگر اپنے آپ کو پہچانے تو یہ وہی ہے جس کی تلاش میں ہے۔ خود درد ہے اور خود ہی دوا۔ خود ہی بیمار ہے اور خود ہی طبیب۔ شعر

تو آں جمعی کہ عین وحدت آمد تو آں واحد کہ عین کثرت آمد

جہاں تک دلائل عقلیہ کا تعلق ہے۔ کسی مضمون کو نباہنے کے لئے تمثیلات واستدلات کا علمی ذخیرہ بہت مل سکتا ہے مگر غور طلب بات صرف یہ ہے کہ جس دعوے پر وہ دلائل پیش کئے جا رہے ہیں اس میں مدلول لہٗ کا حقیقتاً کس قدر حصہ ہے۔ اور کیا اس دعویٰ کا مدعی واقعی مستحق ہے یا اس کو کسی عطائی کمال اور وہبی جمال کی وجہ سے یہ بولی بولنے کا مغالطہ ہو رہا ہے۔ کہ میں وہی ہوں جسکو ڈھونڈ رہا ہوں۔ اگر غور کیا جائے تو مدعی کے یہی الفاظ اس کو معنوی لحاظ سے حلول کی سرحد پرے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ نہ یہ عقیدہ ہوتا نہ اپنی خدائی کے اڑنگے میں ٹانگ اڑاتے۔ جو چیز بعید از فہم اور تاویلات رقیقہ کی اس حد تک محتاج ہو کہ بغیر مرے اور جبر کئے کے سمجھ میں نہ آسکے اس کو آپے سے باہر ہو کر اپنانا ایک لاحاصل سعی ہے۔ حلول واتحاد ہمیشہ دو چیزوں میں ہوتا ہے اور شریعت میں دو معبود جاننا اور طریقت میں دو موجود سمجھنا شرک ہے۔

الغرض منصور کی کہانی یا اس جیسے حضرات کا مدعی انا الحق ہونا اس سے تاثرات قبول کرنے والوں کے نزدیک خود ہی اس کے دعوے کی تردید اور ایک بے بنیاد مقولہ نظر آتا ہے۔ اگر ہمہ اوستیوں کے نزدیک بندہ ہی خدا ہے تو منصور اس آواز کے نکالنے سے قبل کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ اپنی حیثیت سے بڑھکر بولنا اور دوسری ذات کا دعویٰ کرنا فانی اور غیر فانی دو ہستیوں کے امتیاز کو خود ہی ثابت کر جاتا ہے۔

ہماری اس بحث سے یہ غرض ہرگز نہیں کہ ہم اس تحریر سے کسی خاص مسلک کی تبلیغ یا تردید کریں۔ ہاں ہم ذات باری تعالیٰ کے متعلق جس کے سمجھنے پر تمام مذاہب کے اختلافات کا انحصار ہے مسئلۂ وحدت وجود پر صوفیانہ نقطۂ نظر سے ذرا وضاحت کرتے ہیں اور ہمارے مخاطبین طبقۂ انام کے صرف وہ متعدد تعلیم یافتہ حضرات ہوں گے جن کو ایزد متعال نے فلسفیانہ دماغ اور صوفیانہ قلب ودلیعت فرما رکھا ہے۔

فلسفۂ شریعتِ اسلام مسئلۂ وحدت وجود کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کریم میں اس کے متعلق جو اشارات پائے جاتے ہیں ان کی بنا پر اہلِ شریعت وفقہ اور اہلِ طریقت وتصوف میں عجیب پُرلطف اختلافات نظر آتے ہیں۔ سالکانِ طریقت کا ایک بڑا گروہ بالاتفاق مسئلہ وحدت وجود پر راسخ العقیدہ ہے مگر شارحانِ اسلام اس گروہ کی ہمنوائی کرنے سے پرہیز کرتے ہیں گویا اسلامی شریعت وطریقت کا خاص خدائے واحد کی ہستی کے متعلق جو مذہبی عقائد کا پہلا زینہ ہے اتنا زبردست تبائن وتضاد عوام کے لئے باعثِ تشویش رہا ہے جسکی حد نہیں۔ مگر اس اختلاف کا راز ذرا گہرے مطالعہ کے بعد منکشف

ہو جاتا ہے یعنی خدا کی ہستی کا خیال انسان کے دماغ میں صدہا مختلف طریقوں سے آتا ہے۔ کبھی ہر وہ چیز جو اس کے دل میں حیرت واستعجاب کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ اس کے نزدیک خدا کہلاتی ہے۔ جیسے زمانہ قدیم کا تصور قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ فَلَمَّا رَاَی الشَّمْسَ بَازِغَۃً قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ ھٰذَا اَکْبَرُ یعنی انسان نے سورج کو جو اپنی عالمگیر ضیاء ومنفعت کے لحاظ سے ایک نہایت تعجب خیز چیز تھی اپنا خدا تسلیم کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد ہر بڑے سے بڑا پہاڑ اور ہر بلند سے بلند درخت، ہر بڑا دریا اور سمندر، بادل اور بجلی مختلف حیوانات وانسان اور دیگر ڈسنے والے جانور بے شمار صورتوں میں خدا کی ہستی کا وجود بن کر انسان کے دماغ پر مسلط رہے۔ پھر جب دنیا مادی تخیلات سے آگے بڑھی تو ایک نہایت لطیف وغیر محسوس بلکہ مافوق الادراک حیثیت سے خدا کا وجود تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد ہزار ہا انسانوں نے ازل وابد کا راز سمجھنے اور حقیقت الحقائق تک پہنچنے میں بے شمار ذہنی خاکے بنائے۔ مگر ؏

راز ایں پردہ نہاں بود ونہاں خواھد ماند

فلسفۂ تصوف کے مطابق دنیا میں صرف ایک ہستی کا وجود ہے اور سوائے اس ہستی کے کسی دوسری چیز کا وجود ناممکن ہے۔ صرف ایک وہی واجب الوجود ہستی جو خدا جلشانہٗ کے اسم سے موسوم کی جاتی ہے۔ تمام موجودات عالم میں اپنا جلوہ مختلف مظاہر وصورتیں اور اپنا اثر بے شمار محسوسات ومدرکات میں ظاہر فرماتی ہے۔ تمام عالم میں صرف اسی کا وجود ہے اور اس کی کوئی خاص جگہ معین نہیں اور نہ کسی وقت اور زمانہ سے اس کو وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ واجب الوجود ذات خود انسان کی حالت میں اپنی مختلف حالتوں کا مشاہدہ فرماتی ہے اور خود ہی اپنی نسبت بے تعداد خیالات کی صورت میں متبدل ومتغیر ہوتی ہے۔ غرضیکہ اسی قسم کے عقائد جن کا اصل اصول صرف ایک ہی ہستی کا وجود تسلیم کرنا ہے فلسفۂ تصوف کی روح رواں ہیں۔

حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بڑی مزیدار حقیقت بیان فرمائی ہے کہ ہمہ اوستیوں کی عبادات کا حاصل نفی وحدت اور اثبات کثرت ہے۔ جو مذہب محققان صوفیاء کے منافی ہے۔ کیونکہ وحدت الوجود کا ماحصل یہ ہے کہ وجود مطلق یعنی حق تعالیٰ جل شانہٗ وجود ممکنات یعنی مخلوقات میں منحصر ہے اور مطلق کا مراتب تخیلات میں کوئی وجود نہیں اور اس کا بطلان اظہر من الشمس ہے۔ کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے وجود اور تمام کمالات میں ممکن یعنی مخلوق کا محتاج ہو۔ بلکہ اس کے ضمن میں نفی واجب تعالیٰ بھی نکلتی ہے اور یہ کفر صریح ہے۔ پس تحقیق وجود واجب تعالیٰ

کو مخلوقات کے وجود سے جدا سمجھنا اور شمار کرنا چاہئے۔

فلسفیانِ عالم تمام عمر اسی جستجو میں سرگرداں رہے کہ خدا کی ذات کے متعلق کوئی تسلی بخش تحقیق کر سکیں ۔ مگر وہ سوائے پریشان خیالی اور دماغ سوزی کے کسی نتیجہ اور قطعی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے ۔ لیکن فلسفۂ تصوف میں اس تحقیق کے لئے دوسری راہ اختیار کر لی جاتی ہے کہ اپنی ذات کے متعلق تحقیق کرنا دراصل خدا کی تحقیق کرنا ہے جسکو مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کے الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ جو اس تعبیر کی صحت میں کوئی شبہ باقی نہیں رکھتا درحقیقت اپنے نفس کی شناخت خدائے واحد کی شناخت ہے اور اپنی حالت کی پہچان ہی عرفانِ الٰہی ہے۔ گویا نفس انسانی ذات باری تعالیٰ کا ایک پرتو ہونے کی وجہ سے اس کی حقیقت کے انکشاف کا ذریعہ ہے۔

چونکہ بعض متقدمین حضرات نے اس مسئلہ میں بڑا زور دیا ہے اور اسی کو راز داری کا سرچشمہ قرار دیا ہے ۔ اس لئے فقیر اس کی لمبی چوڑی بحث سے تو احتراز کرتا ہے۔ مگر اس عقیدے کے متاخرین حضرات سے مندرجہ ذیل امورات میں فتویٰ چاہتا ہے۔ تاکہ مسئلہ معلومہ کی حقیقت اور واضح ہو جائے ۔ اگر کوئی صاحب جو کسی ولی اللہ سے نسبت ارادت وبیعت رکھتے ہوں ان امورات میں فتویٰ عطا فرمانے کی تکلیف فرمائیں گے تو فقیر ممنون ہو گا۔ یہ التجا محض بطور افہام تفہیم ہے معترضانہ نہیں ہے۔

۱۔ کیا خداوندِ عالم جل وعلا شانہٗ اور خدائی (مخلوق) ایک ہی شے ہے یا جدا جدا ۔ اور اگر ایک نہیں تو خدائی کو خدا ہونے کا دعویٰ کہاں تک جائز ہو سکتا ہے ۔ اور اگر ایک ہیں تو کیونکر ؟

۲۔ کیا باقی اور فانی مداومت میں برابر ہو سکتے ہیں۔ اگر ہو سکتے ہیں تو کس طرح ؟

۳ ۔ نمرود و فرعون کے دعوئے خدائی میں اور ایک تصوف کے پردے میں مدعی ہونے والے کے دعوئے خدائی میں کیا فرق ہے ؟ اور کیا فریق ثانی فریق اول کی طرح از روئے تعلیم قرآن وحدیث مجرم نہیں ؟

۴۔ اگر بقول ہمہ اوستیوں کے انسان ہی خدا ہے تو اس کو تلاش کس کی ہے۔ عبادت کس کی کرتا ہے ۔ اور مجاہدوں کے چکر میں کیوں پڑتا ہے اور جب مرتا ہے تو غسال کے ہاتھ میں لکڑی کے تختے پر کیا ہوتا ہے پھر کیا اس کے معبود کے لئے بھی یہ مقام ممکن ہے ؟

یاد رکھنا چاہئے کہ ذاتِ حق کے تین مراتب ہیں۔ ۱۔ احدیت ۲۔ وحدت ۳۔ وحدیت

احدیت - یہ ذات رب العزت کے بے مثل و بے چون ہونے کا وہ مرتبہ ہے۔ جس کی نسبت کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً کا ارشاد موجود ہے۔ یعنی اللہ وحدہٗ لاشریک کی ذات موجودات کے ظہور سے پہلے ایک گنج مخفی اور چھپا ہوا خزانہ تھی۔ جس کو مطلق بے چون اور بے نام و نشان بھی بیان کیا جاتا ہے۔ اور اصطلاحِ صوفیہ میں احدیت، ہویت، غیب، ذات بحت، احدیت ذاتیہ، احدیت مطلقہ، چشمۂ کافور لاتعین، ذات بے اسماء و صفات وغیرہ بھی اسی مرتبہ کے نام ہیں۔ اور ھُو بھی اسی کو کہتے ہیں۔ جس کی تشریح صاحب تفسیر مرتضوی نے تفسیر سورۃ اخلاص میں یوں کی ہے۔ شعر

ہُو ہے سب اسموں میں اک اسمِ خدا	فوق ہے اللہ سے اس کا مرتبہ
ہستیٔ مطلق کا کیا کیجے بیاں	لامکاں سے ہے پرے وہ بے نشاں
چشمۂ کافور کہتے ہیں اسے	واں صفاتوں میں رسائی ہے کسے

واں نہیں دم مارنے کی بات ہے
بے صفات و اسم تنہا ذات ہے

گویا یہ وہ بلند مرتبہ ذات ہے۔ جہاں تک کسی کے علم و ادراک اور خیال و فکر کی رسائی نہیں اور وَلَا یُحِیطُونَ بِہٖ عِلْمًا اسی مقام کے لئے اشارہ ہے۔ یعنی از روئے علم کے اس کو احاطہ نہیں کر سکتے۔ اور اسی مقام بلند کا تذکرہ حدیث شریف میں یوں فرمایا گیا ہے۔ وَکَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْئٌ اور اللہ ہی تھا اس کے ساتھ کوئی شے نہ تھی۔

وحدت - یہ وہ مقام ہے جس کی نسبت حدیث شریف میں ہے سَئَالَ دَاؤُدُ عَلَیْہِ السَّلَامُ لِمَاذَا خَلَقْتَ الْخَلْقَ قَالَ کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ۔ یعنی داؤد علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت جل و علا شانہٗ میں سوال کیا۔ کہ اے پروردگار تو نے خلقت کو کیوں پیدا فرمایا۔ حکم ہوا کہ میں پردہ تنزیہ میں ایک خزانہ پوشیدہ تھا۔ پھر مجھے شوق ہوا کہ میں پہچانا جاؤں اور اس عالم امکان میں اپنے آپ کو ظاہر کروں۔ تو میں نے خلقت کو پیدا فرمایا۔ سو ذات کے ظہور کی حقیقت اسی طرح پر ہے کہ جب اس ذات کو اپنے آپ کے ظہور کا شوق ہوا اور اس نے چاہا کہ اپنے آپ کو

ظاہر فرمادے تو مرتبۂ احدیت سے مقامِ محمدی میں تنزل فرمایا۔ یعنی نور محمدی پیدا کیا۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی نُوْرِیْ۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور پیدا فرمایا اور اسی لئے بیان کیا جاتا ہے کہ کمالات و مقامات محمدی پرتو اُس نورِ ذات کے ہیں۔

پس جاننا چاہیئے کہ چونکہ اس وجود مطلق نے باعتبار تعین و تنزل کے شان نور محمدی کے ساتھ ظہور فرمایا تھا اسلیئے اس مرتبہ کو حقیقت محمدی بھی کہتے ہیں اور اگر اس تعین و تنزل کا خیال نہ کریں کیونکہ ابھی ظاہر ہی نہیں ہوا تھا۔ اور ذات کے علم و ارادہ میں ہی تھا تو پھر اسکا نام احدیت ہی ہوگا اور اگر اس کو تعین و تنزل خیال کریں تو اس مرتبہ کا نام وحدیت ہوگا۔ اسکی ادنیٰ سی مثال یوں سمجھئے کہ ایک کاریگر ہے جس میں مختلف اشیاء بنانے کی قدرت ہے اور جو چاہے بنا سکتا ہے۔ مگر ابھی اس کو کوئی خواہش و ارادہ کاریگری کے ظہور کا نہیں ہوا۔ یہ مقام گنج مخفی یعنی کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا کا ہے۔ جس کو مرتبہ احدیت کہا جاتا ہے۔

پھر جو اس میں یہ خیال و شوق پیدا ہوا کہ مجھ میں قدرت اور صنعت کا جوہر موجود ہے۔ میں اس کو ظاہر کروں تو اس ارادہ کا نام مرتبۂ وحدت، علمِ اجمال اور حقیقتِ محمدی ہوگا۔ گو اس شوق و ارادہ میں تمام اسماء و صفات مخلوق کی موجود ہوگئی ہیں۔ مگر ابھی یہ تفصیل نہیں ہوئی کہ فلاں چیز فلاں شکل پر ہوگی۔ بعد ازیں جب سب صورتیں متعین ہو چکیں مگر ابھی تک بنایا کچھ بھی نہیں گیا۔ تو یہ مرتبہ تفصیل کا ہے جس کو وحدیت، اعیان ثابتہ اور صور علمیہ کہا جائیگا۔

پھر جب اس نے اپنے اس علم کے مطابق جو خیال و ارادہ میں لایا تھا۔ ویسی ہی علیحدہ علیحدہ شکلیں بنا کر اشیاء کی صورتوں میں اپنی کاریگری کو ظاہر فرما دیا تو یہ مرتبہ عالم اجسام یا اعیان خارجیہ کہلائے گا۔

جب ذاتِ حق کے ان تینوں مرتبوں کا علم ہو چکا تو اب ظہور ذات کے پانچ تنزلات کو بھی معلوم کرنا چاہیئے جن کو پانچ تعین اور حضرات خمسہ بھی کہتے ہیں اور ساتواں مرتبہ انسان کامل کا ہے۔ اس صورت میں انسان دائرہ نزول کا آخر اور دائرہ عروج کا اوّل بنے گا۔ جس کی تفصیل اس نقشہ سے ظاہر ہوگی:۔

دائرہ نزولی			دائرہ عروجی	
احدیت	لاتعین		×	انسان کامل
وحدت	تعین اوّل		×	عالم اجسام
وحدیت	تعین دوم		×	عالم مثال
عالم ارواح	تعین سوم		×	عالم ارواح
عالم مثال	تعین چہارم		×	وحدیت
عالم اجسام	تعین پنجم		×	وحدت
انسان کامل			×	احدیت

پس ان پانچ تنزلات و تعینات سے دو کی نسبت یعنی وحدت اور وحدیت کی اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں۔ اور تین کی نسبت یعنی عالم ارواح، عالم مثال۔ عالم اجسام کی خلقت کی طرف ہے جس پر ذات کا ظہور یوں ہوا کہ عالم ارواح سے عالم مثال میں زیادہ اور عالم مثال سے عالم اجسام میں اور زیادہ ہوا جس کی مختصر سی تشریح پہلے گذر چکی ہے۔

ذکر پاس انفاس صوفیائے کرام و فقرائے عظام میں یہ بھی ذکر کا ایک مشہور طریق ہے جس کو پاس انفاس کہتے ہیں۔ یعنی ذاکر بیدار اور ہوشیار ہے۔ جب دم بخود چلے اور باہر نکلے تو اس کے باہر ہونے کے ساتھ ذاکر لَا اِلٰہَ کا تصور کر کے خیال کرے کہ میں نے جملہ ماسوائے اللہ کو جسم سے باہر نکال دیا ہے اور بذریعہ لا نفی کرتا ہوں۔ پھر جب سانس خود بخود بغیر ارادے کے اندر جائے تو لفظ اِلَّا اللہ کہتا ہوا قلب پر پہنچے تو خیال کرے کہ اللہ کے سوا تمام اشیاء فنا ہو گئیں اور لفظ اللہ کا نقش دل پر قائم رہ گیا ہے۔ اس ذکر کے کرنے سے ذاکر اُن انوار و اسرار کو پالیتا ہے جو کسی دوسرے طریق سے اتنی جلدی ممکن نہیں ہو سکتے اور اکثر اہل اللہ اسی پر کاربند رہے ہیں۔

تواضع یعنی جس انسان کو ملے اس کو اپنے سے بہتر اور افضل جانے اور سمجھے کہ شاید یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجھ سے بہتر اور مرتبہ میں بلند ہوگا۔ اگر اپنے سے عمر میں چھوٹا ہو تو اس کو گناہ سے محفوظ جان کر یہ کہے کہ یہ اللہ تعالیٰ

کی نافرمانی نہ کرنے میں مجھ سے اچھا ہے۔ اور اگر اپنے سے بڑا ہو تو یہ کہے یہ مجھ سے پہلے کا عبادتِ الٰہی میں معروف ہے۔ جب اس خصلت میں پختہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تمام آفات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کو دین کی خیر خواہی کرنے کے مرتبہ پر پہنچاتا۔ اور اس کو ہمدردی کی توفیق رفیق فرما دیتا ہے۔ اور وہ اس کے مقبول و برگزیدہ بندوں اور دوستوں سے ہو جاتا ہے۔ بعض بزرگانِ دین نے فرمایا ہے کہ تواضع رحمت کا دروازہ ہے۔ اس کے ذریعہ عُجب و تکبّر کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہی عبادت کا مغز، زاہدوں کا شرف و مجد، اور عابدوں کی نشانی ہے، قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ یعنی خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوں تو انہیں سلام کا قول فرماتے ہیں۔

حسن خلق حُسنِ خلق یہ ہے کہ درویش پر جفائے خلق کا اثر نہ ہو۔ بالخصوص جبکہ درویش حق سے خبردار ہو گیا ہو اور عیوب پر نظر کر کے اپنے نفس کو اور جو کچھ نفس سے سرزد ہوا ہو ذلیل جانے اور جو کچھ خدا تعالیٰ نے خلق کے دلوں کو ایمان اور اپنے احکام ودیعت فرمائے ہیں اُن پر نظر کر کے ان کی اور جو کچھ ان سے اس کے حق میں صادر ہو عزت کرے کیونکہ یہی حسن خلق ہی ایک انسانی جوہر ہے اور اسی سے ہی لوگوں کو پرکھا جاتا ہے۔

حیاء حیاء یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے حق میں وہ بات نہ کہی جائے جو اس کی شان کے شایاں نہ ہو اور تمام گناہوں و محارم الٰہیہ کو حیاء کی وجہ سے چھوڑ کر علیحدہ ہو جانا چاہئے۔ نہ کہ خوف کے سبب سے۔ بندہ خلوصِ قلب سے عبادت الٰہی کرے اور یہ ایمان رکھے کہ خداوند عالم اس کی ہر بات سے مطلع ہے۔ اسی لئے اس سے شرماتا ہے پھر جب قلب اور ہیبت کے درمیان سے حجاب اٹھ جاتا ہے تو حیاء پیدا ہوتی ہے۔

شکر شکر یہ ہے کہ نہایت عاجزی اور انکساری سے نعمت کا اقرار و اعتراف اور ادائے شکر کی عاجزی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور منت و احسان کا مشاہدہ کرتے ہوئے اسکی عزت و حرمت باقی رکھی جائے۔ شکر کے اقسام میں سے ایک شکر لسانی ہے کہ زبان سے نعمت کا اعتراف کرے۔ شکر بالارکان یہ ہے کہ خدمت و وقار سے موصوف رہے۔ شکر بالقلب یہ ہے کہ بساطِ شہود پر معتکف ہو کر حرمت و عزت کا نگہبان رہے۔ پھر اس مشاہدہ کے بعد نعمت کو دیکھ کر دیدارِ منعم کی جانب ترقی کرے۔ بزرگانِ طریقت و عارفانِ حقیقت نے ارشاد فرمایا ہے

کہ شاکر وہ ہے، جو موجود پر شکر گزاری کرے اور شکور وہ ہے جو مفقود پر شکر گزار ہو۔

توحید توحید مقام حضرت القدس کے اشارات، سترِ ضمائر و اخفاءِ سترِ سرائر کا نام ہے اور قلب کے غطائے انکار سے گذر جانے، اعلیٰ درجات وصال میں پہنچنے اور اقدامِ تجرید سے تقرّب خدا میں جانے کو کہتے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ دل کا خالی کرنا اور اس کا غیر حق سبحانہٗ کی واقفیت سے مجرد ہو جانا اور اللہ تعالیٰ پر اعتقاد و وحدانیت کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ توحید کہلاتا ہے۔ اس کی چار قسمیں ہیں:-

۱۔ توحید اسمائی۔ یعنی جمیع اسماءِ جملہ موجودات کو اسماءِ الٰہی جانے

۲۔ توحید افعالی۔ یعنی جمیع افعال جملہ موجودات کو اللہ کی طرف منسوب کرے۔

۳۔ توحید صفاتی۔ یعنی جملہ صفات موجودات کو صفاتِ خدا سمجھے۔

۴۔ توحید ذاتی۔ اس سے یہ مراد ہے کہ جملہ موجودات میں ذات واحد کے سوائے کچھ نظر نہ آئے۔

حضرت غریب نواز سند المشائخین علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ لاہوری فرماتے ہیں کہ توحید کی حقیقت کسی شئے کی یگانگی پر حکم کرنا ہے اور اس کی یگانگی پر علم کی صحت۔ پھر فرمایا کہ توحید تین طرح پر ہے۔

۱۔ ایک تو خدا کی توحید ہے خدا کے لئے اور یہ اپنی یگانگی پر علم ہے۔

۲۔ خدا کی توحید۔ مخلوق کے لئے ہے اور وہ بندہ کے لئے توحید پر خدا کا حکم اور بندہ کے دل میں توحید کی پیدائش ہے۔

۳۔ لوگوں کی توحید خدا کے لئے ہوتی ہے اور یہ لوگوں کا خداوندِ تعالیٰ کی وحدانیت پر علم ہے۔ پس جب بندہ خدا سے عارف ہوتا ہے تو اس کی وحدانیت پر حکم کر سکتا ہے۔

نیز حضرت قبلہ شیخ الشیوخ، شیخ العالم، شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ توحید کے کئی مراتب ہیں۔ موحد کو چاہئے کہ ان پر غور کرے تاکہ منزل کو پہنچے۔ مثلاً توحیدِ ایمانی، توحیدِ علمی، توحیدِ حالی، توحیدِ الٰہی۔

توحید ایمانی یہ ہے کہ بندہ اس امر کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کرے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں یگانہ ہے۔ اس کے سوائے اور کوئی مستحق عبادت نہیں۔ یہ توحیدِ مخبر کی تصدیق اور حدیث کے صدق اعتقاد کا نتیجہ ہے۔ جو علمِ شریعت سے لیا گیا ہے۔ جس پر پابند ہونے سے شرکِ جلی سے خلاصی ہوتی ہے۔

توحیدِ علمی۔ علمِ باطن سے ماخذ ہے جسکو علم الیقین کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ بندہ طریق تصوف کے شروع میں اس بات کو یقین جانے کہ حقیقی موجود اور مطلق موثر خداوند عالم جل وعلا شانہٗ کے سوائے اور کوئی نہیں۔ اور ہر ایک ذات کی روشنی اسی ذاتِ مطلق کے نور سے ہے اور ہر صفت اسی کے نورِ مطلق کا پرتو ہے۔

توحیدِ حالی وہ ہے کہ توحید کا حال موحد کی ذات کا لازمی وصف ہو جائے اور وجود کی تمام رسمی تاریکیاں سوائے تھوڑے بقیہ کے توحید کے نور میں نیست و نابود ہو جائیں اور توحید کا نور اس کے حال کے نور میں چھپ جائے۔ چنانچہ حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اَلتَّوحِیدُ مَعنیً یَضمَحِلُّ فِیہِ الرُّسُومُ وَ یَندَرِجُ فِیہِ العُلُومُ وَیَکُونُ اللّٰہُ کَمَا لَم یَزَل۔ یعنی توحید ایک ایسا مطلب ہے جس میں رسمیں مٹ جاتی ہیں اور علوم داخل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسا نظر آتا ہے جیسے کہ ہمیشہ سے ہے اور اس توحید کا منشا مشاہدہ کا نور ہے۔ جس میں اکثر بشریت کے نشانات جاتے رہتے ہیں۔

توحیدِ الٰہی وہ ہے۔ کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ ازل سے اپنی ذات میں ہمیشہ وحدانیت کے وصف اور فردانیت کی تعریف سے موصوف ہے۔ نہ کسی کے واحد بنانے سے کَانَ اللّٰہُ وَلَم یَکُن مَعَہٗ شَیءٌ یعنی اللہ تعالیٰ تھا اور اس کے ساتھ کوئی اور چیز نہ تھی۔ اور ابدالآباد تک اسی طرح رہے گا۔ کُلُّ شَیءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجھَہٗ یعنی اس کی ذات کے سوائے ہر شے ہلاک ہونے والی ہے۔

تزکیہ نفس یا مجاہدہ

چونکہ ہمارے اسلامی تصوف میں ہندو ویدانت کے فلسفہ کی آمیزش ہو گئی اور ترکِ دنیا کے وعظوں کی کثرت بھی ہم میں صدیوں سے موجود چلی آئی ہے۔ اس لئے اکثر لوگوں نے جہاد بالنفس کی حقیقت سمجھنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ دنیوی لذتوں سے کنارہ کش ہو کر تارک الدنیا بنا، قیدِ علائق سے آزاد ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں زندگی گزارنا، ریاضاتِ شاقہ عمل میں لانا، بھوکا پیاسا رہ کر گذارہ کرنا ہی پاکبازی اور مجاہدۂ نفس ہے گو یہ ممکن ہے جو بعض لوگوں سے نادانی میں سرزد ہوتی ہے۔ اور بعض ریاکاری سے اس کے حامل بنتے ہیں۔ جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمل ترکِ دنیا اور اظہار زہد و تقویٰ کو دامِ تزویر بنائیں دنیا کمائیں اور لوگوں کی نگاہ میں عزت و آبرو بڑھائیں مگر ان کے برعکس بعض نیک نیت اور سادہ لوح اشخاص ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف نافہمی سے ان ناروا افعال کو خداوند عالم جل وعلا شانہٗ تک پہنچنے اور نجات حاصل کرنے کا ضروری ذریعہ سمجھتے ہوئے امورِ دنیوی کی ذمہ داریوں کو فی الحقیقت تعلق الٰہی

کیلئے مانع خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ مجاہدۂ نفس اور عفت و پارسائی کا مفہوم نہایت لغو اور غلط ہے۔

جہاد بالنفس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اسلام نے جو باتیں جائز فرمائی ہیں ان کو اپنی نفسانی خواہشات کی سرگرمی سے پورا کرے اور جو باتیں ممنوع قرار دے دی گئی ہیں ان سے اپنی خواہشات کو روک دے اور احکام الٰہی میں جو دشواریاں پیش آئیں ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور اپنی تمام نفسانی خواہشات کو منشائے ایزدی کے ماتحت عمل میں لائے۔ گویا دوسرے معنوں میں نفسانی جذبات کو عقل کے تابع اور اعتدال پر رکھنا اور مرضیات الٰہیہ کے مطابق استعمال میں لانا ہی عفت و پارسائی کا مقصد وحید ہے۔ جذبات کو معدوم کر دینا تقوےٰ و پاکیزگی نہیں۔ کیونکہ جذبات نفسانی کا استیصال انسانی فطرت اور منشائے ربانی کے خلاف ہے۔

فتوح الغیب میں حضور سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کی پیروی کرنا اور دین اسلام کو سچا دین سمجھنا۔ رسالت اور حشر و نشر پر ایمان رکھنا۔ گناہوں سے اجتناب کرنا اور روزہ و نماز کی پابندی ان اعمال کے ساتھ بجا لانا جو مذکور ہو چکے ہیں اور جن کو اختیار کر کے انسان اپنے آپ کو متلاشیان حق کی صف میں کھڑا کر سکتا ہے۔ اور ان فرائض کے ادا کے بعد اگر اللہ تعالیٰ کے تقرب کی سعی بھی کرے اور اپنی قوت و استطاعت کے مطابق اذکار و اشغال میں انتہائی انہماک سے مصروف ہو جائے اور یہ اعتقاد قائم کرے کہ میرا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، چلنا، پھرنا رونا، ہنسنا غرضیکہ ہر حرکت و سکون اللہ اور صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ تو اس اعتقاد و عمل کا نام مجاہدہ بالنفس ہے اس میں محبت الٰہی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس محبت الٰہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور حضور علیہ السلام کی اس حدیث کے مطابق ہو جاتا ہے کہ اللہ کریم نے فرمایا کہ جو بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میری قربت چاہتا ہے تو میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ میں اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ میں اس کا دل ہو جاتا ہوں جس سے وہ سمجھتا ہے اور میں ہی اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ کلام کرتا ہے۔ وہ مجھ سے جو مانگے وہ عطا کرتا ہوں۔ اور جب میری پناہ طلب کرے تو پناہ دیتا ہوں۔

الغرض تصوف و سلوک میں معاصی و مناہی سے اجتناب اولین قدم ہے۔ اور اتقا، جتنا بڑھتا ہے، اتنا ہی

جزئیات سے اعراض ورپرہیز بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک پوری طرح تزکیۂ نفس نہ ہولے اور تزکیۂ نفس کے لئے مجاہدات اور ریاضات لازمی ہیں۔ جس کا مجاہدہ جتنا زیادہ ہوگا اس کا نفس اتنا ہی مغلوب ومزکّی ہو گا۔ اور اس میں اتنی ہی استعداد کسبِ انوار بڑھیگی۔ گویا دید ویافت کے لئے مجاہدہ نہایت لابدی اور ضروری چیز ہے۔ کیونکہ مجاہدہ کے بغیر مشاہدہ محال ہے۔ جیسے دودھ سے مکھن، سنگ سے لعل، زمین سے پانی، بے محنت نہیں نکل سکتا اسی طرح مجاہدہ کے بغیر مشاہدہ نہیں ہوتا۔ اس لئے طالب کو اوّل علائق دنیوی، فکر اہل وعیال، اندیشۂ زرومال حب جاہ وحب وطن وغیرہ سے قلب کو خالی کرنا اور حواس ظاہر وباطن کو جمع کر کے یکسو ہونا چاہئیے۔ حواس ظاہری کا روکنا توبصورت مراقبہ گوشۂ تنہائی میں ممکن ہے۔ مگر حواس باطنی کا ان سے مشکل۔ لہٰذا ضرور ہے کہ کسی ذکر کی مشق کی جائے اور یہاں تک کی جائے کہ زبان سے گزر کر قلب سے جاری ہو اور الفاظ محو ہو کر معنے ہی معنے رہ جائیں۔ پھر اس مشق سے رحمتِ کاملہ کے قبول کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ رہی یہ بات کہ اس مجاہدہ کے بعد ادھر سے جذب وکشش کب ہو اس کا مدار محض عنایت پر ہے۔ اس مجاہدہ کے متعلق مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں۔ شعر

بے لب وبے حرف میگو نامِ رب ۔۔۔ پس زجاں کن وصل جاناں راطلب
خویشتن عریاں کن از جملہ فضول ۔۔۔ ترک خود کن تاکند رحمت نزول

یہی وجہ ہے کہ تمام بزرگانِ طریقت اور عارفانِ حقیقت مجاہدات میں مشغول رہے ہیں اور لوگوں کو رہنے کی ہدایت فرماتے ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ مجاہدات، عبادات کے ساتھ ہوتے ہیں اور عبادت معشوقِ حقیقی سے ایک گونہ وابستگی واطاعت سے عبارت ہے۔ اس لئے اس میں بے حد سرشاری کی ضرورت ہے اور اس شوق میں انسان کا قدم آگے ہی بڑھنا چاہئیے۔ کیونکہ جتنی زیادہ ریاضت کی جائے گی اتنا ہی زیادہ لطف حاصل ہو گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو خلاف شرع مجاہدات وریاضات کو کام میں لاتے ہیں منزلِ مقصود کو نہیں پا سکتے۔ کیونکہ جس منزل کا ارادہ ہو اسی سمت اور اسی کی شاہراہ پہ چلنے سے منزل ملتی ہے۔ اور اگر منزل کوئی خیال میں ہو اور منہ کسی طرف کو رکھ کر سفر اختیار کر لیا جائے۔ اور یہ سمجھے کہ چلنا ہی مقصود ہے اور میں اپنی مرضی سے چل ہی رہا ہوں تو وہ کہیں بھی نہ پہنچ سکے گا۔ اور نہ اس کا کوئی مقام وحال ہو گا۔ حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں۔ شعر

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی — کیں راہ کہ تو میروی بترکستان است

کیونکہ وہ اس منزل کے رُخ اور نشان کے خلاف چل رہا ہے جس منزل کا دماغ میں دھیان لئے ہوئے ہے عوام سمجھتے ہیں کہ اتنی محنت شاقہ اور مجاہدے غیر ممکن ہیں۔ لیکن یہ ان کا خیال غلط ہے۔ غیر ممکن وہ کام ہوتا ہے جس کو کوئی بھی نہ کر سکے اور اگر کسی نے کر دکھایا تو غیر ممکن نہ رہا۔ یہ محض نفس کی شرارت ہوتی ہے۔ حالانکہ دنیا کی ہر خواہش کو پورا کرنے کے لئے ہر محنت و مصیبت کی برداشت کر گزرتا ہے۔ بلکہ جنگ جیسی پُرخطر فضا میں بھی کود جاتا ہے، جہاں اس کی جان چلے جانے کا پورا پورا احتمال ہوتا ہے۔ اور یہاں تو صرف منہ دھونا، کھڑے ہوتا جاگنا اور اعتدال کی بھوک اور دھوپ برداشت کرنا وغیرہ ہی مقصود ہے۔ جن میں مجاہد کے جان سے جانیکا خوف نہیں ہوتا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ مجاہدات و ریاضات اصلاحی میں قدرے جسمانی تکلیف ضرور ہوتی ہے کیونکہ نفس فطرتاً آرام کا طالب ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ہی روحانی تقویت اور لذت بھی فراواں ہوتی چلی جاتی ہے جو اس تکلیف کو قابل برداشت بنا دیتی ہے۔ اور جب پوری صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو قلب میں تخم محبت الٰہی بو یا جاتا ہے۔ لٰہذا جو شخص یہ مرتبہ اور تقرب حاصل کرنا چاہے۔ اس کے لئے ضروری اور لازمی ہے کہ وہ صبح و شام اس طرح ان اذکار و اشغال میں مصروف ہونے کو تیار ہو جائے جو بزرگان دین نے تعلیم فرمائے ہیں۔ اور دنیوی امور میں انہماک کُلّی نہ رکھے تاکہ غافلوں میں شمار نہ ہو۔ اگر امورات دنیا میں انہماک رکھیگا اور اتباع نفس میں منہمک ہو جائے گا تو اس کے لئے تباہی اور گمراہی یقینی ہو جائے گی بعض حضرات نفس کے باریک فریبوں کو نہیں سمجھتے اور اس کی پیش کردہ مکروہ شئے کو بھی مفید و خوش سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ جو سراسر مغالطہ اور فریب ہوتی ہے۔ جیسے خوبصورت لونڈوں سے محبت کرنے کا نام علت مشائخی رکھ لیں۔ جہاد بالنفس کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ "ہم رجوع کرتے ہیں چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف"

اس ارشاد میں دشمن باطنی (نفس) کے ساتھ نبرد آزمائی کرنے کی طرف انتقال کرانے میں۔ ظاہری دشمن کے ساتھ جنگ کرنا جہادِ اصغر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور اس باطنی دشمن سے لڑنے کو جہادِ اکبر کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہری دشمن تو کھلے میدان میں برسر پیکار ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو

زیر کرنا سہل ہے۔ بخلاف باطنی دشمن کے کہ وہ خود انسان کے مکامن وجود میں حتیٰ کہ رگ رگ کی کمین گاہ میں مخفی ہے جس کا تعاقب کرنا اور اس کو گرفت میں لانا دشوار ہے۔ نیز انسان کے جس قدر قوائے و حواس دشمن ظاہری کو شکست دینے میں مدد دیتے ہیں وہ سب اس دشمن باطنی کا حکم مانتے ہیں۔ اس لئے نفس کا مقابلہ نہایت مشکل اور خطرناک ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس اللہ سرہٗ کے فتاویٰ میں لکھا ہے۔ کہ یہ کلام (رجعنا من جہاد الاصغر الخ صوفیہ کی کتابوں میں بہت مستعمل ہے۔ اور ان کے نزدیک حدیث نبوی ہے۔ بلکہ بعض علمائے محدثین کے کلام میں بھی یہ عبارت جہاد نفس کی فضیلت کے استشہاد میں دیکھی گئی ہے۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ حدیث کی کسی کتاب میں دیکھی ہو۔ بہرتقدیر جہادِ اکبر سے مراد نفس و شیطان کا جہاد ہے نہ کہ مراجعت، اور یہی تفسیر صوفیہ کے فہم کے مطابق ہے اور اس کلام کی شاہد حدیث متفق علیہ ہے (المجاھد من جاھد نفسہ فی طاعۃ اللہ) چنانچہ ظاہر ہے کہ ایسے مقامات میں مسند الیہ کو معرف باللام لانا حصر کمال کے لئے ہوتا ہے۔ کما فی نظائرہ مثل المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہٖ الخ والمہاجر من ھاجر ما نھی اللہ عنہ انتھیٰ۔ اس لحاظ سے اس حدیث کے معنی یوں ہوں گے۔ کہ بڑا مجاہد وہ شخص ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔ جب ایسا مجاہد بڑا ہے تو ضرور اس کا جہاد بھی بڑا ہوگا۔ اور یہی جہادِ اکبر کا مدلول ہے۔ حضرت ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث رجعنا من جہاد الاصغر کے بارے میں عسقلانی نے تسوید القوس میں کہا ہے کہ یہ قول عام زبانوں پر چڑھا ہوا ہے اور بقول نسائی ابراہیم بن عبلہ کا کلام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث احیاء العلوم میں مذکور ہے اور اس کو عراقی نے بروایت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیہقی سے منسوب کیا ہے۔ ہاں اس کے اسناد میں ضعف بھی تسلیم کیا ہے۔ حضرت سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ خطیب نے اپنی تاریخ میں جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی علیہ السلام کسی غزوہ سے واپس آئے تو فرمایا قدمتم خیر مقدم وقدمتم من الجھاد الاصغر الی جھاد الاکبر۔ لوگوں نے سوال کیا۔ جہاد اکبر کیا ہے۔ تو فرمایا مجاھدۃ العبد ھواہ یعنی بندے کا اپنی خواہشات سے جنگ کرنا۔

پاسِ شریعت جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا ہے۔ درویش کے لئے اتباع شریعت لازمی و لابدی چیز ہے۔ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور امورات ظاہری کا اتباع نہایت ضروری ہے۔ جب تک درویش متابعت شرع نہ کرے دین اسلام کو سچا جانتے ہوئے دل میں جگہ نہ دے توحید و رسالت واجنہ و ملائکہ

حشر و نشر۔ کتب و قیامت۔ عذاب و ثواب۔ جنت و جہنم و حساب قبر پر مضبوط ایمان نہ رکھے، گناہوں سے اجتناب نہ کرے اور روزہ و نماز کی پابندی میں ثابت قدم نہ رہے۔ درویشی سے اس کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا کیونکہ جو مبادیات ہی سے ناواقف ہے وہ انتہا تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں سے دو طرح پر مخاطبہ فرمایا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ دو چیزوں کا مطالبہ کیا ہے۔ ایک یہ کہ ایمان لاؤ۔ اور دوسرے یہ کہ اعمال صالح کرو۔ ایمان بیج ہے اور اعمال صالح اس کا پھل ہیں۔ اگر کسی انسان میں حقیقت ایمان ہی متحقق نہ ہو تو وہ صحیح معنوں میں محبت و عبدیت الٰہی کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ ایمان ہی سے مسلمان میں عمل کی آمادگی اور جذبۂ فدویت پیدا ہوتا ہے۔ اور اسلامی زندگی میں کمال پیدا کرنے کے لئے اتباع شریعت کی نجست ضرورت ہے۔ کیونکہ یہیں سے طریقت کی راہ کھلتی ہے۔ اور یہیں سے تہذیب نفس حاصل ہوتی ہے جو درویش کو توحید کے درجہ اور تخصیص تفرید کے مرتبہ پر پہنچاتی ہے اور یہیں سے عارف سکون و وقار پاتا ہے۔

راہِ طریقت جب مادی علوم میں سے کوئی علم اور دستکاری کے پیشوں میں کوئی پیشہ ایسا نہیں جس میں استاد کی مدد لازمی نہیں تو پھر میدانِ روحانیت کا علم جو اِن تمام علوم سے زیادہ لطیف اور تزکیۂ نفس کا فن جو ان تمام فنون سے زیادہ دشوار اور مرتبہ معرفت جو تمام مراتب سے بہت بلند اور جس کی راہ تمام راہوں سے زیادہ نازک ہے کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ بغیر کسی استاد کی مدد کے طے ہو سکے۔ کیونکہ اس سفر میں قدم قدم پر راہ نما ناگزیر اور چپے چپے پر ضرورت استاد لابدی ہے۔ جس کو اصطلاح طریقت میں پیر و مرشد کہا جاتا ہے۔

مسلمان جب احکامِ شریعت کی متابعت کر کے اس کے اسرار کو سمجھ لیتا ہے تو اس کو طریقت و حقیقت و معرفت کی منازل کی جانب جانے کے لئے ایک ایسے راہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس کو اگلی روحانی تعلیم صحیح دے سکے اور اگر اس ضرورت کے پورا کرنے کو کسی کے دامن سے وابستگی کرنی چاہے گا۔ تو سب سے پہلے اس کو مسنون بیعت کے مسئلہ پر عمل کرنا پڑے گا۔ اور کسی ایسے مردِ خدا کے ہاتھ میں ہاتھ دینا ہوگا۔ جو اس کو شریعت کے اتباع کے ساتھ ساتھ اگلی منازل کا اہل بنا سکے۔ بعض لوگوں کا قاعدہ اور خیال ہے کہ کسی مخصوص انداز میں رسمی بیعت کی ضرورت نہیں اصلاح نفس کے لئے انسان فطری صلاحیت کی بنا پر اپنے آپ کی اصلاح کر سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے۔ کہ اگر ایسا ہونا بغیر تعلیم و تربیت استاد کے ممکن ہوتا تو مشیتِ الٰہی اپنے ہر پیغام کے ساتھ عملی نمونے کی ضرورت محسوس نہ فرماتی

زمانہ کا حال شاہد ہے کہ جتنی کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئیں سب کے ساتھ عملی نمونے یعنی انبیاء علیہم السلام آئے پھر جو کام اصولِ مشیت ایزدی کے خلاف ہو اس کو اصلاح کا نام دینا یقیناً فریبِ نفس ہو گا۔ بعض لوگ بیعت سے تو منکر رہتے ہیں۔ مگر ورد و وظائف ہر اُس شخص سے بھی پوچھ لینے سے دریغ نہیں کرتے جو خواہ کسی منڈیہ و گردوارہ ہی سے آ رہا ہو۔

لہٰذا وہ مصلح جو اس کی طریقت و حقیقت میں راہنمائی فرماتا ہے پیر کہلاتا ہے اور جب تک اس سے بیعت مسنونہ نہ کی جائیگی طالب میں معرفتِ الٰہی کے لیئے وہ صحیح استعداد پیدا نہ ہو سکے گی جس کی اس کو ضرورت ہے۔ چونکہ صحبت درویش کے بغیر اصلاح کا تذکرہ اور وثوق اعتقاد بھی گمراہی ہے۔ اس لیئے بیعت لازمی اور لابدی امر ہے۔ جو لوگ فی زمانہ اپنی فطری صلاحیت پر اصلاح کے قائل اور عمومی اوراد و وظائف پر منتہائے حصول معرفت کے دعویدار ہیں۔ وہ کبھی نفس و شیطان کے جنگل سے بچ کر ایمان سلامت نہیں لے جا سکتے۔ العیاذ باللہ۔ کیونکہ فتنۂ نفس و شیطان کا علاج شیخ کے مطب کے سوا اور کہیں نہیں۔ یہی وہ مقدس دروازہ ہے۔ جہاں سے مسلمانوں کی بہتری اور برتری کی تمام راہیں ملتی ہیں۔ اور اسی گھر کے رہنے والے اسلام کے کفیل اور سچے محافظ و پاسبان ہیں۔ ہر زمانہ میں انہی حضرات کی طفیل مسلمانوں کو عظمت و عزت و راحت و سعادت نصیب ہوئی ہے۔ انہی سے پاکیزگیٔ حیات کا نور چمکا اور انہی کے روحانی اثر نے اسلام اور اہلِ اسلام کو چار چاند لگا دیئے۔ پیرویٔ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا بنیادی پتھر انہی حضرات کی دہلیز بوسی ہے۔ کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی محض الفاظ و کلمات سے متعلق نہیں ہے۔ اور نہ امت کے لیئے صرف ظاہری پیروی کافی ہے۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح ہمارے لیئے اسوۂ حسنہ کا حکم بلحاظ اپنی نماز کی تعداد اور رکعات کے اور بلحاظ رکوع و سجود و قیام و قرأت کے رکھتے ہیں، اسی طرح نماز کے اندر خشوع و خضوع کے ذوق و وجد اور کیف و استغراق کے لحاظ سے بھی ہمارے واسطے اسوۂ حسنہ ہیں۔ پس باطنِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی بھی ایسی ہی ضروری ٹھہرتی ہے۔ جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر کی۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے کلمات و ارشادات اور ظاہر کی پیروی تو کتابوں کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ لیکن باطنی پیروی کا ذریعہ کیا ہے۔ اخبارِ رسالت تو مجلدات کے اوراق الٹنے سے ہاتھ آ جاتے ہیں۔ لیکن انوارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس کس آئینہ میں نظر آئے گا۔ کیونکہ حضور علیہ السلام

کی بعثت کے دو ہی مقاصد قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں۔ ۱۔ تعلیم و تشریح کتاب و حکمت ۲۔ تزکیۂ نفس کتاب و حکمت کی تشریح کا سامان تو خدا کا شکر ہے امام بخاری و امام مسلم و دیگر محدثین و مجتہدین رحمہم اللہ کی وساطت سے ہو گیا ہے۔ لیکن اس سے مقدم تر مقصد تزکیۂ نفس کی کیا صورت ہو گی۔ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی یہ ہے کہ اسلام نے تزکیۂ نفوس کا جو طریقہ اختیار کیا تھا اس میں علم و عمل دونوں کی طاقتیں شریک تھیں اس کا علمی پہلو قرآن کریم اور کتب احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے نورانی صفحات میں نظر آتا تھا۔ اور عملی پہلو کو شارع علیہ السلام کے اعمال طاہرہ بے نقاب کرتے تھے۔ لیکن اسلام کی صرف یہی خصوصیت نہیں کہ وہ نظری حیثیت سے علم و عمل کا جامع تھا۔ بلکہ اس کا اصلی معجزہ یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم کے مظہر حقیقی تھے آپ نے صحابہ کرامؓ کو بھی اس کا مجسم پیکر بنا دیا۔ اس بنا پر اگر آج ہم تعلیمات اسلام کی عملی تصویر دیکھنا چاہیں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کے علاوہ اصحاب پاکؓ اور بزرگانِ دین کے سوانح شریفہ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور ان آئینوں میں بھی وہی آفتابِ ہدایت منعکس نظر آ سکتا ہے۔ جو خود صاحب شریعت علیہ السلام کے آئینہ خانہ میں ضیاء افگن تھا۔ لہٰذا لازم ہوا کہ ایک زندہ نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش و بیعت کی جائے۔ جو کوئی نئی ریاضت، نیا سبق، نیا مجاہدہ، ایجاد و اختراع نہیں کرتا۔ بلکہ آئینہ کے پیچھے طوطی صفت رہ کر استاد ازل کے سبق کا ہی تکرار کرتا ہے۔ لیکن ہاں اجتہاد و استنباط کا دروازہ اگر مقلدوں کے آئمہ فقہ اور غیر مقلدوں کے آئمہ حدیث دونوں پر کھلا ہے تو صوفی و شیخ پر بھی بند نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ یہ بھی اُن ہی سے ہے۔ لیکن وہ بھی ایجاد و اختراع کی جدت سے بچے گا اور جس طرح اہلِ ظاہر اپنے فہم و قیاس و استنباط کو معطل نہیں کر دیتے اسی طرح وہ بھی اپنے کشف و عرفان اور اشراق و وجدان کو سرے سے تعطل کی نذر نہ کرے گا۔ اور وہ جب بھی کبھی کوئی نسخہ مریض قلب و طلب کا لکھے گا، شفاخانۂ نبوت ہی کے قرابادین سے لکھے گا۔ لیکن مریض کے مزاج، خصوصیات فضا و ماحول، آب و ہوا کے اثرات اور موسم کے حالات وغیرہ کی مناسبت سے اجزائے نسخہ کی ترکیب استعمال و ترتیبِ اعمال اس کی اپنی ہو گی۔

مسئلہ بیعت کے متعلق جیسا کہ پیچھے ذکر ہو چکا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی القول الجمیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ رسمِ بیعت مسنون ہے۔ اور یہ بیعت صرف بیعت خلافت تک ہی محدود نہیں بلکہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بیعت کی مختلف صورتیں رائج تھیں۔ مثلاً بیعت اسلام، بیعتِ ہجرت، بیعت جہاد

بیعتِ توبہ وغیرہ اور صوفیائے کرام کی مروجہ موجودہ بیعت ،بیعتِ تقویٰ کی قسم میں داخل ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں تو اس بیعت کی علیحدہ ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ صحابہؓ کے قلوب و نفوس شرفِ صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود ہی نورانی تھے۔ خلفائے راشدین کے بعد فتنہ کے خوف سے اور بیعتِ خلافت کے ساتھ اشتباہ و التباس کی بنا پر یہ بیعت موقوف رہی اور صوفیائے کرام اس کے قائم مقام خرقہ کو سمجھتے رہے۔ پھر جب ملوک السلاطین کا دور آیا اور بیعتِ خلافت بند ہو گئی تو صوفیائے کرام نے فرصت کو غنیمت سمجھ کر سنت بیعت کی از سر نو تجدید کی اور اس کو بموجب ارشاداتِ قرآن و حدیث نہایت ضروری سمجھا۔ آگے چل کر جہاں شاہ ولی اللہ صاحب بیعت لینے والے مرشد کے اوصاف شمار کراتے ہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی فرماتے ہیں والشرط الخامس ان یکون تصحب المشائخ ...... الآخر۔ یعنی پانچویں شرط یہ ہے کہ مشائخ کی صحبت میں رہ کر ان سے طویل عرصہ تک ادب نور باطن اور اطمینان حاصل کیا ہو۔ اور یہ شرط اس لئے ہے کہ سنت الٰہی یوں ہی جاری ہے کہ کسی انسان کو مراد نہیں ملتی جب تک اس نے مراد پانے والے کو نہ دیکھا ہو۔ جس طرح علم بغیر صحبت علماء کے اور دوسرے صنعتی کام بغیر استاد کے حاصل نہیں ہوتے۔ اسی طرح عرفانِ الٰہی بھی بغیر خاصان خدا کی بیعت کے حاصل نہیں ہوتا۔ مزید تشریح کے لئے یہاں پر ایک باخبر سائل کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب باصواب بایں الفاظ معلوم کیجئے۔ قال ما الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہٗ فان لم تکن تراہ فانہٗ یراک (سائل عرض کرتا ہے کہ یا رسول اللہ احسان کیا ہے۔ فرمایا کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تو اس کو نہیں دیکھتا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے) اس پوری حدیث میں ایمان کے معنی بعض عقائد کے بتائے گئے ہیں۔ اور احسان کی تو یہ توضیح فرمائی گئی ہے۔

گویا عقیدہ و عمل کے بعد ایک تیسری منزل ان دونوں سے بلند تر احسان کی آئی ہے۔ جس کا تعلق محض جاننے اور کرنے سے نہیں بلکہ مشاہدہ و رویت سے ہے۔ یعنی یہ منزلِ تصوف و طریقت کی منزل ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اہلِ تصوف کی بجائے اہلِ احسان ہی کی اصطلاح اختیار کی ہے۔ اور شاید اہلِ صدق و صدیقین کی اصطلاحیں بھی یہی کام دے سکیں۔ لیکن یہ ساری بحثیں محض لفظی ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ ایمان کے اجزا اور اسلام کے ارکان تو کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں اور ایمان و عمل کے

خارجی پہلوؤں پر بھی کتب کا پڑھنا معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے۔ لیکن قلب کو مرتبۂ احسان تک پہنچانا تزکیۂ باطن، تجلیۂ نفس تطہیر اخلاق بغیر ایک زندہ شخصیت، بغیر ایک مرشد کامل، بغیر ایک ہادیٔ ناطق، بغیر ایک عملی نمونہ کی وساطت کے کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ جو قانون اور ضابطے کتابوں میں درج کرنے والے تھے۔ حدیث و آثار و فقہ کی کتابوں میں مدون ہوتے رہے۔ لیکن جن چیزوں کا تعلق وجدانیات و کیفیات سے ہے وہ تحریر میں کیونکر آ سکتی ہیں۔ وہ تو ایک قلب سے دوسرے قلب پر ہی اپنا اثر ڈال سکتی ہیں۔ مثلاً کسی مادر زاد اندھے کو روشنی کی تعریف سمجھانے کے لئے دنیا بھر کے عقلاء فیل ہو جائیں گے۔ جب تک کوئی صاحب تصرف اس کے اندر روشنی نہ بھر دے یا کوئی قابل معالج اس کی آنکھوں کا اپریشن نہ کر دے جو کوئی روشنی کو دیکھنے والا ہے، وہی اس کی کیفیت کو بھی جان سکتا ہے۔ بینائی سے محروم کیا جانے کہ آنکھوں والے کیا اور کس طرح دیکھتے ہیں۔

مثالوں اور الفاظ میں سمجھانے سے عموماً اندھوں کی کھیر ٹیڑھی ہو جایا کرتی ہے۔ اور پھر اس کا حلق سے اترنا محال کیا بلکہ ناممکن ہی خیال کیا جانے لگتا ہے۔ یعنی تمثیلی قیاس انسان کو کن غلط نتائج تک پہنچاتا ہے۔ اس کی کتنی اچھی مثال اس عامیانہ قصے میں پوشیدہ ہے۔ کہ کسی اندھے کے سامنے کھیر آئی۔ اندھے نے پوچھا کیا ہے، لانے والے نے کہا کھیر۔ بولا کھیر کیا ہوتی ہے؟ کہا گیا۔ ایک سفید سی شے جیسے بگلہ۔ اندھے نے پوچھا بگلہ کیا ہوتا ہے۔ جواب دینے والے نے ہاتھ ٹیڑھا کر کے کہا۔ لو ٹٹولو۔ اور معلوم کر لو کہ بگلہ ایسا ہوتا ہے۔ اندھے کے سامنے تمام درمیانی مقدمات حذف ہو گئے۔ اور صرف ہاتھ کو ٹٹول کر فوراً حکم لگا دیا کہ کھیر اگر اتنی ٹیڑھی ہوتی ہے تو حلق میں اس کا جانا قطعاً محال ہے۔ ٹٹولتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ ناممکن ہے کہ یہ کھیر حلق کے اندر اتر سکے۔ آنکھ والوں کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ محروم ضیا کھیر کو کیا سمجھ رہا ہے۔ چونکہ اس کے تصور میں ٹیڑھے ہاتھ کی بناوٹ تھی جسکو کھیر سے کوئی دور کی بھی مناسبت نہیں۔ اس لئے وہ یہی کہتا جا رہا تھا۔ ایسی کھیر میں اور اپنے حلق میں مطابقت محال شے ہے۔ میں کھیر کو بھی جانتا ہوں اور حلق کو بھی۔ حالانکہ کھیر کو اس نے نہیں دیکھا۔ بلکہ ٹیڑھے ہاتھ کو ٹٹولا تھا۔ بعینہٖ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو غیب کو شہادت کی مثالوں سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کے مخاطب عموماً مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ محال۔ ناممکن۔ اشد مشکل۔ ہو ہی نہیں سکتا، وغیرہ کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔

الغرض یہ مرشد کوئی خود رو یا خود رائے ہستی نہیں ہوتی۔ بلکہ جس طرح آپ قرآن کی ساری عبارت کو محض سند متصل کی بنا پر کلامِ الٰہی مانتے چلے آتے ہیں۔ جس طرح آپ بخاری کی روایت کو محض اس لئے کلام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم تسلیم کر لیتے ہیں کہ وہ معتبر سند مسلسل کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے روایت ہوئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس مرشد کا قلب بھی اپنے مضبوط واسطوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قلبِ اطہر سے ملا ہُوا ہوتا ہے۔ اور اس کا رابطہ روحانی بھی ایسی ہی زنجیر کی مضبوط کڑیوں کی طرح سرچشمۂ تقدیس وروحانیت سے جُڑا ہُوا ہوتا ہے۔ اور جس طرح امام بخاری و امام مسلم (رحمہا اللہ) آثار و اخبار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے ضخیم دفتروں میں جمع کرتے رہے۔ اسی طرح حسن بصریؒ و جنید بغدادیؒ اسرار و انوار رسول علیہ السلام سے اپنے سینوں کو منور و مخزن فرماتے رہے۔ اُدھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا قال ایک سفینہ سے دوسرے سفینہ میں منتقل ہوتا رہا۔ اِدھر حضور کا حال ایک سینہ سے دوسرے سینے کو طورِ سینا بناتا رہا۔ اور یہی وہ دونوں شعبے تھے جن کی جامعیت عہد صحابہؓ میں مسلّمہ نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اسی ضرورت کو کیسے مختصر مگر واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

کیمیا پیدا کُن از مشتِ گِلے　　　بوسہ زن بر آستانِ کاملے

ترجمہ:۔ یعنی اگر اپنی مُشتِ خاک کو سونا کرنا چاہتا ہے تو کسی مردِ کامل کے آستانِ مقدس پر بوسہ دِہ تاکہ تجھ میں تمیز معرفت وحقیقت پیدا ہو سکے۔

پھر اس کے حقائق پر اپنی مشہور مثنوی اسرارِ خودی میں مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمۃ کی ایک حکایت درج کرتے ہیں۔ جو من کل الوجوہ ہمارے مذکورہ بالا خیال کی آئینہ دار ہے۔ لکھتے ہیں:۔

اے کہ باشی در پئے کسبِ علوم　　　باز می گویم پیامِ پیرِ رومؒ
علم را بر تن زنی مارے بود　　　علم را بر دل زنی یارے بود
آگہی از قصۂ اخوند روم　　　آنکہ داد اندر حلب درسِ علوم
پائے در زنجیرِ توجیہاتِ عقل　　　کشتیش طوفانی ظلماتِ عقل
موئے او بیگانۂ سینائے عشق　　　بیخبر از عشق واز سودائے عشق
از تشکک گفت واز اشراق گفت　　　وز حکم صد گوہرِ تابندہ سُفت

عقدہائے قول مشائیں کشودے — نورِ فکرش ہر خفی را وا نمود

گرد و پیشش بود انبارِ کتب — بر لبِ او شرحِ اسرارِ کتب

پیرِ تبریزی ز ارشادِ کمال — جُست راہ مکتبِ ملّا جلال

گفت ایں غوغا و قیل و قال چیست — ایں قیاس و وہم و استدلال چیست

مولوی فرمود ناداں لب بہ بند — بر مقالاتِ خردمنداں مخند

پائے خویش از مکتبم بیروں گزار — قیل و قال است ایں ترا با وے چہ کار

قالِ ما از فہمِ تو بالاتر است — شیشۂ ادراک را روشن گر است

سوزِ شمس از گفتۂ ملا فزود — آتشے از جانِ تبریزی کشود

بر زمیں برقِ نگاہِ او فتاد — خاک از سوزِ دمِ او شعلہ زاد

آتشِ دل خرمنِ ادراک سوخت — دفترِ آں فلسفی را پاک سوخت

مولوی بیگانہ از اعجازِ عشق — ناشناسِ نغمہ ہائے سازِ عشق

گفت ایں آتش چساں افروختی — دفترِ اربابِ حکمت سوختی

گفت شیخ اے مسلمِ زنّار دار — ذوق و حال است ایں ترا با وے چہ کار

حالِ ما از فکرِ تو بالاتر است — شعلۂ ما کیمیائے احمر است

کیا مسئلۂ بیعت پر مخالفین کے لئے یہ حکایت اس امر کا صریح ثبوت نہیں کہ جس کیفیتِ مولانا جلال الدین رومی کو حضرت تبریزی علیہ الرحمۃ نے منٹوں میں یکقلم بدلا یا وہ کتب و علوم کے مناظرہ و مجاہدہ سے شائید تمام عمر ہی نہ بدلتی اور یہی ہے وہ قوت باطنی کی حقیقت کا تذکرہ جس کو اصلاح نفوس کے لئے کتاب و سنت کے ساتھ ساتھ نہایت ضروری و لابدی بتایا گیا ہے خود مولوی رومی علیہ الرحمۃ مذکورہ اظہار حقیقت کے بعد یوں فرماتے ہیں ۔ کہ

مولوی ہرگز نشُد مولائے روم — تا غلامِ شمس تبریزیؒ نشُد

فاعتبروا یا اولی الابصار

تعلیم تقرّب اِلیٰ اللہ

چونکہ ہر چہار سلاسل کے اوراد و وظائف و طریق کار جداگانہ ہیں۔ اس لئے اپنے اپنے شیخ کے سلسلہ کی اپنی اپنی تعلیم کو مدِ نظر رکھنا چاہئے۔ اور اسی راستہ پر گامزن ہونا چاہئے۔ کیونکہ بعض اوقات مختلف سلاسل کے وظائف اور مختلف پیرانِ عظام کی تعلیم نقصان دیتی ہے۔ اور طالب دو ملاّں میں مرغی حرام کا مصداق بن جاتا ہے۔ لہٰذا فقیر یہاں وہ طریقِ کار درج کرتا ہے جو سلسلۂ عالیہ سہروردیہ قادریہ کا ہے۔ جو طالبانِ حق اس سے متعلق ہیں وہ اس کو اپنائیں اور اپنے مولا کو پائیں۔ وھوہذا۔

محبّت سب کاموں سے بہتر اور کامیاب بنا دینے والی چیز محبت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان کسی میدان میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ گویا وہ ایک نشہ ہے جو بدوں مشاہدہ محبوب نہیں اترتا۔ اور ایک سکر ہے جس کا علاج جمالِ محبوب کے سوا اور نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے تین اصول ہیں۔

وفا   ادب   مروّت

وفا یہ ہے کہ محب محبوب کی فردانیت میں اپنے قلب کو منفرد کر کے مشاہدہ میں ثابت قدم رہے۔ اور اس کی ہر ادا سے مانوس ہو جائے۔

ادب یہ ہے کہ خطرات کی مراعات کا نگاہ دار اور حفظ اوقات کا پابند اور ماسوائے سے انقطاع کرتا رہے۔

مروّت یہ ہے کہ قولاً و فعلاً صدق و صفا کے ساتھ ذکر اللہ پر قائم اور ظاہر و باطن میں اغیار سے روگردانی کر کے سرّ اللہ پر ثابت قدم رہے اور حالات آئندہ کی رعایت کر کے حفظِ اوقات میں کوشاں ہو۔ جب محب میں یہ تینوں چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ لذت وصال کے پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کے سرّ میں آتش

اشتیاق و محبت بھڑک اٹھتی ہے۔

پیر یا شیخ سے پہلے محبت اور والہانہ محبت ہو گی تو طالب منزلِ مقصود کی امید کر سکتا ہے۔ کیونکہ محبت ہی ایک وہ خلش ہے جو فراقِ محبوب میں انسان کی اعانت کرتی ہے۔ جب کہ دنیا اس کے سامنے ایک انگوٹھی کے حلقے کی طرح ہوتی ہے۔ یہی وہ نشہ ہے جس کا کوئی اُتار نہیں۔ اور یہی وہ بے تابی ہے جس کے لئے سکون نہیں۔ گویا مبتدی کی پہلی منزل اور طالب کی طلب کی پہلی سیڑھی محبت ہی ہے۔ جب تک شیخ کے لئے تمام محبوبات کو قربان کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے اور سب طرف سے آنکھیں بند کر کے اسی کا نہ ہو رہے تب تک اس کو مقامِ محبت حاصل نہیں ہو گا۔ عشاق نشۂ محبت میں ایسے سرشار ہوتے ہیں کہ انہیں کسی طرف کا ہوش ہی نہیں رہتا اور دنیا کی کسی شے کو محبتِ شیخ پر ترجیح نہیں دے سکتے۔

حکایت - حضرت بابا فریدالدین گنج شکر اجودھنی پاک پٹنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ آپ اپنے شیخ کی خدمت میں تعلیم تقرب الی اللہ کی ابتدائی منازل طے کر رہے تھے۔ اور وہیں قیام بھی رکھا کرتے تھے آپ کے ذمہ شیخ کی ظاہری خدمات میں سے یہ خدمت تھی کہ آدھی رات کو آگ جلائی جائے اور تہجد کے لئے پانی گرم کیا جائے۔ یعنی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ (جو آپ کے شیخ تھے) کے اٹھنے سے قبل پانی گرم تیار ہونا چاہیئے۔ ان دنوں آگ جلانے اور محفوظ رکھنے کا بڑا انتظام و اہتمام کرنا پڑتا تھا اور سالہا سال اپنی ضروریات کے لئے آگ کا ذخیرہ موجود رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ آگ پیدا کرنے اور جلانے کے لئے یہ سہل ترین اسباب و ذرائع نہ تھے جو آج کل ہیں۔ اتفاق سے ایک رات آگ بجھ گئی اور بابا فریدالدین صاحب جو رات کو پانی گرم کرنے کے لئے اٹھے تو آگ کو بجھا ہوا دیکھ کر نہایت مغموم و پریشان ہوئے۔ اور آگ کی تلاش کو خانقاہ سے باہر نکلے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ فاصلے پر آگ جل رہی ہے۔ فوراً وہاں پہنچے۔ دیکھا تو وہ آگ ایک بڑھیا عورت نے جلا رکھی ہے۔ اس کے سامنے جا کر آگ مانگی تو وہ کہنے لگی۔ فریدا! اس آگ کی قیمت آنکھ ہے۔ آنکھ دے دو اور آگ لے جاؤ۔ آپ نے کہا کہ جس آنکھ کی ضرورت ہو فوراً نکال لو۔ اور آگ دے دو۔ کیونکہ حضرت شیخ اٹھنے والے ہیں اور مجھے ان کے لئے وضو کا پانی گرم کرنا ہے۔ اس بڑھیا نے داہنی آنکھ نکال لی اور آگ دیدی۔ حضرت فریدالدین گنج شکر آگ لے آئے۔ پانی گرم کر لیا اور حضرت

شیخ وضو کر کے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت شیخ نے دوستوں میں حضرت بابا فریدالدین صاحب کو یاد فرمایا اور پوچھا کہاں ہیں۔ الغرض حضرت فریدالدین صاحب بلوائے گئے۔ جب آئے تو آنکھ پر پٹی رکھے ہوئے تھے۔ حضرت شیخ نے پوچھا کہ آنکھ کیوں باندھ رکھی ہے۔ پنجابی محاورہ میں عرض کیا کہ آگئی (خراب) ہو گئی ہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ پہلی سے سوائی ہو گئی ہے۔ کھولدو اور تمہاری نسل میں بھی میرا یہ نشان موجود رہے گا۔ ان کی بھی ایک آنکھ بڑی اور ایک چھوٹی ہوگی۔ دنیا دیکھے گی کہ پیر کی خدمت کا صلہ فرید نے کیا پایا۔ جب آنکھ کھولی تو واقعی صحیح سالم اور پہلی سے زیادہ تندرست اور بڑی تھی۔ اور آج تک آپ کی نسل میں یہ کرامت ظاہر ہے کہ ان کی ایک آنکھ بڑی اور ایک چھوٹی ہوتی ہے۔

بعض اہل اللہ نے لکھا ہے کہ شیخ کی محبت گو مجازی ہوتی ہے مگر یہی مجاز حقیقت کا پُل ہے۔ اسی سے حقیقت کے اسرار کھلتے ہیں۔ اسی سے حقیقت کی راہیں نکلتی ہیں۔ اور اسی کے انوار کی ضیا میں منزل پائی جاتی ہے۔ یہ محبت مجازی ہی انسان کو تن بدن کا ہوش نہیں رہنے دیتی۔ حقیقی تو پھر بھی حقیقی ہے۔ اس کی سرشاریوں اور بے باکیوں کا ٹھکانہ ہی کیا ہے۔ مجازی محبت کے لطف و لذت سے قریباً تمام دنیا واقف ہے۔ اور جب اس کا کسی انسان پر دور دَورہ ہو جاتا ہے تو اس کی کرشمہ کاریاں دیوانہ بنا دیتی ہیں۔ اگر ایک مہوش اور زہرہ جبیں کے رخسار آفتابی اور چشم سرمگیں، ہوش ربا و ہوش افگن ثابت ہوتے اور عقل و خرد پر برق خاطف بن کر گرتے ہیں تو جلوۂ محبوب حقیقی کی ضیا، پاشیوں اور اثر انگیزیوں کے متعلق کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جس کے ایک ذرہ میں صد ہزار حسن و جمال پوشیدہ اور ایک تجلّی صفاتی میں لاکھوں طُور خوابیدہ ہیں۔ جو لطف و لذت اور سرشاریاں عشق حقیقی میں مضمر ہیں۔ ان کا حظ اور رمزہ کچھ اہل اللہ ہی اٹھا سکتے ہیں۔ جنہیں اس میخانۂ محبت سے کم از کم ایک آدھ جرعہ ہی نصیب ہو گیا ہو دنیا کی تمام لذتیں ان کی نظروں میں ایک مٹی کا ڈھیلہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ مبارک ہیں وہ دل جو اس تلاش میں نکل کر محو اسرار ہو جاتے ہیں اور بابرکت ہیں وہ آنکھیں جو دیدار و انوار الٰہی سے ابدی ٹھنڈک پا جاتی ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

بشکند دست کہ خم در گردنِ یارے نہ شد
کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نہ شد

محبت شیخ چونکہ محبت حقیقی کا زینہ ہے۔ اس لئے ہر طالب پر فرض ہے کہ پہلے محبتِ شیخ میں انتہا کرے۔ جب فنافی الشیخ کی حیثیت حاصل ہو جائے گی تو یہ محب محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور محبت الٰہی میں قدم اٹھانے کے قابل ہو جائے گا۔ جو طالب شیخ ہی کے میدان مجاز میں ناکارہ رہ جائے وہ اس سے آگے قدم نہیں اٹھا سکتا یہی وجہ تھی کہ حضور علیہ السلام نے ابتدائے محبت کا معیار یہ مقرر فرمایا کہ لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہٖ و والدہٖ والناس اجمعین یعنی تم میں سے اس وقت تک کوئی شخص مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک ماں باپ، اولاد اور اپنی جان و مال اور سب دنیا و مافیہا سے مجھے بہتر نہ سمجھے۔ جب تک یہ درجہ محبت حاصل نہ ہو درویش محبوب حقیقی کی تلاش میں بڑھ نہیں سکتا۔ بعض آوارہ خیال انسان اس محبت کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ پیر پرستی شرک و بدعت ہے۔ یہ درویشی کے مدعی پیر پر ہی معرفت الٰہی کے نشانات تلاش کرتے ہیں اور اسی کے تصور میں خدا کا سراغ لگانے کو سرگرداں رہتے ہیں۔ بھلا ایک بندے پر ظہور حق ہونا اور ذاتِ واحد کا آنا کیونکر معرفت کے معنے کو حل کر سکتا ہے۔ مگر وہ بے راہ رو انسان یہ نہیں سمجھتے کہ اگر وہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے درخت پر اور طور پہاڑ پر جلوہ فرمائی کر سکتا ہے تو ایک مظہر صفات پر اور ایک مقدس انسان پر کیوں ظہور نہیں فرما سکتا۔ جس کی تائید اقبال مرحوم نے یوں کر دی ہے۔ کہ

تو بر نخلِ کلیمے بے محابا شعلہ می ریزی ۔۔۔ تو بر شمع یتیمے صورتِ پروانہ می آئی

شوق حضور غوث الاعظم رض فرماتے ہیں کہ عام شوق اچھی چیز ہے۔ لیکن بہترین شوق وہ ہے جو مشاہدہ کے بعد پیدا ہو اور دیکھنے اور سننے کے بعد بھی اس میں سستی اور سردی نہ آئے۔ صحبت سے زائل اور قرب سے دور نہ ہو بلکہ دیدار و ملاقات کے ساتھ ساتھ ہر لحظہ بڑھتا رہے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ شوق کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے اسباب و محرکات سے پاک ہو جائے یعنی اس سے حظِ نفس مقصود نہ ہو۔ کیونکہ مشاہدہ اسی وقت ہوتا ہے۔ جب شوق حقیقی ہو۔ اور پھر مشاہدہ ہی سے مشاہدے کا شوق بڑھتا چلا جاتا ہے۔

خوف۔ شوق کے ساتھ طالب کے لئے خوف کا ہونا بھی لازمی ہے۔ بعض اوقات طالب شوق کی منزل طے کرتا ہوا اس قدر نڈر اور بے خوف بھی ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی شایانِ شان کلام سے آگے ہاتھ مارنے شروع

کر دیتا ہے اور بہت سی بے ڈھب بولیاں بولنے لگتا ہے۔ جس کا نتیجہ نقصان و دوری و فقدانِ حضوری ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر لحظہ حفظ کلام و مراتب ہونا چاہئے۔

خوف کی کئی قسمیں ہیں:-

۱۔ ایک گنہگاروں کا خوف ہوتا ہے جو عذاب و عتاب کے باعث پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ عابدوں کا خوف ہے جو اس خیال سے ہوتا ہے کہ مبادا ان کی عبادت کا ان کو ثواب نہ ملے یا کم ملے۔ یا عبادت ہی نا معقول و نا مقبول ہو جائے۔

۳۔ عاشقانِ الٰہی کا خوف ہے۔ جنہیں یہ اندیشہ جاں گسل رہتا ہے کہ کہیں دیدارِ جمالِ حقیقی اور لقائے الٰہی کی فائز المرامیاں معدوم یا کم نہ ہو جائیں۔

۴۔ عارفین کا خوف ہے جو سب سے بلند اور سب سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ جو ہر وقت اور ہمیشہ لگا رہتا ہے جس کا باعث عظمت و ہیبتِ الٰہی ہوتی ہے۔ جوں جوں خدائے قدوس کی معرفت بڑھتی اور قربت ہوتی جاتی ہے۔ توں توں ان کے لئے قدرتاً اس پیکرِ کبریائی کی عظمت و ہیبت کے راز کھلتے جاتے ہیں اور اس ہیبت سے از خود خوف پیدا ہوتا جاتا ہے۔ جو لوگ تقرب الی اللہ میں زیادہ قریب ہوتے ہیں وہی خشیت کے مسئلہ میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے بھی ہوتے ہیں۔

تصورِ شیخ چونکہ ابتداء میں تنہا ارادتمند کیلئے ذکر اذکار میں دل لگانا اور بے نشان دوڑ کر مقصود کو پانا ذرہ دشوار ہوتا ہے۔ اور وہ نہیں سمجھ سکتا کہ میری راہ میں کیا کیا خطرات ہیں۔ اور ان میں میرے لئے مفید اور غیر مفید کون کون اور کیا کیا چیزیں ہیں۔ لہٰذا اس کے بہک جانے اور دل چھوڑ جانے کے خیال سے بزرگانِ دین بعیت کے وقت تصورِ شیخ بھی تلقین فرماتے ہیں۔ تاکہ مرید فرمودہ تذکار و اوراد پر مستقیم اور منکشف حالات پر فہیم رہے۔ اور یہ نہایت موثر اور سہل ترین راہ ہے۔ فقیر کے سلسلہ عالیہ سہروردیہ کے علاوہ حضرات نقشبندیہ بھی کمال پابندی کے ساتھ اس کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور اس کا نام شغل رابطہ رکھتے ہیں۔ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک اس کی تاکید فرمائی ہے کہ اس کے بغیر (ذکر بے رابطہ) موصل الی اللہ ہی نہیں ہے۔ اور رابطہ بغیر ذکر موصل ہو سکتا ہے۔ اور اس کی دلیل میں بعض

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ قول پیش فرماتے ہیں کہ بعض صحابہ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ کانی انظرالی وبیص ساقیہ - گویا میں آپ کی پنڈلیوں کی چمک دیکھ رہا ہوں - اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ ارادتمند جس وقت ذکر کرنے بیٹھے اس وقت شیخ کی صورت کو اپنے روبرو خیال کرے - اس سے وہ وساوس شیطانیہ وخطرات نفسانیہ سے محفوظ رہے گا - اور یہ تصوّر اس کو یک سوئی کے لئے تجلی گاہ کا کام دیگا

بعض حضرات نے رابطہ سے مراد تصوّرِ شیخ نہیں بلکہ محبتِ شیخ مراد لی ہے اور وہ فرماتے ہیں - کہ تصوّر شیخ کا ثبوت حدیث شریف اور ارشادات متقدمین میں نہیں ہے - لہٰذا محض محبت شیخ بھی طالب کو کامیاب بنا سکتی ہے - گویا تصوّر بے ثبوت و بے اصل چیز ہے - جس سے پرہیز بہتر ہے - اور بعض لوگ تو اس کو شرک سے تعبیر کرتے ہیں - جو حد سے بڑھنا ہے - اور تصوّر شیخ تو درکنار رہا بعض وہ لوگ پیدا ہو گئے ہیں - جن کے نزدیک تصوّر حضور رسول علیہ السلام اور تصوّر انوارِ ذات الٰہی بھی نعوذ باللہ گمراہی ہے نام نہاد صوفی اسدالرحمٰن صاحب بھوپالی ہی کو لے لیجئے - اپنی کتاب کے صہ۸ پر لکھتا ہے - کہ فنا فی الشیخ اور فنا فی الرسول کھلا ہؤا شرک ہے - اور جن کو مشاہدۂ ذات ہو رہا ہے، یہ لوگ درحقیقت شیطان کی چھپٹ میں آ گئے ہیں - پھر صہ۸۳ پر لکھتا ہے کہ حال اور کیفیات بھی سب شیطانی تصرفات کا نتیجہ ہیں - لاحول ولا قوۃ الا باللہ - ان لوگوں کا یہ وہم شاید اس خیال سے ہو کہ اس میں پرستش کا شبہ ہو سکتا ہے - مگر یہ صحیح نہیں، نہ یہاں پرستش کی نیت ہوتی ہے اور نہ ہی غرض - بلکہ تصوّر شیخ کا مقصد وہی ہے جو اوپر ذکر ہؤا ہے - اور اس کے بہت سے فوائد ہیں -

۱ - وظیفہ کے وقت میں تصور رکھنے سے یکسوئی ہو جاتی ہے - اور خیالات باطلہ اور اوہام کا ذبہ نہیں آتے، جیسے کہ نماز میں حضور قلب یا رو بقبلہ ہونے کی یہی غرض ہے - جس طرح کعبہ مسجود علیہ ہے مسجودلہٗ نہیں بنتا - یعنی اس کی طرف سجدہ کیا جاتا ہے - اس کو نہیں کیا جاتا - اسی طرح وظیفہ کرتے وقت تصور شیخ سے پرستش مقصود نہیں - بلکہ مقصود کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے - اسی یک سوئی کے لئے تو موسیٰ علیہ السلام کو حصول معرفت کے میدان میں رَبِّ اَرِنِی کا جواب دیتے ہوئے اُنظر الی الجبل فرمایا گیا تھا - تاکہ بغیر تعین جہت موسیٰ علیہ السلام دیدار کے لئے متردد نہ ہوں

اوپر نیچے، دائیں بائیں -مشرق مغرب، شمال جنوب - آسمان، زمین کہاں سے ہوگا اور کیونکر ہوگا یکسوئی کے لئے پتھر کو تجلی گاہ فرما کر اور پہاڑ پر متوجہ کر کے پھر تجلی فرمائی - حالانکہ بغیر اس کے بھی وہ تجلی ممکن تھی اس سے پتھر تجلّی گاہ قرار پاتا ہے - نہ کہ حقیقت جواب رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْكَ - پھر جب موسیٰ علیہ السلام خدا کے اور اپنے درمیان ایک پتھر یعنی چوبی تجلی گاہ پیدا ہو جانے میں حق بجانب ہیں - تو یہ رابطہ یعنی تصورِ شیخ کیوں حرام ہو جائے گا -

نماز میں حضوری کے متعلق حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں - کہ جب نمازی التحیات میں درود پڑھنے لگے تو یوں کرے فَاَحْضِرْ فِیْ قَلْبِكَ النَّبِیَّ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَشَخْصَهُ الْكَرِیْمَ ثُمَّ تَقُوْلُ مِنْ بَعْدِ ذَالِكَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ یعنی پہلے نبی کریم علیہ الصلوات والتسلیم کو تصور میں حاضر کر پھر خوب تشخیص و غور سے کام لے کہ حضور علیہ السلام ہی ہیں - پھر جب پتہ چل جائے کہ حضور ہی ہیں - تو پھر درود و سلام بھیج - اس سے معلوم ہو گیا کہ اگر تصور سے نماز فاسد ہو جاتی یا شرک ہوتا تو امام غزالیؒ جیسا محقق اور حجۃ الاسلام اس تصورِ نبی علیہ السلام کی ترغیب نہ دیتا اور ایسا کرنا شریعت کیخلاف سمجھتا

۲ - تصورِ شیخ کا یہ بھی فائدہ ہے کہ شیخ کی حضوری کے لئے غیبت میں تصور بھی طالب طریقت و حقیقت کو وہی کام دیتا ہے جو شیخ کی حاضری میں ہوتا ہے -

۳ - بعض اوقات تصورِ شیخ سے ہی بہت سی مناہیات سے طالب باز رہتا ہے - اور وہی اس کو بُرہانِ ربّی ہو جاتا ہے - اور اس پر بزرگانِ دین کے اس حد تک واقعات شاہد ہیں - جن کی تفصیل یہاں پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہو گا -

۴ - کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تصورِ شیخ سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں اور دنیوی معاملات میں ارادتمند ایسا کامیاب ہو جاتا ہے جو کامیابی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی -

۵ - بعض فقراء نے اپنا تجربہ لکھا ہے کہ نسبت ارادت کے نامکمل ارادتمندوں کو تصور ہی کی طفیل شیخ کے دنیا سے پردہ پا جانے کے بعد وہ راز کھلتے ہیں اور اگلی منازل کے سبق ملتے ہیں، جو

کسی دوسرے پیر سے مل کر حاصل کرنے سے بدرجہا بہتر و کامیاب بنانے والے ثابت ہوئے ہیں۔

۶۔ اگر غور کیا جائے تو تصوّر ہی محبت و تنفر کا بنیادی پتھر ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو نہ کامل کامل نظر آئے اور نہ ناقص ناقص۔ نہ بھلا بھلا اور نہ بُرا بُرا سمجھ میں آ سکے۔ وہ حضرات جن کی تحقیق یہ ہے کہ نماز میں گھوڑے، گدھے، بلی، بندر کا تصور آجائے تو نماز نہیں ٹوٹتی اور حضور علیہ السلام کا تصوّر آجائے تو ٹوٹ جاتی ہے۔ ان کو یہ خیال فرمانا چاہئے کہ نماز ادا کرنے کے لئے آپ ہی تو فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کو نماز میں سمجھ کر پڑھو۔ اور جب سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ تو الحمد سے لے کر آخیر سورۂ ناس تک تمام کائنات کا تصور سامنے آجاتا ہے۔ جس میں نبی، خدا، ملائکہ، شیطان، مخالف و مطابق جماعتیں، زندے مردے غرضیکہ ارض وسما وما فیہا تمام شامل ہوتے ہیں۔ پھر اس کا کیا علاج ہوگا۔ مثلاً اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ والی آیات پڑھی جائیں تو کہیں یعقوب علیہ السلام چارپائی پر بیمار نظر آتے ہیں۔ تو کہیں ان کے صاحبزادے پاس کھڑے اقرارِ توحید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سورۂ یوسف پڑھیں تو تمام کا تمام نقشہ جو حضرت یوسف علیہ السلام سے منسوب ہے۔ کہیں بیٹوں کا باپ سے مکالمہ، کہیں بھائیوں کی یوسف سے بے مہری، کہیں یوسفؑ کا کنوئیں میں گرا ہوا نظر آنا۔ کہیں تاجروں کا یوسف کو خریدنا۔ کہیں زلیخا اور اس کا محل۔ کہیں طلب مطلب و جلب منفعت کا قصہ۔ کہیں جیل جانے کا منظر۔ کہیں مصر میں بھائیوں کی حاضری اور یوسف علیہ السلام کا تختِ مصر پر متمکن ہونا۔ کہیں خواب کی صداقت کا ظہور اور ماں باپ و بھائیوں سے سجدۂ تعظیمی کا عمل سب کچھ سامنے آجاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس تمام قرآن کریم سمجھ کر پڑھنے سے یہی ہوگا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ یہ تصوّر نہیں تو کیا ہے۔ اور تصور شیخ ناجائز ہے تو اس کے عدم جواز کی کونسی دلیل ہوگی۔

۷۔ تصورِ شیخ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام بھی بعض اوقات مبتدی کو اسی کی بدولت طلب فرما لیتے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ اس کی برکت سے مرید دربارِ رسالت میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے اس پر معرفت نبوت کا دروازہ کھلتا ہے اور یہی اس کے انجام کار کا وسیلہ ہوتا ہے۔

۸۔ مرید مبتدی تصوّر کی بدولت پیر کی حضوری میں مؤدب رہتا ہے اور غیبت میں

بصورت مراقبہ حاضر ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے۔

۹۔ تصور شیخ کی برکت سے شیخ کے جذبہ کی صفت مرید میں اکثر اثر کر جاتی ہے۔ اور یہاں تک ہوتا ہے۔ کہ جہاں شیخ کی نگاہ ہو وہاں اس کی بھی کام کرنے لگتی ہے۔ اور ارادت کا اثر اور اس کی معتینہ کیفیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

مراقبہ مراقبہ کا معنی ہے انتظار کرنا۔ مگر اعمال تصوف یا اصطلاح فقراء میں گردن جھکا کر قلبی نورانی کوائف کے منتظر ہونے کا نام ہے اور بعض محققین نے اس کے معنی ایک دوسرے کو دیکھنے اور اپنی توجہ قلبی کو رقیب کی جانب ٹھہرنے کے بھی کیئے ہیں۔ رقیب اللہ کریم کے ناموں سے ایک نام بھی ہے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ مراقبہ اسی قلبی حالت کا نام ہے۔ جو ایک قسم کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس حالت سے کچھ اعمال اعضا میں اور کچھ قلب میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اور یہ حالت دو قسم کی ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ ہر وقت رقیب قلب کو تاکنا اور اس کی طرف مشغول و متوجہ رہنا۔ اور ہمیشہ اسی کو ملاحظہ کرنا ہے۔

دوئم یہ کہ اسماء الٰہی میں سے کسی اسم کے معنی یا کسی لفظ یا آیت قرآنی یا عبارت غیر قرآنی کے معنوں میں دلگے خیال و تصور و توجہ کو ایسا متوجہ کرنا کہ وہی حالت اس کے قلب پر ایسی طاری ہو کہ وہ خود معنی بن جائے اور اپنی خبر بھی نہ رہے۔ اور جس معرفت سے یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم جلشانہٗ کو اپنے قلب میں خفیہ و ظاہر اقوال اور باطن کے احوال کا پورا عالم جاننا اور اپنے جمیع اعمال کے پورے اکتساب پر زبردست رقیب سمجھنا۔ کیونکہ اہلِ قلوب اس پر ایسے عیاں ہوتے ہیں جیسے نصف النہار کا سورج بلکہ ہر ذرہ کی حرکت و حقیقت اس سے ہر لحظہ پوشیدہ نہیں۔

حضرت خواجہ مشکلکشا بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف باللہ جن اسباب و علائق سے حق تعالیٰ کی راہ پاتا ہے ان میں سے ایک مراقبہ بھی ہے۔ جس کو اہل اللہ نے یوں بیان فرمایا ہے۔ کہ وَالْمُرَاقَبَۃُ نِسْیَانُ رُؤْیَۃِ الْمَخْلُوْقِ بِدَوَامِ النَّظَرِ اِلَی الْخَالِقِ۔ یعنی مخلوق کی رویت کو بھول کر ہمیشہ خالق کی طرف دیکھنا مراقبہ کہلاتا ہے۔

مولانا حمید الدین شاشی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مراقبہ درحقیقت انتظار ہے اور مراقبہ کی حقیقت اسی انتظار سے ہے کہ نہایت میسر ہو۔ ایسے انتظار کی تحقیق کے بعد کہ جس کا ظہور غلبہ محبت کی وجہ سے ہے۔ اس انتظار

کے حصول کا نام مراقبہ ہے۔ اور اس انتظار کے سوائے اور کوئی رہبر نہیں۔

خواجہ علاؤ الدین عطار فرماتے ہیں کہ مراقبہ کے طریق میں کوشش کرنے سے وزارت اور ملک ملکوت کے تصرف کرنے کے مرتبہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور دلوں پر جھانکنا اور مہربانی کی نگاہ سے دیکھنا باطن کو روشن کر دینا۔ صرف مراقبہ کا کام ہے۔ ہمیشہ مراقبہ کرنے سے تسلی خاطر اور دلوں کا قبول کرنا حاصل ہوا کرتا ہے۔ اس مطلب کو جمع قبول کہتے ہیں۔

یاد رہے کہ کمال مراقبہ کا عمل دل کی پابندی پر منحصر ہے۔ جب دل متوجہ الی اللہ یا غیر اللہ ہوتا ہے۔ تو سب اعضاء بھی اسی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب دل ہی کے تابع ہیں۔ اور نتیجہ مراقبہ کا یہ ہے کہ تصور محبوب میں ایسا مستغرق ہو کہ کسی شے کی بھی خبر نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کو فرمایا راقب اللہ۔ تو اس نے عرض کیا کہ اس کے مفہوم اور معانی سے بھی آگاہ فرما دیجئے۔ میں نہیں سمجھ سکا۔ آپ نے فرمایا کہ ہر لحظہ اسی طرح پر رہو کہ تم خدا کو دیکھتے ہو۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طور پر کر کہ گویا تو اس کو دیکھتا ہے پس اگر تجھ کو اس کے دیکھ سکنے والی بات اور منزل حاصل نہ ہو تو اتنا ہی سمجھ کہ وہ تجھ کو دیکھتا ہے۔ اس حدیث میں پہلا پہلا مقام (کہ تو اس کو دیکھتا ہے) مشاہدہ ہے اور دوسرا مقام مراقبہ۔ پس درویش کو ہر وقت اسی کیفیت میں رہنا چاہئے کہ خدا مجھ کو دیکھتا ہے۔ اور میں اس کو دیکھتا ہوں۔ اگر اس حالت میں ہمیشگی نہ ہو سکے تو عبادت کے مواقعات پر تو پابندی لازمی ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ہر نماز و ذکر سے فارغ ہو کر مراقبہ کرنا درویش کی حقیقی فلاح کا موجب بن جاتا ہے۔

بعض حضرات نقشبندیہ فرماتے ہیں کہ اصل مراقبہ یہ ہے کہ طالب اپنے آپ کو عاجز اور محتاج سمجھ کر اس فیاض کی بارگاہ سے فیض کا انتظار کرے۔ اور کسی لطیفہ پر آتا ہوا اس کو خیال کرے اور نگاہ دل کی ٹکٹکی ایسی بندھ جائے جیسے بلی چوہے کی انتظار میں اس کے بل پر بغیر حس و حرکت کے بیٹھتی ہے۔ یا بگلا پانی کے کنارے پر مچھلی کے تصور میں ایسا محو ہو کر بیٹھتا ہے کہ اس کے جسم کی حرکت تو درکنار اس کی مژگاں کو بھی جنبش نہیں ہوتی اور نگاہ تک نہیں ہلتی۔ اس مراقبہ کے لئے وہ یہ طریق ذکر کرتے ہیں کہ اول اپنے قلب کو حضور علیہ السلام کے قلب مبارک کے

روبرو خیال کرکے بارگاہ الٰہی سے التجا کرے کہ الٰہی تیری تجلّیٔ افعال کا فیض جو قلب مبارک حضور محبوب خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعہ سے حضرت آدم علیہ السلام کے قلب میں پہنچا ہے وہ اس عاجز کے قلب میں بھی پہنچا اور اسی انتظار میں محو ہو جائے۔ بفضل اللہ تعالیٰ فنائے قلبی تجلّیٔ افعال میں ہو گی۔ یعنی یہ حالت طاری ہو گی کہ مراقب اپنے اور تمام جہان کے افعال کو اسی وحدہٗ لاشریک کا فعل جاننے لگے گا۔ اور کسی کا فعل اس کی نظر میں نہ رہے گا۔ اور ماسوائے اللہ کی محبت کے کوئی خطرہ بھی دل میں نہ آئے گا۔

قادری حضرات فرماتے ہیں کہ کوئی ایک آیت قرآنی یا اسمار الحسنیٰ سے کوئی اسم سامنے رکھ کر زبان تصوّر سے پڑھے اور اس کے معنی کی طرف متوجہ ہو۔ اور اس اسم کے مفہوم میں اس طرح مستغرق ہو کہ کوئی دوسری چیز اس کے درمیان میں حائل نہ رہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ کہ حضرات صوفیائے کرام و اولیائے عظام ہر چہار سلسلہ نے اپنے اپنے طریق کار کے ماتحت اقسام مراقبہ میں سے زیادہ بیان فرمائے ہیں۔ جو فقیر مؤلف کو بھی بذریعہ بزرگان طریقت بصورت تقریر و تحریر پہنچی ہیں۔ ان میں سے اول وہ ہیں جن کو حضرات قادریہ مراقبات خمسہ لکھتے ہیں۔ یعنی:-

۱۔ مراقبۂ قدرت جو اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر　　اللہ قادری　　پر کیا جاتا ہے

۲۔ مراقبۂ معیت جو وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ　　اللہ معی　　پر کیا جاتا ہے

۳۔ مراقبۂ شہادت جو فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ　　اللہ شاہدی　　پر کیا جاتا ہے

۴۔ مراقبۂ نصرت جو اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ　　اللہ ناصری　　پر کیا جاتا ہے

۵۔ مراقبۂ حضوری جو وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْط　　اللہ حاضری　　پر کیا جاتا ہے

۶۔ مراقبۂ انابت جو بلفظ اَنا　بشمار اکیس بار ہوتا ہے۔

دوئم وہ مراقبات ہیں جو عام بزرگانِ دین کے عمل سے ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً

۷۔ مراقبۂ نوری جو اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ　　پر کیا جاتا ہے

۸۔ مراقبۂ فناء۔ جو کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ　　پر کیا جاتا ہے

۹۔ مراقبۂ معیت جو وَھُوَ مَعَکُمْ　　پر کیا جاتا ہے

۱۰- مراقبہ ہمہ اوست جو هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ پر کیا جاتا ہے۔

۱۱- مراقبہ قدس جو حجرۂ تاریک میں چشم کشادہ سے ایک جگہ نظر جما کر اور دل میں اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى کا تصوّر رکھ کر کیا جاتا ہے۔

۱۲- مراقبہ ہفت گام پنج مراتب۔ ہفت گام سے مراد سات صفات ذاتی۔ یعنی حیات، علم، ارادہ قدرت، سمع، بصر کلام ہیں اور پنج مراتب ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت، ہاہوت ہیں اور ان پنج مراتب کو بہ ارشاد کاملین عوالم خمسہ (پنج عوالم) بھی بیان فرمایا گیا ہے۔

ا- **ہاہوت** - وہ عالم ہے جہاں نہ اپنی خبر اور نہ اس بے خبری کی خبر

ب- **لاہوت** - جہاں اپنی خبر ہوتی ہے اور الوہیت کا دعویٰ

ج- **جبروت** - جہاں اپنے وجود سے بالتفصیل شناسائی ہوتی ہے۔

د- **ملکوت** - یہاں اپنی تسبیح و تہلیل میں آپ مشغول ہوتا ہے۔

ہ- **ناسوت** - یہی عالم ظاہر جہاں ہر مظہر میں خود ظاہر ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جب خواہشات میں پڑا ناسوت میں ہے۔ جب اپنی حمد و ثنا میں مشغول ہوا ملکوت میں ہے۔ پھر جب اپنے آپ کو پہچانا جبروت میں ہے۔ اور جب اِنّی و آخنا کا نعرہ مارا لاہوت میں ہے۔ اور جب سب حالتیں گم ہیں یعنی غیب مطلق تو ہاہوت میں ہے۔ یا دوسری صورت میں یوں خیال کیجئے کہ ہاہوت، لاہوت کا اور لاہوت جبروت کا اور جبروت ملکوت کا اور ملکوت ناسوت کا باطن ہے۔ اور یہ مراتب جہات سے پاک ہیں۔ نہ اوپر نہ نیچے، نہ دائیں نہ بائیں، نہ آگے نہ پیچھے۔ اور یہاں زمانہ کو بھی دخل نہیں۔ بلکہ یہ مراتب کی تقدیم و تاخیر محض افہام و تفہیم (سمجھنے، سمجھانے) کا مشغلہ ہے۔ ورنہ ذاتِ حق جل وعلا شانہٗ سب سے پاک و منزہ و مبرا ہے۔ اور اَلْاٰنَ كَمَا كَانَ یعنی جیسی پہلے تھی ویسے ہی اب بھی ہے۔ اور ایسے ہی ہمیشہ رہے گی۔ پھر ہر مرتبہ میں یہ تصوّر کرے کہ وہ ذات پاک بحیاتِ خود حیّ ہے۔ بعلمِ خود علیم ہے۔ بارادتِ خود مرید ہے۔ بقدرت خود قدیر ہے۔ بسمع خود سمیع ہے، ببصر خود بصیر ہے۔ اور بکلامِ خود کلیم ہے۔

۱۳- مراقبہ بحری۔ اپنے آپ کو بحر ذات سمجھے اور باقی اشیاء حباب جو اس میں فنا ہو رہے ہیں۔

١٤- مراقبہ قرب نوافل - جس میں - سالک یہ تصور کرتا ہے کہ میں فاعل ہوں اور خدائے واحد آلہ ہے -

١٥- مراقبہ قرب فرائض یعنی خدا فاعل ہے اور بندہ اس کا آلہ ہے -

١٦- مراقبہ عین جو نہ قرب نوافل اور نہ قرب فرائض بلکہ عین ہے - یعنی وہ خود ہی - حیّ، سمیع، بصیر، علیم، وغیرہ سب کچھ ہے -

ان مراقبات کے علاوہ فقیر کے شیخ حضرت قبلہ عالم شیخ الاعظم پیر مکرم زبدۃ الاصفیاء قدوۃ الاولیاء متخلق باخلاق اللہ ذوالکرم والمجد مولانا خواجہ غلام محمد سہروردی مدظلہ کلمہ شریف تمجید کے ماتحت چار مراقبے اور تعلیم فرمایا کرتے تھے -

تسبیحی - تحمیدی - تہلیلی - تکبیری - جنکی تشریح اس طرح پر ہے -

١٧- مراقبہ تسبیحی - جو سبحان اللہ کے تصوّر پر کدورت نفس کی پاکیزگی کے لئے کیا جاتا ہے -

١٨- مراقبہ تحمیدی - جو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کی حقیقت کو محمود باللہ بننے کے لئے کیا جاتا ہے -

١٩- مراقبہ تہلیلی - جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے تصور پر نفی اثبات کے ورود کے لئے کیا جاتا ہے -

٢٠- مراقبہ تکبیری جو اَللّٰہُ اَکْبَرُ کے تصوّر پر حجاب کبریائی کے عبور کے لئے کیا جاتا ہے -

سالکان راہ کو عملی کیفیت معلوم کرنے کے لئے اہل اللہ حضرات کے بابرکت آستانوں پر بوسہ زن ہونا چاہئے - کیونکہ وہی حضرات اس راہ کی باریکیوں کو سمجھنے والے اور وہی قلب و روح کی تاریکیوں کو دور کرنے والے ہوتے ہیں -

مُبادیات کے نتائج

گذشتہ بحث میں یہ امر واضح ہوگیا ہے کہ طالب کے لئے چند اعمال واشغال واذکار و آثار ایسے ہیں - جن پر عمل پیرا ہوکر وہ معرفتِ الٰہی کے لئے اپنے آپ کو تیار کر سکتا ہے - اور مبادیات میں اس کا علم وعمل اس پر یہ ثابت کردیتا ہے کہ شریعت اُس کا لباس ہے اور طریقت جسم - حقیقت روح اور معرفت ذاتِ حق - یعنی شریعت اقوال وافعال طریقت اخلاق واحوال - حقیقت صفات وذات اور معرفت علم ویقین ہے - اور اس کے بغیر وہ کسی کام کا نہیں کیونکہ جہاں سے اس نے ظاہری زندگی سنوارنے کا درس لیا ہے - وہاں ہی سے اس کو شناختِ حق کا بھی سبق ملے گا۔

یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کے ظاہر کا معالج ایک ہو اور باطن کا دوسرا - یہ سب کچھ ایک اور صرف ایک ہی ذات میں مجتمع ہے - جس کا نام نامی واسم گرامی حضور سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے - کیونکہ حضور ہی نے تعلیم حصولِ ہفت اقلیم فرمائی ہے - اور حضور ہی نے بقا باللہ کی منزل سمجھائی ہے - اس ضمن میں ایک ہی حدیث تمام وکمال تخیلات ومعتقدات کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہے - یعنی الشریعۃ اقوالی - الطریقۃ افعالی والحقیقۃ احوالی والمعرفۃ اسراری - ترجمہ - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ شریعت میرے قول اور طریقت میرے فعل اور حقیقت میرے حال اور معرفت میرے بھید کے پالینے کا نام ہے - گویا چاروں کیفیتوں کی ابتدا بھی اور انتہا بھی حضور ہی کی ذاتِ مقدس ہے - جسے معرفت نبوت حاصل نہیں اسے معرفت الٰہی سے دور کا بھی تعلق نہیں ہو سکتا۔

صوفیاء نے لکھا ہے کہ طالب جب اتباع شریعت وطریقت میں یہاں تک پہنچ جائے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان کامل رکھے اور حضور علیہ السلام کو بھی نبئ برحق سید الانبیا وخاتم المرسلین جانے، اپنی ایذا کے بدلے میں کسی کو ایذا نہ دے - محرمات سے محترز رہے - مشتبہات میں توقف کرے - کسی کی پردہ دری کو کام میں نہ لائے، تاکہ وہ ذلیل ورسوا ہو - کسی کو برا نہ کہے - امانت میں خیانت نہ کرے - غیبت سے بچے - کم سخن بنے - اور قہقہہ نہ مارے

جھگڑوں سے پرہیز کرے۔ اپنے نفس کو ذلیل سمجھے۔ فضول باتوں اور نامعقول مجلسوں سے اجتناب کرے۔ غافل کو نصیحت اور بدعمل کو ہدایت دے۔ عبادات و معاملات میں جو بات معلوم نہ ہو اس کے جاننے کی سعی کرے۔ عباداتِ الٰہی فرضی و نفلی میں زیادہ مصروف رہے۔ روزے زیادہ رکھے۔ اپنے اذکار و اشغال کے لئے پابندئ وقت لازم پکڑے۔ ذریعہ معاش میں ہر لحہ پاکیزگی و حلال کو ملحوظ رکھے۔ راست بازی کا شیوہ اختیار کرے۔ غریبوں کا حامی اور یتیموں کا مددگار رہے۔ بڑوں کی تعظیم کرے۔ اور چھوٹوں سے شفقت کے ساتھ پیش آئے۔ افشائے راز نہ کرے۔ بغض و حسد کی خو سے علیحدہ رہے۔ صابر و شاکر و قانع و حلیم بنے۔ غربا سے سلوک، امرا سے پرہیز اور مساکین کی خدمت کرے ہمسایوں اور اقارب کے حقوق کو نگاہ رکھے تو اس کے لئے معرفت الٰہی کی اہلیت کا امکان ہو سکتا ہے۔ اور اس پر وہ کیفیتیں کھلتی ہیں۔ جن کی اہل اللہ متقدمین و متاخرین رحمہم اللہ تعالیٰ نے نشان دہی کی ہے۔ مثلاً

اخلاق و علم اس کی ادنیٰ سی اخلاقی حالت یہ ہوگی۔ کہ ہر غلام و آقا، راعی و رعایا اس کی تعظیم و توقیر کو فخر سمجھیں گے امراء و غربا، بندۂ بے دام ہوں گے۔ ہم صحبت و ہم مجلس ہر ایک یہی خیال کریگا کہ اس کی عنایت مجھ پر سب سے زیادہ ہے۔ قرابت دار اس کے ممنونِ احسان اور ہمسائے اس کی تعریف میں رطب اللسان رہینگے نذرانوں اور تحفوں پر اس کی نظر نہ ہوگی۔ اپنی ذات کی وجہ سے کسی سے ناراض نہ ہوگا۔ کسی بات میں خدا کا نام پاک رکھ کر اس کے سامنے پیش کی جائے تو سو فیصدی یقین کرے گا۔ خدا کے حکموں میں سخت گیر اور نرمی سے سمجھانے والا ہوگا۔ سائل کی ہر حاجت کو نگاہ رکھے گا۔ اور حتی الامکان پورا کرے گا۔ فحش اور بیہودہ کلام پر پرہیزگار ہوگا۔ غرضیکہ خوش اخلاقی، خندہ روئی، دردمندی، رقیق القلبی، رافت و رحمت، کریم النفسی، عالی ہمتی، بلند حوصلگی، خوش مزاجی۔ وعدہ وفائی، عہد کی پختگی اور حبًا لِلّٰہِ و بغضًا لِلّٰہِ کا مجسمہ ہوگا۔ علمِ ظاہری و باطنی کا حامل ہونا اس کی پہلی شرط ہوگی۔ کیونکہ جاہل عابد کے تمام کام سنورنے کی بجائے زیادہ بگڑتے ہیں۔ تنہائی اور عزلت گزینی بھی علم ہی کے بعد موثر ہو سکتی ہے۔ جب تک چراغ علم و شریعت کی روشنی میں عبادت نہ ہو چنداں کیف انگیز نہیں ہوتی۔ بعض درویش ظاہری علم سے گو بے بہرہ ہوتے ہیں مگر اتباعِ شریعت و اتباعِ شیخ حاملِ شریعت سے مولا کریم ان کو وہ علمِ لدنی عطا فرما دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا چراغ طریقت کسی حالت میں بھی گل نہیں ہوتا۔ اور ان کا نفس ان کی غلامی میں مغلوب و ساکن ہو جاتا ہے۔

تفکّر

اللہ تعالیٰ اپنے مومن اور سعادتمند بندوں کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ وُہ زمین وآسمان کی پیدائش میں تفکر کرتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ سطح عالم کی ہر شئے اپنے خالق کا پتہ دے رہی ہے۔ اپنے مستقر پر قائم ہے اور اسکی قدرت وصنعت کی مظہر ہے تو پکار اٹھتے ہیں کہ ہمارے پروردگار تو نے جہان کی کوئی چیز بیکار نہیں پیدا فرمائی اور وہ اسی طرح اپنے معبود کی معرفت حاصل کر کے اپنے ایمانوں کو مضبوط کر کے جلا دیتے ہیں

تدبّر و تفکر ایمان کی جان اور عبادت کی روح ہے۔ اس لئے درویش کو لازم ہے کہ معرفتِ الٰہی میں تفکر کو بہت زیادہ کام میں لائے۔ کیونکہ تفکّر ہی معرفت الٰہی کا زینہ ہے۔ تفکّر کے معنی کسی کام یا امر یا شے یا لفظ یا عبادت یا کلام میں غور و تامل اور خوض وفکر کرنے کے ہیں۔ اور اذکار و اشغال اور مراقبات کے بعد تفکر ہی کا مرتبہ ہے۔ یعنی جب آئینۂ دل اذکار و اشغال سے مصفّا ہو جاتا ہے تو کاملین ہمیشہ تفکّر میں مشغول ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس میں عجیب ترین نشانات و اسرارِ الٰہی کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لئے مولا کریم نے بھی اپنی کتاب میں عبرت وتدبر اور تذکیر وتفکّر کی دعوت وترغیب فرمائی ہے۔ اور آنحضرت سرورِ کائنات مفخرِ موجودات احمد مجتبےٰ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بھی فضیلت تفکر کو پُر زور ارشادات میں بیان فرما کر بڑے شد و مد سے اس کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ اور کاملین تو اس کے ان الفاظ میں قائل ہیں۔ تَفَکُّرُ سَاعَۃٍ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِ الثَّقَلَیْنِ۔ کیونکہ اس سے توحید ذاتی وکمال وحدتِ حقیقی کا ظہور پورے طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السّلام پر جب یہ آیت نازل ہوئی۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ تو فرمایا خرابی ہو اس کی جو اس آیت کو پڑھے اور فکر نہ کرے۔ ایک حدیث شریف میں ہے اُعْطُوْ اَعْیُنَکُمْ حَقَّھَا مِنَ الْعِبَادَۃِ یعنی اپنی آنکھوں کو عبادت میں ان کا حصہ دو۔ کسی نے عرض کیا کہ آنکھوں کو عبادت میں کیا حصہ ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ کلامِ الٰہی میں نظر وفکر کرنا۔ اور سیدنا حضرت عیسےٰ علیہ السّلام سے کسی نے دریافت کیا کہ اس وقت آپ کا کوئی ثانی بھی دنیا میں ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ ہاں وہ انسان میرا ثانی ہے جس کی گفتگو ذکر ہو اور سکوت فکر اور نظر عبرت ہو۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے۔ تَفَکُّرُ سَاعَۃٍ خَیْرٌ مِّنْ عِبَادَۃِ السَّنَتَیْنِ یعنی ایک ساعت کا فکر دو سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ سورہ روم میں ارشاد ہے۔ اَوَلَمْ

يَتَفَكَّرُوْا فِىْ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ یعنی کیا انہوں نے غور نہیں کیا اپنے دل میں کہ اللہ نے انہیں پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ۔ مگر ساتھ حقیقت و تدبیر کے ۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ جس کے کلام میں حکمت نہ ہو وہ لغو ہے ۔ اور جس کا سکوت فکر نہ ہو وہ سہو ہے ۔ اور جس کی نگاہ عبرت کے لئے نہ ہو وہ لعب و لہو ہے ۔

حضرت ابو سلیمان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں دنیا کے لئے فکر کرنا آخرت کی آڑ ہے اور اولیاء اللہ کے حق میں عذاب اور آخرت میں فکر کرنا مورث حکمت اور دلوں کو زندہ کرنا ہے ۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اہلِ عقل ہمیشہ ذکر سے فکر کے عادی ہوا کرتے ہیں ۔ اور فکر سے ذکر کے یہاں تک کہ ان کے دل گویا ہو جاتے ہیں اور اسرار و حکمت میں بولنے لگتے ہیں ۔

حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب سے اشرف و اعلیٰ مجلس وہ ہے جو توحید کے میدان میں فکر کے ساتھ بیٹھ کر معرفت کی ہوا کھائے ۔ اور جام محبت دریائے اتحاد سے نوش کرے اور اللہ تعالیٰ پر حسن ظن کے ساتھ نظر کرے ۔ خوش حال ہے وہ جس کو رب العزت نے یہ نصیب فرمایا ہے ۔

حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ تفکّر دو معرفتوں کو دل میں موجود کر کے تیسری معرفت کے حاصل کرنے کا نام ہے ۔ مثلاً کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ بہ نسبت دنیا کے آخرت اختیار کرنا کیونکر بہتر ہے تو اس کے دو طریق ہیں ۔ ایک یہ کہ کسی اپنے بزرگ سے سُنے کہ بہ نسبت دُنیا کے آخرت بہتر ہے ۔ اور سنتے ہی اس کو سچا جان کر بغیر اس کے کہ حقیقت امر پر اس کی بصیرت کچھ کارگر ہوئی ہو یقین کرے ۔ اور اس کے کہنے پر صرف آخرت کی بہتری کا قائل ہو جائے ۔ دوسرے یہ کہ پہلے اس بات کا علم ہو کہ پائدار شے کا اختیار کرنا بہتر ہے ۔ اور پھر اس کا علم ہو کہ دنیا سے آخرت بہتر ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ اس تیسری بات کو معلوم کرنا بغیر پہلی دو معرفتوں کے غیر ممکن ہے ۔ پس دل میں پہلی دو معرفتوں کا موجود کرنا تیسری معرفت تک پہنچنے کے لئے تفکّر کہلائے گا ۔ پھر فرمایا کہ اس تفکر کا فائدہ یہ ہے کہ علم بڑھتا جاتا ہے اور جو معرفت پہلے حاصل نہیں ہوتی وہ ہو جاتی ہے اور اس تیسری معرفت کا حاصل کرنا پانچ مدارج پر منقسم ہے ۔

اوّل تذکر : یعنی دل میں دو معرفتوں کا جمع کرنا۔

دوئم تفکر : یعنی ان دونوں معرفتوں سے معرفت مقصود کا طلب کرنا۔

سوئم تحصل : یعنی معرفت مطلوبہ کا حاصل ہونا اور اس سے دل کا متجلّے ہونا

چہارم تبدل: یعنی حصول نورِ معرفت سے دل کا حال بدلنا

پنجم تتبع : یعنی تبدیلیٔ حالِ دل کے ساتھ دل کی طرح تمام اعضاء و جوارح بھی اس کی اتباع میں بدلتے چلے جائیں۔

پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ تفکر دو حال سے خالی نہ ہو گا یا تو خدا کی ذات وصفات وافعال سے متعلق ہو گا یا انسان کی ان ہی باتوں سے۔ یعنی انسان کی ذات وصفات وافعال واعمال سے پھر جو فکر کہ خدا سے متعلق ہے وہ یا تو اس کی ذات اور اسماء الحسنیٰ میں ہو گا۔ یا اس کی صفات وافعال و ملک وملکوت اور ارض وسما اور ان کے درمیان کی اشیاء میں ہو گا۔ پس اس کی ذات میں فکر کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ کیونکہ اس قدیم ذات میں عقلِ جزوی انسانی سوائے حیرانی وسرگردانی کے کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتی اور جو ذات کہ عقل وقیاس اور وہم وگمان وفہم وادراک سے بالاتر ہو اس میں فکر کرنا محض نادانی ہے۔ اس لئے سرکارِ دوجہاں مختارِ کون ومکاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے۔ کہ تَفَکَّرُوْا فِیْ خَلْقِ اللّٰہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِیْ ذَاتِ اللّٰہِ یعنی تم اللہ کی مخلوقات میں تفکّر کرو اور اللہ کی ذات میں نہ کرو۔ بس چاہئے کہ ذات میں فکر نہ کیا جائے۔ کیونکہ ذات میں فکر سرگردانی اور حضور علیہ السلام کی نافرمانی ہے۔ چنانچہ حضرت سیدنا و مولانا اسد اللہ الغالب حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے حضرات حسنین علیہما السلام کو نصیحت فرماتے وقت اسی مسئلہ میں کیا خوب تعلیم فرمائی تھی۔ یَا وَلَدِیْ فِکْرُکَ فِیْکَ یَکْفِیْکَ کہ اے میرے بیٹے تیرا فکر تجھ میں تیرے لئے کافی ہے۔ اپنی شناخت اور اپنے اندر فکر کر کہ فَلَیْسَ شَیْئٌ خَارِجًا مِنْکَ کہ کوئی شے تجھ سے خارج نہیں۔ تیرا درد تیرے اندر ہے۔ اس کو دیکھ اور تیرا دوا تجھ میں پوشیدہ ہے۔ اس کو جان اور تجھ کو گمان ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے اندر ایک بہت بڑا جہان مستور ہے۔ اور تو وہ ام الکتاب ہے جس کو اپنے حرفوں سے سب کچھ جان لینا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ کیونکہ رب العزت نے انسان کے لئے ہی فرمایا ہے وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ

أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ - یعنی جو کچھ تم حاصل کرنا چاہتے ہو وہ تمہاری ہی ذات میں موجود ہے - کیا پس تم نہیں دیکھتے اور سرکارِ دو جہاں مالک این و آں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ یعنی جس نے اپنے نفس و ذات کو پہچان لیا پس اس کو عرفان رب العزت حاصل ہو گیا - ایک دن حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا - کہ اَیْنَ اللّٰہ فَقَالَ النَّبِیُّ عَلَیْهِ السَّلَامُ فِیْ قُلُوْبِ عِبَادِهٖ - یعنی عرض کیا کہ اللہ تعالےٰ کہاں ہے - تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اپنے بندوں کے دل میں ہے - دوسری حدیث میں ہے - قُلُوْبُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَرْشُ اللّٰہِ تَعَالیٰ یعنی بندوں کے دل خدا کے عرش ہیں اور وہ الرحمٰن علی العرش استویٰ - رحمٰن عرش پر مستوی ہے کے ماتحت جب یہ ثابت ہو گیا کہ ذات اپنی صفات سے باہر نہیں اور انسان اعلیٰ ترین صفات الٰہیہ میں سے ہے اور اس میں بمصداق وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ ظہور روح قدسی ہوا ہے - تو پھر انسان کیوں بے ٹھکانے بھٹکے - جو انسان تفکر صفات و مخلوق کا راستہ اختیار کر کے ذات کا سراغ لگائے گا وہ ضرور دلی مقصد پائے گا - کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

در فکر بکوششے در آویز   تا خود کششے رسد کہ برخیز

خطرات قلب سے آگاہی

درویش جب ذمائم نفسانیہ سے پاک ہونے کے لئے صبح و شام فکر و شغل میں مصروف رہ کر یاد الٰہی میں ہر لحظہ کلی انہماک رکھنے لگتا ہے - تو اس کے قلب کو مخلوقات میں سے کسی کے ساتھ اور کسی کی معیت میں آرام نہیں ملتا اور تمام محجوبات و مانوسات سے ترک پسند ہوتی ہے - اور ہر چیز سے مستغنی اور بے پرواہ ہو جاتا ہے - اس حالت میں اس پر خطرات کا ہجوم ہوتا ہے - اور ہر مخالف قوت اس کا راہ مارنے اور اس کو منزل سے گرانے کے درپے ہو جاتی ہے درویش جب تک ان خطرات سے واقف ہو کر آپ اپنی حفاظت کے درپے نہ ہو - اس کا اس منزل سے بآسانی گزرنا اشد مشکل ہوتا ہے - اور اس کو وہ خطرات قلب جو پیش آتے ہیں چھ ہیں :-

۱- خطرۂ نفس - جس کا کام یہ ہے کہ وہ جائز و ناجائز خواہشات اور شہوات پہ آمادہ کرتا ہے۔

۲- خطرۂ شیطان - جس کا فعل یہ ہے کہ وہ اصول میں کفر و شرک پہ آمادہ کرتا ہے اور مواعید الہٰی پر ریب واشتباہ کی ترغیب دیتا ہے اور فروعات میں یہ فریب دے کر کہتا ہے کہ معمولی گناہ ہے۔ ذرہ سی بات ہے اس کی حقیقت ہی کیا ہے۔ کر لو۔ پھر توبہ کر لینا۔ بہت وقت ہے۔ وغیرہ وغیرہ حیلوں سے معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔

۳- خطرہ فرشتہ کا مطلب یہ ہے کہ بعض نیک امور اور طاعت الہٰی کی طرف آمادہ کرے۔ مگر بعض حالتوں میں تمیز نہ ہونے سے درویش کا وسوسے میں پڑ جانا ممکن ہوتا ہے۔

۴- خطرۂ روح - اس کا منشا تمام نیک امور اور اطاعتِ الہٰی کی جانب متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو مستحسن اور محمود کہا گیا ہے۔ بشرطیکہ اس میں خود اختیاری کا تخیل نہ ہو۔

۵- خطرۂ عقل - کے کام دو گونہ ہیں۔ کبھی ان افعال کی جانب انسان کو راغب کرتی ہے۔ جو نفس وشیطان چاہتے ہیں۔ اور کبھی ان افعال کی تائید کرتی ہے اور اختیار کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ جو ملائکہ وارواح کی کارفرمائی کے رہینِ منت ہیں۔ یعنی اس خطرہ میں نیک و بد دونوں خیالات کی جانب کا امکان ہوتا ہے اور یہ خطرہ حکمتِ الہٰیہ کا اہم مظہر ہے۔ جس سے مقصد یہ ہے کہ انسان خیر و شر کے میدان میں سوچ سمجھ سے نتائج پر نظر ڈال کر اور عقل و خرد سے کام لے کر قدم رکھے۔ کیونکہ اسی کی بنا پر جزا و سزا کا عمل ہوگا۔

۶- خطرۂ یقین - یہ بہت بڑی چیز اور بہت بڑا راز ہے۔ جس کو روح الایمان کہا جا سکتا ہے۔ یہ خطرۂ اولیائ اصفیاء، شہداء، صلحاء، اور ابدال واقطاب وصدیقین کے ساتھ خاص ہے۔ اس کی تشریح کسی دوسرے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ۔

یقین کا حصول اور درجات

جب ارواح شوق واشتیاق سے لطیف ہو جاتی ہیں۔ اور حقیقت سے ٹکرا کر ہمیشہ مشاہدہ کے درختوں سے معلق رہنے لگتی ہیں۔ تو پھر ان کو حقیقتاً معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا تعالےٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پہلے جو قال تھا اب حال ہو گیا۔ اور جو شنید تھی دید بن گئی ہے۔ اس وقت انہیں اس بات پر جو وثوق ہوتا ہے اسے یقین کہتے ہیں۔

۱- علم الیقین وہ علم ہے جو غور وفکر سے حاصل ہو اور اس پر استدلال کیا جا سکے۔

۲- عین الیقین وہ علم ہے جو بذریعہ کشف و بخشش و عطا حاصل ہو اور سب کچھ صرف محسوس ہی نہ کیا جائے۔ بلکہ آنکھ سے دیکھا جائے۔

۳- حق الیقین وہ علم ہے جو اپنی جامعیت اور انتہا میں لاثانی ہو۔ یعنی یہ کہ وہ غور وفکر کا نتیجہ ہو۔ نہ صرف یہ کہ آنکھ سے نظر آئے بلکہ یہ کہ اس کی حقیقت بھی سمجھ میں آجائے۔ مشاہدہ حقیقی میں جب کوئی چیز حائل نہ رہے۔ تاآنکہ انسان بالکل مدہوش ہو جائے۔ اور اس کو اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہ رہے۔ تو اسے وصال کہتے ہیں۔ اور یہاں ہی چہرۂ حقائق سے تمام پردے اور حجابات اٹھ کر حق الیقین حاصل ہوتا ہے۔

خرق عادات وکرامات

چونکہ امت مرحومہ کا مقصد زندگی دنیا میں دعوت الی الحق والخیر ہے۔ امر معروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان کا فرض اولین ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ ہر مسلمان کا وجود پہلے خود پاکیزگی حیات کی وجہ سے تمام عالم کے لئے کعبہ بنے اور اہلِ دنیا کی برائیوں اور کثافتوں کو دور کرنے کے لئے تیار ہونے سے پہلے اپنی تمام برائیوں اور کثافتوں سے پاک وصاف ہو جائے ورنہ جو خود تاریک ہے وہ دوسروں کو روشنی کیونکر دے سکتا ہے۔ اور خود پستی میں جانے والا دوسروں کو بلندی پر کس طرح لے جا سکتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو ہر مایہ نازہستی کا پتہ دیتی ہے۔ اور اس کی قدوسیت کو ثابت کرتی ہے۔

میدانِ رشد وہدایت میں آنے والی تمام تر ہستیاں دو طریق پر کام کیا کرتی ہیں۔ ایک کتاب اللہ سے دعوت الی الحق۔ دوئم معجزانہ قوتوں کا ظہور الی الحق۔ پہلی صورت انبیاء علیہم السلام سے لے کر عام علمائے امت تک سب نے اختیار فرمائی ہے اور تبلیغ کی پہلی صورت بھی یہی ہے۔ دوسرے مدعی سے ظہور خوارق حسب الطلب عوام الناس یا بلا طلب عندالضرورت۔ اگر خوارق عادات کا مدعی نبوت سے ہو تو اس کو معجزہ کہتے ہیں اور اگر قبل از اظہار دعوائے نبوت وہی ہستی کسی ضرورت کے تحت وہی کر کے دکھا دے جو اظہارِ نبوت کے وقت اس سے ظہور میں آسکتا ہو تو اس کو ارہاص کہتے ہیں۔ اگر وہی کام کسی ولی سے ظاہر

ہو تو اس کو کرامت کہتے ہیں۔ اگر وہی کام کسی عام مومن صالح غیر ولی سے ثابت ہو تو معاونت کہلاتا ہے۔ اور ایسا ہی کوئی کام اگر کافر، زندیق، مشرک اور مرتد سے ظاہر ہو تو اس کو استدراج کہا جاتا ہے جس کا فرق آگے بیان کیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

معلوم ہؤا کہ صاحب ولایت سے ظہور خوارق عادات بالاتفاق جائز اور ضروری ہے جس کا ثبوت قرآن وحدیث اور آثار صحابہ کرام میں بڑی وضاحت و بینات سے ملتا ہے۔ اور دنیا کے اس سیزدہ صد سالہ اسلامی دور میں لاکھوں افراد اپنی آنکھوں سے یہ مشاہدہ کر چکے ہیں۔ مگر مادہ پرستوں کی بھی کسی زمانہ میں کمی نہیں رہی اور منکرین بھی ہر زمانہ میں پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جو اُس وقت تک کسی بات کو خواہ وہ صد ہزار بار مشاہدہ ہی سے کیوں نہ گزر چکی ہو تسلیم نہیں کرتے۔ جب تک ان کی عقلی و نقلی تسکین کے سامان بروئے دلائل اچھی طرح مہیا نہ کر دیئے جائیں۔ کیونکہ یہ مادیت کا زمانہ ہے اور یورپ کے الحاد کی ہواؤں نے عقائد کے اشجار کو جڑ سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ لوگ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی اس بیہودہ روش سے خدا کے بندوں کو قطعاً گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ گھبرائیں وہ جن کے مذہب میں خامیاں ہوں اور وہ فطری طور پر عقل کا ساتھ نہ دے سکے۔ یا وہ جن کا دھرم توہمات کا پکیہ ہو۔ اسلام وہ شے ہے کہ باطل نہ اس کے سامنے جم سکے اور نہ اس کو اس کے پیچھے جگہ مل سکے۔

مشاہدہ اور حقیقت سے برطرف ہو کر غور فرمایئے کہ اس امر کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ خدائے قدوس قادر مطلق ہے۔ اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ جہاں وہ ہر چیز کی تخلیق کا سبب پیدا کرتا ہے۔ وہاں اسے یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کو بلا سبب پیدا فرما دے۔ اور اگر اس نظریہ سے انکار کیا جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہو گا کہ خدا کو قادر مطلق تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اس کی سنت و عادت یہی ہے کہ وہ ہر چیز کو سبب کے ساتھ پیدا فرماتا ہے۔ ایک ہوتی ہے قدرت اور ایک ہوتا ہے قانون۔ قدرت یہ ہے کہ بادشاہ کو اختیار ہے کہ کسی آدمی کو مجرم سمجھ کر تختہ دار پر لٹکا دے۔ مگر قانون یہ ہے کہ اس پر باضابطہ مقدمہ چلے۔ ثبوت بہم پہنچایا جائے۔ گواہ لئے جائیں پھر پھانسی دیا جائے۔ مگر مارشل لاء کا زمانہ شاہد ہے کہ دونوں صورتیں عمل میں آتی رہی ہیں۔ فقدرت،

اور عادت یا قدرت اور قانون دونوں کے کرشمے دیکھے گئے ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم خدا کی اس عادت پر تو ایمان لائیں کہ ہر فعل کا ایک سبب ہوتا ہے۔ لیکن اس کی قدرت پر ایمان نہ لائیں کہ وہ قادر مطلق ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور بلا سبب بھی کسی شے کا پیدا کر دینا اس کے لئے غیر ممکن نہیں۔ لہٰذا جو لوگ معجزات و کرامات کو خلاف قانونِ قدرت بتا کر ان کی حیثیت و حقیقت سے انکار کر دیتے ہیں وہ قدرت و عادت کے فرق کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ اگر سمجھتے تو انکار نہ کرتے۔ یہ چیزیں خلافِ عادت ضرور ہیں اور ہوتی ہیں۔ مگر خلافِ قدرت نہیں ہوتیں۔

دریائے نیل کا پھٹ جانا۔ عصائے موسیٰ کا اژدہا بننا۔ دربار سلیمان علیہ السلام میں کسی ولی اللہ کا آنکھ جھپکتے تختِ بلقیس لانا۔ حضرت زکریا کا حضرت مریمؑ کے پاس تازہ پھل دیکھنا۔ اصحاب کہف کا غار میں تین سو سال تک سونا اور زندہ رہنا۔ جریج راہب اور یوسف علیہ السلام کی گواہی میں بچے کا بولنا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ساریہ کو مدینہ سے نہاوند کے پہاڑوں میں پکارنا۔ دریائے نیل کا حضرت عمرو ابن العاص کے زمانہ میں حضرت امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کے خط پر جاری ہونا وغیرہ خلافِ عادت تو ہے مگر خلافِ قدرت ہرگز نہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں، اور خدائے قدوس یہ نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی قدرت یا خاص عادت سے کام لے کر اپنے مقربین کی تصدیق کے لئے ان کے ہاتھ سے خلافِ عادت اور خلاف قانونِ قدرت، علامات، افعال، معجزات یا کرامات کا صدور کروائے۔ کر سکتا ہے اور ضرور کر سکتا ہے۔

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں۔ چونکہ اخبار و حکایات میں کثرت سے کرامات کا بحد تواتر ذکر آچکا ہے۔ لہٰذا اولیاء اللہ کے لئے ان کرامات کا ظہور ایک ایسا علم قوی ہو گیا ہے کہ جس سے شکوک و اوہام دور ہو گئے ہیں۔ اور کوئی شخص سلیم القلب جس نے اس گروہ کے حال کا مشاہدہ اور ان کے اقوال کا مطالعہ کیا ہے۔ جاہلوں اور گمراہوں کے بے سر و پا وسوسوں میں نہیں آسکتا۔ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے بیشمار وہ اولیاء اللہ ہیں جن کی کثرت سے کرامات ظاہر ہوئی ہیں۔ اور ہر ایک زمانہ میں جو جو رسول تشریف لائے ہیں ان کے متبعین میں سے بھی ایسے اولیاء اللہ ہوتے رہے ہیں جن سے کرامات اور خوارقِ عادات افعال کا ظہور ہوتا رہا ہے سمجھنا چاہئے کہ گویا اولیاء اللہ کی کرامات انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا تتمہ ہیں۔ لیکن آج جو شخص کہ احکام شریعت محمدیہ کا ملتزم نہیں اگر اس کے ہاتھ پر بھی خوارقِ عادات و افعال کا ظہور ہو تو اہل شرع کے نزدیک وہ شخص بے دین و زندیق ہے۔ جو کچھ اس سے ظاہر ہوگا وہ مکر و استدراج ہوگا۔

معجزہ، کرامت اور استدراج کا فرق

تفسیر کبیر میں علامہ فخرالدین رازی لکھتے ہیں کہ جب کسی انسان سے کسی خوارق عادات فعل کا ظہور ہو تو یہ صورت دو حال سے خالی نہ ہو گی یا تو اس کے ساتھ دعویٰ ہو گا یا نہ ہو گا۔ اور اگر دعویٰ ہو گا تو وہ کئی اقسام پر مشتمل ہو گا۔ یا خدائی دعویٰ ہو گا۔ یا نبوت کا یا ولایت کا یا جادو کا۔ یہ مدعی بھی بڑے غضب کے انسان ہوتے ہیں۔ جب اپنی خود پسندی اور ہٹ پر آ جائیں تو خدائی کے دعویٰ تک سے نہیں چوکتے۔ جیسے کہ فرعون، خدائی کا مدعی ہوا اور اس سے خرق عادت کا بھی ظہور ہوتا رہا۔ لیکن غلط دعاوی دیرپا نہیں ہوا کرتے۔ دنیا بھر کو معلوم ہے کہ فرعون کا کیا انجام ہوا۔ حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں جادوگروں نے کس طرح منہ کی کھائی۔ اور رسوا اور ذلیل ہوئے۔ خداوند عالم سب پر غالب ہے۔ اور اس کے خاص و مقبول بندے اور سچے بزرگ بھی ہمیشہ کامیاب اور فائز المرام رہتے ہیں۔

معجزہ وہ خوارق عادت فعل ہے جو نبی کی طرف سے ظہور میں آئے اور مدمقابل کو جواب سے عاجز کر دے۔ کرامت وہ ہے جس کا ظہور اولیائے کرام کی طرف سے ہو اور لاجواب ہو۔

استدراج وہ ہے جو جادوگروں اور کاہنوں کا شیوہ ہے جس پر مغالطہ دیا جا سکتا ہے۔

بعض لوگ کرامات کے بطلان میں یہ چیز دلیل پکڑتے ہیں کہ آخر کرامت اگر بزرگی و تقدس کی دلیل ہے تو جادوگروں اور فاسقوں کی طرف سے خارق عادت فعل کا ظہور کیوں ہوتا ہے۔ یہ معترضین کا مغالطہ ہے۔ اور وہ نہیں سمجھ سکے کہ ہر انسان بحیثیت خلیفۃ اللہ ہونے کے اپنے آپ میں شرافت انسانیہ کا جوہر اور خلافت الٰہیہ کی طاقتیں رکھتا ہے اور کوئی برا ہو یا اچھا اگر سعی سے کام لے اور محنت کرے تو اتنی ترقی کر سکتا ہے۔ جس سے خوارق عادت کا ظہور ممکن ہو۔ کیونکہ ہر انسان میں نائب ربانی اور خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے جو قوت و صلاحیت ودیعت ہو چکی ہے وہ عام ہے۔ اور اس میں نیک و بد عقیدت کا کوئی امتیاز نہیں اور ایک حد تک سب ادنیٰ اور اعلیٰ ترقی کر سکتے ہیں۔ مسمریزم، ہپناٹزم اور جادو والوں کی افسوں کاریاں آج اظہر من الشمس ہیں جو بعض اوقات ولایت کے مدعی بھی بننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور ان سے خوارق عادات افعال کا صدور اور ظہور بھی ہوتا ہے۔ اور یہ صفت ان میں اس لئے نہیں کہ وہ اللہ کے مقرب ہیں۔ یا ان کو رب قدیر کی جانب سے خاص طاقتیں ملی ہوئی ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کی خلقت میں جو جوہر پوشیدہ اور مضمر تھے۔ انہیں انہوں نے اپنی محنت سے چمکایا اور ترقی دی

البتہ فرق آگے جا کر پڑتا ہے جہاں معلوم ہوتا ہے کہ مقربین بارگاہ اولیاء اللہ کی ترقی غیر محدود اور لاانتہا ہے۔ ان کی طاقتوں کا کوئی بھی اندازہ و شمار نہیں۔ اس لئے کہ ان کی خلقی قوتیں اور صلاحیتوں میں آگے چل کر وہب و عطا شامل ہو جاتی ہے۔ اور تجلیات ربانی کا پرتو انہیں منور کرنے لگتا ہے۔ جس سے وہ قبولیت عام اور شہرت دوام پا لیتے ہیں لیکن عام انسانوں کی خلقی طاقتیں اتنی ترقی نہیں کر سکتیں اور نہ مسمریزم وغیرہ محض قوتِ متصورہ سے کام لینے والوں کو وہ شہرتِ دوام اور ترقیٔ تام حاصل ہو سکتی ہے۔ جو ان کے خوارق عادت فعل کو ابدیت بخش سکے اور کرامتِ ولایت کے مقابلے میں کھڑا کر سکے۔

کرامات کے اقسام

کرامات و خوارق عادات کے اقسام بہت زیادہ ہیں۔ یعنی دنیائے تصرف میں کوئی کام اور کوئی شے ایسی نہیں جس پہ بوقت ضرورت ظہور کرامت و حسب قدرت عمل خرق عادت نہ ہو سکے مثلاً معدوم شے کا موجود کر دینا، موجود کا معدوم کر دینا، پوشیدہ کا ظاہر اور ظاہر کا پوشیدہ کرنا بعید مسافت کا تھوڑی مدت میں طے کرنا۔ امورات غیبیہ سے مطلع کرنا، ایک ہی وقت میں متعدد مقامات پر حاضر ہونا مُردوں کا زندہ کرنا اور زندوں کا مارنا، حیوانات اور درندوں سے اپنی مرضی کے ماتحت کام لینا۔ نباتات اور جمادات کا بلانا، اور ان کی صدائے تسبیح سننا، بوقت حاجت بدوں اسباب ظاہری کھانے پینے کی یا دیگر اشیاء کا پیدا کر لینا، ہوا اور پانی پر زمین خشک کی طرح چلنا، وحشیوں کو مسخر کر لینا یا ایک نگاہ سے ان کے اجسام میں بے پناہ قوت بھر دینا، اور صرف خیال سے کسی کی گردن اڑا دینا، وغیرہ وغیرہ۔ سب اولیاء اللہ کے نزدیک بحیثیت صاحب کرامت ہونے کے سہل ترین امورات سے ہیں۔ عرفاء متقدمین نے لکھا ہے کہ جب حق سبحانہٗ تعالےٰ اپنے دوستوں میں بعض کو اپنی قدرتِ کاملہ کا مظہر بناتے ہیں تو وہ جس طرح چاہتے ہیں جہان میں تصرف فرماتے ہیں۔ درحقیقت وہ اثر تصرفِ حق تعالےٰ ہی کا ہوتا ہے۔ جو صاحب تصرف میں ظہور فرماتا ہے۔

ان اوصاف و عادات اور کرامات کی نوعیت سے قرآن کریم، احادیث مبارکہ اور کتب سیر و تاریخ بھری پڑی ہیں۔ قرآن کریم کے فرمودہ واقعات سے علاوہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور مابعد کے بزرگان دین کی اس قدر کرامات کتب تصوف و احادیث میں ملتی ہیں۔ جن کے بیان کرنے کے لئے قلم عاجز اور ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ اسلام نے ہر مسلمان کا وجود ہی ایک مجسّم کرامت بنایا ہے۔ اور جس قدر دنیا میں مسلمان پیدا

ہوئے ہیں اور قیامت تک ہوں گے ۔ ان کی تعداد سے بھی کہیں زیادہ کرامات اولیاء امت کا ظہور ہو چکا ہے اور ہوتا رہے گا ۔ ماشاء اللہ

کشف ومکاشفہ

جس طرح انکارِ کرامت بے علمی و بے راہ روی ہے ۔ اسی طرح انکارِ کشف بھی جہالت و گمراہی ۔ بعض نام نہاد درویشی کے مدعی فی زمانہ مکاشفہ سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کوئی چیز نہیں اور نہ اس کا شریعت و طریقت میں کوئی ثبوت ہے ۔ بلکہ ان کی لاعلمی یہاں تک بڑھ گئی ہے ۔ کہ وہ مکاشفہ کو ایک فریب سمجھتے ہیں اور محض تخیلات اور ظنیات کا مجموعہ ۔ بہتوں کا یہ خیال بھی ہے کہ واقعات و حالات حاضرہ کے ماتحت لوگوں کے معاملات کا تذکرہ کرنا ۔ کچھ جھوٹ اور کچھ سچ پر زبان کھولنا ۔ بعض کا غلط اور بعض کا درست ہونا اور نجومیوں کی طرح باتیں بنانا کشف سے تعبیر کر لیا گیا ہے ۔ درحقیقت کشف درویشی کے متعلقات سے کچھ نہیں ۔ ان کی اس انوکھی منطق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ علم ظاہر سے واقف ہوتے ہیں اور نہ علم باطن سے نہ فقر کو جانیں نہ فقیری کو ۔ محض وظائف کا پڑھنا اور پیری مریدی کا لیڈری کے طریق پر چلانا ، اور لوگوں کو ان تمام اصولوں سے پھیرنا جو حقیقی درویشی سے متعلق ہیں ۔ ان مکار و ریاکار مدعیوں کا شیوہ ہو گیا ہے ۔ ان کی فقیری کی ابتدا نہ کسی درویش سے ہوتی ہے ۔ نہ خود واقفیت رکھتے ہیں نہ مسائل و منازل طریقت کو سمجھیں نہ ورود سے تعلق رکھیں ۔ اپنی کمزوریوں اور خامیوں پر پردہ پوشی کے لئے اطوارِ بزرگانِ دین ہی سے منکر ہو جاتے ہیں ۔ تاکہ نہ پہلوں کے کمالات پر ہم کسی حال میں ایمان رکھیں نہ ہمارے بے علم و بے راہرو تقدس سے کوئی الجھے ۔ جب ان سے کوئی کہہ دے کہ فلاں بزرگ کو میں نے کشف میں گفتگو کرتے سنا ہے یا وہ کشف کے ذریعے لوگوں کو اطمینان و ایقان بخشتے ہیں ، تو یہ فریبی نام نہاد پیر یہ جواب دیتے ہیں کہ میاں یہ ابتدائی باتیں ہیں ۔ بزرگانِ دین نے ان کو مشتبہ فرمایا ۔ بلکہ حکم دیا ہے کہ کشف و کرامات کو ایسا چھپاؤ جیسے عورت حیض و نفاس کو چھپاتی ہے ۔ اس لئے ہم کشف کے قائل ہی نہیں ۔ اس تفصیلی گفتگو سے انکا مقصد وضاحت حقیقت نہیں ہوتا ۔ بلکہ اپنی بے مائگی کی پردہ پوشی ۔ جس طرح مرزائے قادیانی کی امت نے معجزات کے میدان میں اپنے مرزا آنجہانی کو کھوکھلا اور بے بہرہ پا کر اس کی خامی کو چھپانے کے لئے تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے انکار کر کے (کہ یہ معجزانہ حیثیت فی نفسہٖ کوئی شے نہیں اور انبیاء کے معجزات اصل میں مسمریزم کی ہی ایک کیفیت ہوا کرتی ہے) مرزا کی بے بضاعتی پر پردہ داری کی ہے ۔ ویسے ہی یہ فقیری کا

پارٹ کرنے والوں کا حال ہے۔ اگر قرآنِ کریم، احادیث مبارکہ اور بزرگانِ دین کے کمالات سے یہ لوگ واقف ہوتے تو حقیقت کشف سے انکار نہ کرتے۔ ان کے انکار کو دیکھ کر بلاشبہ ایک مبتدی دھوکا کھا جاتا ہے کہ یہ سچ کہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ من گھڑت تقریباً ایک جغد صحرائی کی منحوس آواز سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

کشف کیا ہے؟

آؤ اہل اللہ سے پوچھیں اور ان کی تحریرات سے معلوم کریں کہ کشف کیا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی درویش اس کے ماتحت گفتگو کرے اور اس کی کوئی حقیقت پیش کرنے کا مدعی ہو سکے۔

حضرت آگاہ رازِ حقیقت، کشاف اسرار و معرفت واقف رموز خفی و جلی سید غوث علی قلندر قادری اپنی کتاب تعلیم غوثیہ میں لکھتے ہیں کہ وہ اسرارات الٰہی و رموز باطنی جسکو فقر و تصوف و علم باطن کہتے ہیں آج تک اولیاء اللہ کے ذرائع سے سینہ بسینہ چلے آرہے ہیں اور تا قیام قیامت بہ فیضان حضور علیہ السلام کا جاری و ساری رہے گا۔ البتہ عوام الناس کوتہ اندیشوں کے سامنے علم باطن کا اظہار موجب ہلاکت ہے۔ وقال علی المرتضیٰ واشارہ الی الصدرہ ان مہنا لعلوما جملۃ لو وجدت لہا حملتہ وقال قلوب الابرار قبور الاسرار

یعنی علی علیہ السلام نے اپنے سینہ کی جانب اشارہ کر کے فرمایا اگر میں کسی کو متحمل پاتا تو یہاں بہت سے علوم ہیں اور فرمایا اولیاء اللہ کے سینے اسرار الٰہی کی قبریں ہیں۔ یعنی تمام لوگ ان علوم کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کے لئے سرمایۂ عقل، فراخی حوصلہ اور بلندیٔ ہمت درکار ہے۔ اور اس علم میں ایک شعبہ کشف ہے۔ جس کی دو قسمیں ہیں:-

ایک کشفِ کونی۔ دوسرا کشف ذاتی۔

۱۔ کشف کونی وہ ہے کہ سالک کو احوالِ عالم سے روزانہ اطلاع اور عالم ملکوت کی فتح و کشائش نصیب ہو جاتی ہے۔ جس میں اس پر کشف و کرامات کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ مگر اولیاء اللہ کا یہ مقام ایک گزرگاہ ہے درویش کو یہاں ٹھہرنا اور کشف و کرامات پر دل لگانا روا نہیں۔ کیونکہ اس میں راہ کی بندش کا احتمال ہوتا ہے۔

۲۔ کشفِ ذاتی وہ ہے کہ عارف کو ذاتِ حق و حقیقتِ اشیاءِ عالم کا انکشاف ہو۔

چنانچہ حضور علیہ السلام نے حدیث شریف میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنِی اِنَّ الاَشیاءَ کما ھی۔ یعنی اے خدا مجھ کو حقیقت اشیاء بعینہٖ دکھا۔ اس حدیث کو امام بخاری نے بخاری شریف میں نقل کیا ہے

اور جب خادمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زیدؓ کو کشف کونی منکشف ہوا تو ایک روز جوش میں آ کر دربارِ رسالت میں عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر حکم ہو تو بہشتیوں اور دوزخیوں کو جدا جدا اور حال حشر و نشر بالتفصیل بیان کر دوں تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ بس تیرا گھوڑا بہت گرم ہو گیا ہے - اس کو ذرا ٹھنڈا کرو - چنانچہ اس حدیث کو مولانا رومؒ نے مثنوی میں بالوضاحت اور قبلۂ عالم شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی کتاب آداب ارشاد المریدین میں مفصل نقل فرمایا ہے -

حضرت محمد بن علی حکیم ترمذی فرماتے ہیں کہ اولیاء کامل کا درجہ اور کامل حال بے صفتی اور بے نشانی ہیں کہتے ہیں یعنی بے نشانی کشف ذاتی کی طرف اشارہ ہے کہ بہت بڑا مقام اور بلند درجہ ہے جس کے مرتبہ کی حقیقت بیان کرنے سے قلم عاجز ہے -

حضرت خواجہ مشکلکشاء خواجہ بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عزیزان فرماتے ہیں کہ گروہ فقراء کے نزدیک از روئے کشف زمین ایک دسترخوان کی طرح ہے اور ہم کہتے ہیں کہ ایک ناخن کے برابر ہے جس کی کوئی چیز غائب نہیں -

حضرت قطب ربانی غوث صمدانی، شاہ شاہاں سید شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں - کہ

نَظَرْتُ اِلٰی بِلَادِ اللہِ جَمْعًا ۔۔۔ کَخَرْدَلَۃٍ عَلٰی حُکْمِ اتِّصَالٖ

یعنی از روئے کشف میری یہ کیفیت ہے کہ میں تمام ممالک الٰہیہ کو بیک نگاہ اس طرح مطالعہ کرتا ہوں جس طرح ہاتھ کی ہتھیلی پر رائی کا دانہ - جیسے اس کی کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی ویسے ہی مجھ پہ ممالک الٰہیہ سے کچھ پوشیدہ نہیں -

حضرت شیخ صلاح الدین قونوی سے سوال کیا گیا کہ عارف کی کیا تعریف ہے؟ فرمایا وہ جو تمہارے دل کی باتیں کہے اور تم خاموش بیٹھے سنتے رہو -

حضرت شیخ ابو عبد اللہ محمد بن ابراہیم قریشی فرماتے ہیں کہ عارف عالم وہ ہے کہ جو تیرے دل کی باتیں کرے اور تیرے انجام سے مطلع ہو -

حضرت شیخ صدر الدین رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب فکوک میں اپنے شیخ کے کشف کی کیفیت لکھتے ہیں کہ ہمارے

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خاص نظر تھی کہ جب چاہتے کہ کسی کے حال سے واقف ہو جائیں تو اس کی طرف دیکھ کر اس کے آخرت اور دنیوی حالات کی خبر دے دیا کرتے۔ جس کو مخاطب تسلیم کرتا۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے پہلی دفعہ تجرید کے قدم پر حج کا ارادہ کیا تو اثنائے سفر میں مجھ کو ایک حبشن لڑکی ملی۔ جو برقعہ پہنے ہوئے تھی۔ میری طرف تیز تیز نظر سے دیکھ کر کہنے لگی۔ اے جوان تم کہاں سے آئے ہو؟ میں نے کہا عجم سے۔ کہنے لگی آج تم نے مجھے بڑا پریشان کیا اور رنج میں ڈالا۔ میں نے کہا کیوں۔ اس نے کہا۔ اس وقت میں ملک حبشہ میں تھی۔ مجھ کو مشاہدہ و کشف ہوا کہ خداوند عالم نے تیرے دل پر تجلی کی ہے۔ اور تجھ کو اس قدر دیا ہے کہ اور کسی کو جنہیں میں جانتی ہوں نہیں دیا۔ اس لئے میں نے چاہا کہ تم کو آنکھوں سے دیکھوں اور پہچانوں۔

یہ واقعہ کس قدر کشف بے پناہ کی دلیل ہے۔ جس سے نااہل انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ حضرت سیدنا شیخ عبد القادر رضی اللہ عنہ نے ایک اور اصفہانیہ عورت کا ذکر فرمایا ہے کہ حضور وعظ فرما رہے تھے کہ جوش میں آپکے عمامے کا ایک پیچ کھل گیا۔ حاضرین نے مطابقت کیلئے اپنی ٹوپیاں اور دستاریں اتار کر منبر کے پاس پھینک دیں۔ جب آپ فارغ ہوئے۔ تو فرمایا کہ سب اپنی اپنی ٹوپیاں اور دستاریں لے لو۔ جب سب لے چکے تو ایک پٹی باقی رہ گئی۔ سو حضور نے فرمایا مجھے دے دو۔ اور لیکر اپنے کندھے پر رکھی تو غائب ہو گئی۔ پوچھا گیا کہ یہ کیا قصہ تھا۔ فرمایا ہماری ایک ہمشیرہ اصفہان میں ہے۔ جب اس کو یہ حال منکشف ہوا تو اس نے بھی اپنی پٹی پھینک دی تھی۔ اب وہ ہاتھ بڑھا کر لے گئی ہے۔

بعض مفسرین نے زیر آیت وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ۔ جو حضرت مسیح علیہ السلام کی شان کے متعلق ہے۔ کشف کے متعلق بحث کی ہے کہ لوگوں کا کھانا وغیرہ جمع کرنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام از روئے کشف بیان فرما دیا کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر فرماتے ہوئے جو لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا فرمایا تھا۔ جو خواب کا جز نہیں تھا۔ بلکہ وہ بصورت کشف ہی فرمایا تھا جس میں خواب بیان کرنے پر بعد کے نتیجہ کا ذکر ہے۔

صاحب عرائس البیان نے اسی قصہ یوسف علیہ السلام کے ماتحت سورہ یوسف کی آیت واخاف ان یاکلہ

پس جس طرح نابالغہ کا حیض اس کے بلوغ کی دلیل ہے اور وہ مقتضی ہے کہ اب یہ اولاد پیدا کرے یا کسی کے کام آسکے اسی طرح درویش بھی اپنی ریاضت سے جب اس مقام پر پہنچتا ہے کہ اس پر خالق و مخلوق، زمین و آسمان مشرق و مغرب، شمال و جنوب اور قبور و قلوب کی مختلف کیفیات قریبی، بعیدی، گذشتہ، حاضرہ و مستقبلہ کا انکشاف ہونے لگے۔ تو وہ بھی اس لائن میں بالغ تصور کیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ انکشافی کیفیات کو ذکر کریگا تو کفر لازم آئیگا۔ یا مشرک فی الکفر کہلائے گا۔ بلکہ اس کو اس کے اظہار سے روکنے کا صرف یہ مطلب ہے کہ اگر سائلین و حاضرین کے لئے ہر خاص و عام کے ساتھ یہی صورت اختیار کریگا کہ ان کے آنے جانے میں ہر وقت ان کے حالات پر نگاہ رکھے اور بیان کرتا رہے تو یہ وطیرہ و شغل اس کی اگلی منازل میں حارج ہوگا۔ جو اس کا مقصود حقیقی ہیں۔ کیونکہ محض کشف پر انحصار درویشی اس کا مقصد وحید نہیں۔ اگر کہیں عند الضرورت اظہارِ کشف کرے تو یہ ایک خدمتِ دین و ملت ہوگی۔ عیب و نقص نہ ہوگا۔ ذرا اس حدیث پر غور فرمائیے کہ ایک جنگ میں گرفتار شدہ دو مراہق (قریب بلوغ) کافر بچے دربارِ رسالتؐ میں حاضر کئے جاتے ہیں۔ جن کو حضورؐ نے فرمایا کہ تم جرمانہ ادا کردو تو آزادی کی ہوا کھاؤ۔ میں تمہارا قتل معاف کرتا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے پاس ادائیگی جرمانہ کے لئے کوئی رقم یا مال و زر نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم کو رہائی دے دی جائے تو وعدہ کرتے ہو کہ گھر سے جا کر بھیج دو گے۔ انہوں نے پھر عرض کیا کہ ہمارے پاس گھر میں بھی کوئی شے ادائیگی کے لئے موجود نہیں۔ جس کی بنا پر ہم یہ وعدہ کر کے چلے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جھوٹ کہتے ہو چلتے وقت تمہاری ماں نے سونے کے دو کڑے تم کو دکھا کر تمہارے سامنے مکان کے فلاں کونے میں اس غرض سے دفن نہیں کئے تھے کہ اگر میں مر گئی اور تم جنگ سے میری موت کے بعد واپس آئے تو یہ نکال کر اپنے مصرف میں لے آنا۔ یہ سُن کر دونوں لڑکے مشرف باسلام ہو گئے اور عرض کرنے لگے کہ ان کا پتہ سوائے ہمارے اور ماں ہماری کے تیسرے کسی کو نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کا تعلق کسی اُس ہستی کے ساتھ ہے جو ہر ظاہر و باطن کے بھیدوں سے واقف ہے اور اسی نے آپ کو ان علوم و اسرار سے نواز رکھا ہے۔

ایسا ہی حضرت ابو لیعلےٰ صحابی کا جنگ تبوک سے اطلاع لانے اور حضور علیہ السلام کا بغیر اس کے عرض کئے کے خود تمام حالات من و عن بیان فرما دینے کا واقعہ مشہور ہے۔ مقتولین بدر کے متعلق حضورؐ کی نشاندہی

کہ کل یہاں سے ابوجہل کی لاش اٹھےگی اور یہاں سے فلاں فلاں کی کس قدر کھلی انکشافی کیفیت پر دال ہے۔

انکار وہٹ دھرمی کا تو علاج ہی نہیں، ورنہ ہزاروں ثبوت پیش کئے جاسکتے ہیں۔ جن سے انحراف سراسر جہالت ہوگی مصنف کتاب مسالک السالکین لکھتے ہیں کہ کشف تلوین وتکوین کی حضوری اور کسی شے کو اپنی باطنی قوت سے معلوم کرنے کا نام ہے۔ اگر کشف وکرامت کا ظہور درویش سے نہ ہوتا تو شاید درویش کو تا قیامت تک کوئی معلوم بھی نہ کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کشف وکرامت درویش کے دو پر ہیں جن کی بنا پر تمام جہان سے وہ بلند پرواز اور بلند مرتبہ ہوتا ہے۔ اور ان ہی کی بنا پر اس کی شناخت ہوتی ہے۔ تاکہ خلق خدا اس سے نفع اٹھا سکے۔

حضرت قبلہ عالم شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رضی اللہ عنہ اپنی کتاب عوارف المعارف میں فرماتے ہیں کہ محاضرہ ارباب تلوین کے لئے ہے اور مشاہدہ ارباب تمکین کے لئے اور مکاشفہ دونوں کے درمیان ہے۔ یہاں تک کہ وہ مستقر ہو پس مشاہدہ ومحاضرہ اہل علم کے لئے اور مکاشفہ اہل عین کیلئے ہے۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ لاہوری اپنی کتاب کشف المحجوب میں فرماتے ہیں کہ مکاشفہ بھید کے تحیر کے حضور پر دل میں کسی وارد کے آنے کے وقت بولا جاتا ہے۔ اور اس کا نشان عظمت کے سمجھنے میں ہمیشہ کی حیرانی ہے

کشف، الہام اور وحی کی حقیقت

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ

کشف | عالم غیب کی کسی چیز سے پردہ اٹھا کر دکھلا دینے کا نام کشف ہے۔ کشف سے پہلے جو چیز مستور تھی اب وہ مکشوف یعنی ظاہر اور آشکارا ہوگئی ہے۔

قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رح کشاف اصطلاحات الفنون صفحہ ۱۲۵۴ میں لکھتے ہیں:۔

"الکشف عند اہل السلوک ہو المکاشفہ ومکاشفہ رفع حجاب را گویند کہ روح جسمانی است کہ ادراک آں بحواس ظاہری نتواں کرد الخ"

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ حجابات کا مرتفع ہونا قلب کی صفائی اور نورانیت پر موقوف ہے۔ جس قدر

قلب صاف اور منور ہوگا اسی قدر حجابات مرتفع ہوں گے۔ جاننا چاہئے کہ حجابات کا مرتفع ہونا قلب کی نورانیت پر موقوف تو ہے مگر لازم نہیں۔

الہام کسی خیر اور اچھی بات کا بلا نظر[1] و فکر اور بلا کسی سبب ظاہری کے من جانب اللہ قلب میں القاء ہونے کا نام الہام ہے۔ جو علم بطریق حواس حاصل ہو وہ ادراک حسی ہے اور جو علم بغیر طور حس اور طور عقل من جانب اللہ بلا کسی سبب کے دل میں ڈالا جائے وہ الہام ہے۔ الہام محض موہبت ربانی ہے اور فراست ایمانی جس کا حدیث میں ذکر آیا ہے و من وجہ کسب ہے۔ اور من وجہ وہب ہے۔

کشف اگرچہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے الہام عام ہے۔ لیکن کشف کا زیادہ تعلق امور حسیہ سے ہے، اور الہام کا تعلق امور قلبیہ سے ہے۔

وحی وحی لغت میں مخفی طور پر کسی چیز کے خبر دینے کا نام ہے خواہ وہ بطریق اشارہ کنایہ ہو یا بطریق خواب ہو یا بطریق الہام ہو یا بطریق کلام ہو۔ لیکن اصطلاح شریعت میں وحی اس کلام الٰہی کو کہتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ فرشتہ نبی کو بھیجا ہوا اور اس کو وحی نبوت بھی کہتے ہیں جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اگر بذریعہ القاء فی القلب ہو تو اسکو وحی الہام کہتے ہیں سو اولیاء پر ہوتی ہے اور اگر بذریعہ خواب ہو تو اصطلاح شریعت میں اسکو رویائے صالحہ کہتے ہیں جو عام مومنین اور صالحین کو ہوتا ہے۔ کشف، الہام اور رویائے صالحہ پر لغۃً وحی کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر عرف شرع میں جب لفظ وحی کا بولا جاتا ہے تو اس سے وحی نبوت ہی مراد ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہے کہ جیسا قرآن کریم میں باعتبار لغت کے شیطانی وسوسوں پر بھی وحی کا اطلاق آیا ہے۔ کما قال تعالیٰ وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِهِمْ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ لیکن عرف میں شیطانی وسوسوں پر وحی کا اطلاق نہیں ہوتا۔

وحی اور الہام میں فرق وحی نبوت قطعی ہوتی ہے اور معصوم عن الخطاء ہوتی ہے اور امت پر اس کا اتباع لازم ہوتا ہے اور نبی پر اس کی تبلیغ فرض ہوتی ہے۔ اور الہام ظنی ہوتا ہے اور معصوم عن الخطا

[1] کما فی احیاء العلوم صـ ۱۶ جلد ۳

نہیں ہوتا۔ کیونکہ حضرات انبیاء معصوم عن الخطاء ہیں اور اولیاء معصوم نہیں۔ اسی وجہ سے الہام دوسروں پر حجت نہیں اور نہ الہام سے کوئی حکم شرعی ثابت ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ استحباب بھی الہام سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ نیز علم احکام شرعیہ بذریعہ وحی انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص ہے اور غیر انبیاء پر جو الہام ہوتا ہے وہ از قسم بشارت یا از قسم تفہیم ہوتا ہے احکام پر مشتمل نہیں ہوتا جیسے حضرت مریمؑ کو جو وحی الہام ہوئی وہ از قسم بشارت تھی نہ کہ از قسم احکام اور بعض مرتبہ وحی الہام کسی حکم شرعی کی تفہیم اور افہام کے لئے ہوتی ہے۔

جو نسبت رویائے صالحہ کو الہام سے ہے وہی نسبت الہام کو وحی نبوت سے ہے۔ یعنی جس طرح رویائے صالحہ الہام سے درجہ میں کمتر ہے اسی طرح الہام درجہ کا ابہام اور اخفاء ہوتا ہے اور الہام اس سے زیادہ واضح ہے۔ اسی طرح الہام بھی باعتبار وحی کے خفی اور مبہم ہوتا ہے اور وحی صاف اور واضح ہوتی ہے۔

اور جسطرح رویائے صالحہ میں مراتب اور درجات ہیں جو شخص جس درجہ صالح اور جس درجہ صادق ہے اسی درجہ اس کا رویا بھی صالحہ اور صادقہ ہوگا۔ اسی طرح الہام میں بھی مراتب ہیں جس درجہ کا ایمان اور جس درجہ کی ولایت ہوگی اسی درجہ کا الہام ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ اگر میری امت میں کوئی محدث من اللہ ہے تو وہ عمر ہے۔ سو جاننا چاہئے کہ یہ تحدیث من اللہ الہام کا ایک خاص مرتبہ ہے جو خاص اولیاء کو حاصل ہوتا ہے۔ جو ان کی زبان سے نکلتا ہے۔ وہ حق ہوتا ہے اور صدق اور وحی خداوندی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ بلکہ حق جل شانہٗ کی مشیت یہ ہوتی ہے کہ حق کا ظہور اور صدور اسی محدث من اللہ کی زبان سے ہو کما قال تعالیٰ فی قصۃ موسیٰ علیہ السلام حقیقٌ علیٰ اِلّا اقول علی اللہ الا الحق یہ تحدیث الٰہی مرتبہ فاروقیہ ہے اس کے اوپر مرتبہ صدیقیت ہے اور اس کے اوپر مرتبہ نبوت و رسالت ہے۔

وحی رحمانی اور وحی شیطانی میں فرق

اگر واردات قلبیہ کسی امر خیر اور امر آخرت یعنی حق جل شانہٗ کی اطاعت کی طرف داعی ہوں تو وحی رحمانی ہے اور اگر دنیاوی شہوتوں اور نفسانی لذتوں کی طرف داعی ہوں تو وہ وحی شیطانی ہے۔ کذا فی خواتم الحکم ص ۱۵۶ و مدارج السالکین ص ۲۷ ج ۱۔

حضرات صوفیہ کرام کا مطلب

جس طرح حق جل شانہٗ نے وحی کو معنی لغوی کے اعتبار سے منقسم قرار دے کر اس کے تحت میں وحی نبوت اور الہام اور شیطانی وسوسوں کو داخل فرمایا اور الہام کو معنی لغوی کے اعتبار سے الہام فجور اور الہام تقویٰ کی طرف تقسیم فرمایا۔ فالھمھا فجورھا وتقوٰھا اور لفظ ارسال معنی لغوی کے

اعتبار سے شیطان ہی کے لئے آیا ہے۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ

اسی طرح حضرات صوفیہ نے نبوت کو بمعنی لغوی لے کر منقسم بنایا یعنی خدا تعالیٰ سے اطلاع پانا اور دوسروں کو اطلاع دینا۔ اس معنی لغوی کو مقسم بنایا اور حضرات انبیاء کی نبوت اور وحی شریعت اور اولیاء کی ولایت اور الہام معرفت کو نبوت بمعنی لغوی کے تحت میں داخل فرمایا اور نبوت کے لئے چونکہ تشریع احکام ضروری ہے ولایت میں کوئی حکم شرعی نہیں ہوتا۔ اس لئے حضرات صوفیہ نے نبوت و رسالت کا نام نبوت تشریعیہ رکھا اور ولایت کا نام نبوت غیر تشریعی رکھا اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شریعت میں نبوت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نبوتِ تشریعیہ اور ایک نبوت غیر تشریعی۔ بلکہ نبوت بمعنی لغوی دو قسمیں ہیں۔ ایک اصطلاحی نبوت جس کے لئے تشریع احکام لازم ہے اور نبوت بمعنی لغوی کی دوسری قسم ولایت اور الہام ہے جس سے صرف حقائق اور معارف کا انکشاف ہوتا ہے۔ مگر اس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہوتا حتیٰ کہ کشف اور الہام سے مستحب کا درجہ بھی ثابت نہیں ہوتا اور حضرات صوفیہ نے نہایت واضح طور پر اس کی تصریح کر دی ہے کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بالکل بند ہو چکا ہے اور جس قسم کی وحی حضرات انبیاء پر اترتی تھی وہ بالکل مسدود ہو گئی۔ اب نہ یہ منصب باقی ہے اور نہ کسی کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے اوپر نبی اور رسول کا لفظ اطلاق کرے۔ نبوت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اولیاء کے لئے نبوت میں سے صرف وحی الہام باقی ہے۔ اور حفاظ قرآن کے لئے یہ قرآن باقی ہے۔ حدیث میں ہے من حفظ القرآن فقد درجت النبوة بین جنبیه جس نے قرآن کو حفظ کر لیا تو اس کے دونوں پہلوؤں کے درمیان نبوت داخل کر دی گئی۔ اور علماء اور خواص امت کو منصب رسالت میں یہ حصہ ملا کہ وہ احکام شریعت کی تبلیغ کریں اور فقہاء اور مجتہدین کو منصب رسالت سے یہ حصہ ملا کہ کتاب و سنت اور شریعت کی روشنی میں اجتہاد و استنباط کریں اور غیر منصوص امور کا حکم اصول شریعت کے ماتحت رہ کر خداداد نورِ فہم اور نورِ تقویٰ سے قرآن اور حدیث سے نکال کر امت کو فتویٰ دیں۔ اس طرح مجتہدین کو تشریع احکام کا ایک حصہ عطا ہوا اور یہ بھی تصریح فرمائی کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ دعوے کرے کہ مجھ پر اللہ کے احکام اور یہ اوامر اور نواہی نازل ہوئے ہیں اور مدعی شریعت ہے اور گردن زدنی۔

الہام کا حکم شرعی

حضرات انبیاء کرام کی وحی اور الہام کی حجیت میں تو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ حضرات انبیاء کرام کا تو خواب بھی حجتِ قطعیہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض خواب کی بناء پر

بیٹے کے ذبح کا ارادہ فرمایا جس کی حق جل شانہٗ نے قرآن کریم میں مدح اور توصیف فرمائی۔

البتہ اولیاء اللہ کے الہام میں کلام ہے کہ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

الہام کا حکم یہ ہے کہ اگر الہام کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور قواعد شریعت کے خلاف نہ ہو تو اس پر عمل کرنا جائز ہے۔ واجب نہیں۔ اور جو الہام کتاب و سنت و شریعت کے خلاف ہو اس پر عمل کرنا بالاجماع جائز نہیں۔ جو الہام قرآن و شریعت کے خلاف ہو وہ الہام رحمانی نہیں بلکہ وہ الہام شیطانی ہے۔ الہام کے صدق و کذب کا معیار ہی کتاب و سنت کی موافقت اور مخالفت ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کبھی اپنے الہام پر عمل نہ فرماتے تھے۔ جب تک کہ کتاب و سنت سے اس کی تصدیق و تائید نہ ہو جائے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ ابوسلیمان دارانیؒ یہ فرمایا کرتے تھے کہ الہام پر اس وقت تک عمل نہ کرو جب تک آثار سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے۔

حضرت غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فتوح الغیب میں فرماتے ہیں کہ الہام اور کشف پر عمل کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ قرآن اور حدیث اور اجماع اور قیاس صحیح کے مخالف نہ ہو۔

قاضی ثناء اللہ صاحبؒ ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ کا الہام علم ظنی کا موجب ہے۔ اگر کسی ولی کا کشف اور الہام کسی حدیث کے خلاف ہو اگرچہ وہ حدیث خبر احاد میں سے ہو بلکہ اگر ایسے قیاس صحیح کے بھی خلاف ہو کہ جو شرائط قیاس کو جامع ہو تو اس جگہ بمقابلہ کشف و الہام قیاس کو ترجیح دینی چاہئے اور یہ مسئلہ سلف اور خلف میں متفق علیہ ہے۔ مکتوبات میں حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:۔

"اے عزیز جان لے (خدا تجھے سمجھ عطا کرے اور سیدھے راستے کی ہدایت کرے) کہ طریق سلوک کے ضروری امور میں صحیح عقیدہ رکھنا ہے جو علمائے سنت نے قرآن و حدیث اور آثار سلف سے اخذ کیا ہے اور قرآن و حدیث کو انہی معانی پر محمول کرنا بھی ہے۔ جو علمائے حق یعنی علمائے اہل سنت والجماعت نے قرآن و حدیث سے سمجھے ہیں۔ اور اگر بالفرض محال ان اہل سنت کے سمجھے ہوئے معانی کے خلاف کشف و الہام کے ذریعے کوئی بات ظاہر ہو تو اس کا اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ مثلاً وہ آیتیں اور حدیثیں

جن کے ظاہری پہلوؤں سے وحدۃ الوجود سمجھ میں آتی ہے یا اسی طرح باری تعالیٰ کا ذاتی لحاظ سے ہر جگہ حاوی وساری ہونا اور ذاتی قرب ومعیت معلوم ہوتی - چونکہ علمائے حق نے ان آیات واحادیث سے یہ معنی نہیں سمجھے ہیں تو اگر راہِ سلوک کے دوران میں یہ باتیں منکشف ہوں اور خدا کے سوا کسی کو موجود نہ پائے یا خدا کو بالذات محیط سمجھے اور بالذات قریب پائے تو اگرچہ وہ سالک بوجہ سکر کی حالت کے غلبہ کے اس وقت معذور ہے لیکن اسے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے التجا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس چکر سے نکال کر اہل حق علماء کی درست رائے کے موافق امور اس پر ظاہر فرمادے اور ان سچے عقیدوں کے خلاف بال برابر بھی ظاہر نہ ہونے دے - غرض اہلِ حق کے سمجھے ہوئے معانی کو اپنے کشف کا معیار بنانا چاہئے - اور اس کے علاوہ اور کسی چیز کو اپنے الہام کی کسوٹی نہیں بنانا چاہئے - کیونکہ جو معانی اہلِ حق کے سمجھے ہوئے معانی کے خلاف ہیں وہ درجۂ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں - اس لئے کہ (یوں تو) ہر مبتدع اور گمراہ اپنے پیشوا کے معتقدات کو قرآن وحدیث سمجھتا ہے اور اپنی ناقص اور پوچ سمجھ کے مطابق قرآن وحدیث سے حقیقت کے خلاف معانی سمجھتا ہے (اور قرآن سے بہت سے گمراہ ہو جاتے ہیں اور بہت راہ پاتے ہیں) اور یہ جو میں نے کہا کہ اہلِ حق کے سمجھے ہوئے معانی معتبر ہیں اور اس کے خلاف معتبر نہیں یہ اس بنا پر ہے کہ انہوں نے ان معانی کو صحابہؓ اور سلفِ صالحینؒ سے اخذ کیا ہے - اور ان کے ستارۂ ہدایت سے نور حاصل کیا ہے - اسی لئے ابدی نجات اور دائمی فلاح ان کے لئے مخصوص ہوگئی (یہ لوگ ہیں اللہ کی جماعت اور سن لو کہ) اللہ کی جماعت ہی فلاح پانے والی ہے -

اگر بعض علماء باوجود صحیح عقائد جاننے کے جزئیات اور فرعیات میں حق کو چھپائیں اور اعمال میں تقصیر کریں تو اس سے مطلقاً تمام علماء کا انکار کرنا اور سب کو ملامت کرنا کھلی بے انصافی اور ہٹ دھرمی ہے - بلکہ یہ چیز (دوسرے الفاظ میں) اکثر ضروریات دین سے انکار کر دینا ہے - کیونکہ ضروریات دین کے روایت کرنے والے اور ان میں کھوٹے کھرے کی تمیز کرنے والے یہی علماء ہیں کہ اگر ان کا نورِ ہدایت نہ ہوتا تو ہم ہدایت نہ پا سکتے اور اگر ان کی طرف سے حق وباطل کی تمیز نہ کی جاتی تو ہم بھٹک جاتے - یہی وہ حضرات ہیں - جنہوں نے اپنی آخری کوشش تک دین کا بول بالا کرنے کے لئے صرف کر دی ہے - اور انسانوں کے بہت سے گروہوں کو

سیدھے راستے پر چلایا ہے۔ پس جس نے ان کا اتباع کیا اس نے نجات و فلاح پائی اور جس نے ان کی مخالفت کی وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسروں کے لئے بھی گمراہی کا ذریعہ بنا"

وجد، تواجد اور وجود

قلب پر ایسی مسرت و شادمانی یا رنج و ملال کی کیفیت طاری ہونے کو کہتے ہیں۔ جو بندہ کی حالت کو متغیر کر دے۔ یہ صورت کسی پُر اثر و با معنی شعر، مؤثر فقرے اور تلاوتِ کلامِ الٰہی وغیرہ سے پیش آتی ہے۔ اور اس کا نزول اللہ جلشانہٗ کی طرف سے ہوتا ہے۔ پھر اس کے دو مقام ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ وجد جو مشاہدہ سے خالی ہو وہ قطعاً کذب و دروغ ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جو بالمشاہدہ ہو اور یہ ان واجدین کی حقیقت ہے جن کی ارواح نہایت پاکیزہ اور لطیف ہوتی ہیں۔ ان کا کلام مردہ دلوں کو زندہ اور عقل کو زیادہ کرتا ہے۔ اور ان کا وجد تمیز کو اٹھا دیتا ہے۔ مکانات متعدد کو مکان واحد اور اعیان مختلفہ کو عین واحد کر دیتا ہے۔ بزرگانِ طریقت نے فرمایا ہے کہ وجد کی ابتدا حجابات کا اٹھ جانا، تجلیاتِ حق کا مشاہدہ کرنا، فہم کا حاضر ہونا، اسرارِ غیب کا ملاحظہ اور گم گشتگی و تنہائی کو پسند کرنا ہے۔

وجد کی شرط

یہ ہے کہ اس کے سبب سے اوصاف بشریت منقطع ہو جائیں اور جس وجد سے بشریت کا فقدان حاصل نہ ہو حقیقت میں وہ وجد، وجد نہیں ہے۔ پھر صحیح وجد کے دو مقام ہیں:۔ ۱ مقام ناظر

۲ مقام منظور الیہ

مقام ناظر سے مراد مقامِ مشاہدہ ہے۔ جیسا کہ اوپر ضمناً ذکر ہوا۔

مقام منظور الیہ سے مراد مقام غیب ہے۔ حق تعالیٰ اوّل وجد میں اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ کیونکہ تواجد استیعاب عبدیت کو لازم کرتا ہے۔

وجود کے معنی

وجود کے تین معنی ہیں۔ اول وجود علم لدنی (علم لدنی کا پانا) جیسے علم شواہد قطع ہو جائیں اور مکاشفہ حاصل ہو جائے۔ دوئم وجود حق (صحیح پا لینا) جس سے پھر انقطاع نہ ہو سکے۔

سوئم وجود سِر۔ جب بندے کو مکاشفہ جمال حاصل ہوتا ہے تو اس کے دل میں شکر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی روح میں خوشی پیدا ہوتی ہے اور سِر ظاہر ہوتا ہے۔

صحو۔ ترتیب افعال اور تہذیب اقوال کی جانب رجوع کراتا ہے اور یہ بغیر تجلیات حق حاصل نہیں ہوتا جب سلب وجود

غیر حق کی جانب مشغول ہوتا ہے پھر اسے حیرت طاری ہو جاتی ہے۔ مگر اس مقام میں حیرت شبہ نہیں ہے۔ بلکہ حیرت مشاہدہ عزت وکمال ہے اور صاحی جب ذاتِ حق کی طرف مشغول ہوتا ہے تو پھر اس پر کسی امر کا ورود نہیں ہوتا۔ کیونکہ صحو مقامات جمعیت لوائح وجود اور منازلِ حیات سے ہے۔ یعنی صحو اُن کے لئے ہے جن کو غیب کے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔

تلوین دل کی حالت کے تغیرات کا نام ہے۔ اہلِ دل کبھی مضطرب وبیقرار ہو جاتے ہیں۔ کبھی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جاتا ہے۔ کبھی ان پر خوف کا جذبہ طاری ہوتا ہے کبھی وہ مسرور وشاداں ہوتے ہیں۔ یعنی جب قلب اپنی حدود کو عبور کر کے صفات کی جانب متحرک ہوتا ہے تو اس وقت فقیر پر یہ حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ جیسے صفات گوناگوں ہیں' ان کی یہ گوناگونی قلب فقیر پر بھی وہی اپنی گوناگوں کیفیات پیدا کر دیتی ہے اور یہی تلوین ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں تلوین اہلِ حال کی ایک صفت ہے۔ بندہ جبتک اثنائے راہ میں ہے۔ برابر ایک حال سے دوسرے حال میں ترقی اور ایک وصف سے دوسرے وصف کی جانب منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اسی لئے صاحبِ تلوین کہلاتا ہے۔

تمکین فقیر تجلی صفات سے گزر کر جب تجلی ذات تک پہنچ جاتا ہے تو چونکہ ذات میں صفات کی طرح کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ اس لئے یہاں پر بھی اس کی حالت یکساں رہتی ہے۔ اور اس غیر مبدل کیفیت کا نام تمکین ہے۔

قبض وبسط قبض وبسط دو کیفیتیں ہیں جن کے لئے خاص وقت اور خاص کوائف اور موسم لازم ہیں۔ قبض وبسط نہ اس موسم ووقت سے پہلے ظہور پذیر ہوتی ہیں اور نہ اس کے بعد۔ یوں سمجھئے کہ جیسے شرط بغیر مشروط کے اور علت بغیر معلول کے نہیں ہوتی۔ مثلاً دھواں وہاں ہوگا جہاں آگ ہوگی۔ ایسے ہی قبض وبسط کا بھی ایک خاص وقت اور مقام ہے۔ جب تک درویش وہاں تک رسائی نہیں حاصل کر لیتا تب تک قبض وبسط کا اس سے کوئی معاملہ نہیں ہوتا یعنی ان دونوں کا وقت اور موسم بارشاد حضرت شیخ الشیوخ محبت خاص کے اوائل حال میں ہوتا ہے۔ گویا درویش جب صاحبِ نفسِ لوامہ ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ اس میں قبض وبسط کا ظہور ہوتا ہے۔ اسواسطے کہ وہ رتبۂ ایمان سے ایقان وحال محبت خاص کو ترقی کرتا ہے۔ سو کبھی حق تعالیٰ اسکو قبض کرتا ہے اور کبھی بسط کرتا ہے۔ اور نفس جب تک لوامہ رہتا ہے کبھی غالب رہتا ہے کبھی مغلوب۔ اسلئے اس کے اعتبار سے قبض وبسط کا سلسلہ بھی جاری سمجھا گیا ہے۔ پھر جب صاحب نفس لوامہ حجاب ظلماتی سے نکلیگا قبض وبسط کے تصرف سے بھی باہر ہو جائیگا۔

مشاہدہ مراقبہ کے ضمن میں پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ فقیر جب ہر چیز اور ہر کار سے فارغ ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اور اس کی جانب ظاہر سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا ہے تو اس کو مراقب یا راکب کہتے ہیں۔ اور جب اسی عمل سے آقائے حقیقی کے حضور میں حاضر ہو کر چشم باطن کھول دیتا ہے تو اس وقت اسے جو کچھ نظر آئے وہ شہود یا مشاہدہ کہلاتا ہے۔

مشاہدہ کا یہ مطلب نہیں کہ نظر کرنے والا حق سبحانہٗ تعالیٰ کو حس چشم سے دیکھ سکے۔ بلکہ جب ارواح و اشیاء پر بے نہایت انوار کا پرتو پڑتا ہے تو سب کچھ ایسے نیست و نابود ہوتے ہیں کہ گویا کبھی تھے ہی نہیں۔ اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا یا یوں سمجھئے کہ جب دل کا حضور ذکر کی حقیقت کے ساتھ ہو جو کہ حرف و آواز سے پاک ہے تو ذکر کے دوام کی وجہ سے ایسے درجہ پر ترقی ہوتی ہے کہ کسی اور چیز کی اس میں گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس حال میں دل کو مشاہد اور خداوندِ عالم کو شاہد کہتے ہیں۔ حضرت شیخ جاگیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مشاہدہ کی حقیقت یوں ہے مَنْ شَاهَدَ الْحَقَّ عَزَّ وَجَلَّ فِیْ سِرِّہٖ سَقَطَ الْکَوْنُ مِنْ قَلْبِہٖ کہ جو حق عزّ و جل کا مشاہدہ باطن میں کر لیتا ہے اس کے دل سے موجودات گر جاتے ہیں۔ شیخ عفیف الدین سہیلیؒ فرماتے ہیں کہ مشاہدہ کی کیفیت ایسی ہے کہ دیکھی جانے والی چیز اور دیکھنے والا ایک ہو جاتے ہیں۔

فنا و بقا جمہور اہلِ تصوف کے نزدیک فنا یہ ہے کہ سالک کو سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے نہ کسی چیز کا شعور باقی رہے اور نہ کوئی چیز نظر آئے۔ بلکہ اس کو ہر طرف انوارِ الٰہیہ ہی دکھائی دیں۔ اس فنا میں جو حالتیں طاری ہوتی ہیں، جو کیف حاصل ہوتے ہیں اور جو مشاہدات بروئے کار آتے ہیں ان کی لذتوں کو کچھ سالک ہی کا دل محسوس کر سکتا ہے۔ فنا کے تین درجے ہیں۔ جو عوام میں زبان زد ہیں۔ مثلاً فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول، فنا فی اللہ۔ ہر درجہ اور ہر منزل انوار و تجلیات کی جلوہ گاہ ہے اور ہر مرحلہ پر حجاب اٹھتے اور مقامات کھلتے چلے جاتے ہیں۔

پھر ان درجات کے علاوہ فنا کے اقسام بھی تین ہیں۔ جو اہل اللہ نے یوں ذکر فرمائے ہیں:۔

۱۔ فنا وجودی ۲۔ فنا عدمی ۳۔ فناء الفناء

۱۔ فنا وجودی وہ ہے کہ کل اشیاء کا وجود عارف کی نظر میں نیست و نابود ہو جائے اور جداگانہ ہر فرد میں ذاتِ خدا جلوہ گر ہو۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے یہی معنی ہیں۔ لیکن اس میں شرک خفی کا اشتباہ ہے کہ ناظر و منظور مستثنیٰ و مستثنیٰ منہ ہنوز موجود ہے اور اس کو توحیدِ وجودی بھی کہتے ہیں۔ جہاں ظاہر کی نفی کے ساتھ عارف کو اپنی نفی بھی لازم ہے۔

۲- فنا عدمی وہ ہے کہ وجود اشیاء کی بجائے وجودِ حق کا ادراک جو عارف کو حاصل ہوا ہے وہ بھی فنا ہو جائے۔ اور ایک ذات خارج از شئے ولاشئے اور ماورائے وجود و عدم جلوہ گر ہو۔ اس وقت وحدہٗ لاشریک لہٗ کے معنی منکشف ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں شرک اخفیٰ ہے۔ کیونکہ ابھی وقوف وادراک باقی ہے جو مستلزم دوئی ہے۔

۳- فناء الفنا۔ یعنی فناءِ اتم وہ ہے کہ وقوف و شعور، حس وادراک، وجود و عدم، عین و غیر وغیرہ، خودی و خدائی یاد و وجود، ذکر و فکر، ہمت و نیست کا کچھ اثر باقی نہ رہے۔

نیز اس منزل میں یہ ضروری نہیں کہ جو اطوار و احوال فنا ایک درویش پر وارد ہوں۔ دوسرے پر بھی وہی منکشف ہوں۔ کیونکہ اس معرفت کے بحرِ ناپیداکنار میں ہر دم نیا مد و جزر ہوتا رہتا ہے۔ اور ہر آن نئی نئی امواج اٹھتی رہتی ہیں۔ لہٰذا عارف کا طریق کار اور استعداد کا فرق یہاں بھی اختلاف پیدا کر دے گا۔ مگر باوجود اس اختلاف کے ہر ایک کا علم و انکشاف اور عرفان وادراک بجائے خود صحیح و درست ہوگا۔ جس میں شک و شبہ اور اعتراض و محبت کی قطعاً گنجائش نہ ہوگی۔ جیسا کہ خواجہ علاؤالدین عطارؒ فرماتے ہیں کہ جس کا عشق زیادہ ہے، اس کا اپنے آپ سے غائب ہونا بہت ہوگا۔ اور معشوق سے حضوری زیادہ ہوگی۔ جب ملک اور ملکوت طالب پر پوشیدہ ہو جائیں۔ تب فنا وارد ہوتی ہے۔ اور جب سالک کی اپنی ہستی بھی اس پر پوشیدہ ہو جائے فنا پر فنا پا جائے گا۔

خواجہ عبیداللہ فرماتے ہیں کہ دل کا خالی ہونا اس پر موقوف ہے کہ ذات کی تجلی احدیت کے وصف کے ساتھ ہو اور اس مطلب کا حصول یوں ہو سکتا ہے کہ پہلے تو اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام اور جو کچھ وہ خدا کے پاس سے لائے ہیں اور جو کچھ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوا ہے، خداوند عالم جل مجدہ اور اس کے رسول علیہ السلام کی مرضی کے مطابق اُن سب پر ایمان لایا جائے اور پھر اس کے اسباب یعنی ریاضات و مجاہدات کہ جن سے شریعت نے منع نہیں کیا استعمال میں لانا اور ذکر کا ہمیشہ کرنا بشرطِ اعتقاد مذکور عجز و انکساری کے ساتھ جس میں ریا نہ ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت پر پورا خضوع ہو۔ لیکن اس نسبت کے حاصل کرنے میں اس سے بڑھ کر کوئی قوی سبب نہیں کہ پورے صدق و خلوص کے ساتھ ایسی جماعت کی صحبت و مجلس اپنے وقت کیلئے لازم پکڑے کہ جن کا باطن اس تجلی کا مظہر ہو گیا ہو۔ اور اس تجلی کے غلبہ سے غیر کا وجود ان کے سامنے سے ہٹ گیا ہو۔ غیر کے شہود سے پورے طور پر آزاد اور حقیقی فنا میں اپنے اور غیر کے شعور کی مزاحمت سے

پاک ہو چکے ہوں۔ کیونکہ وہی لوگ انعاماتِ الٰہیہ کے ماتحت بے خودی وسکر سے افاقہ حاصل کرکے دوسروں کے لئے سعادت حقیقیہ کا جس کو فنا وبقا کہتے ہیں واسطہ بن سکتے ہیں۔

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں کہ ذات کے شہود میں ہلاک اور غرق ہو جانا۔ یہاں تک کہ غیر کے وجود کا شعور تک نہ رہے بلکہ اس مقام میں اگر ترقی واقع ہو تو تجلیات اسماء کے ذوق سے بھی شعور معدوم ہو جائے تو فانی کہلائے گا۔

اور بقا اسی فنا سے حاصل ہوتی ہے جس کا انقطاع ناممکن اور زوال و فنا قطعی معدوم ہوتے ہیں۔ جو حضرات اس درجہ کو حاصل کر لیتے ہیں ان کی حیثیت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ وہ عالم علم لدنی اور واقف اسرارِ الٰہی بن جاتے ہیں جس سے ایک عجیب قسم کا پُر کیف رعب قلب پر طاری ہُوا کرتا ہے۔ اس حال میں سَو سَو سوال و جواب ہُوا کرتے ہیں۔ مگر اس حال کی میعاد کبھی آنکھ کا جھپکارا اور کبھی بہت دیر پا ہوتی ہے چنانچہ حضرت امام الاولیاء بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ چاندرات تھی اور سارے جہان پر ایک سکون وسکوت طاری تھا کہ مجھے ایک ایسی حضوری ہوئی، جس کے سامنے ساری کائنات ایک ذرہ معلوم ہوتی تھی۔ پھر میرے دل سے ایک شور اٹھا اور مجھ پر عجیب رعب کے ساتھ ایک پُر کیف حالت طاری ہو گئی میں نے اسی حال میں بصد ذوق بارگاہِ ایزدی میں گذارش کی کہ الٰہی ایسی عالیشان، باعظمت بارگاہ خالی اور پوشیدہ کیوں ہے؟ حکم ہُوا کہ ہر نااہل کو اس بارگاہ میں دخل نہیں ہے پھر میں نے یقین کی آنکھوں سے نور کا جلوہ دیکھا۔ جس کی وجہ سے میں محسوس کرتا تھا کہ نہ میری آنکھیں ہیں اور نہ کان نہ میری ہستی ہے نہ وجود، نہایت طمانیت وسکون کا عالم تھا۔ میری تمام ظاہری وجودی صفات معدوم اور تمام کسبی علوم فراموش ہو گئے اور میں نے معلوم کیا کہ میں ایک پرندہ ہوں اور صفاتِ الٰہیہ کی فضا میں پرواز کر رہا ہوں اور میں نے چشم زدن میں چار ہزار وادیاں طے کی ہیں۔ اسی طرح حضرت خواجہ ابوالحسین نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے پُر سکون وقت میں ایک تجلّی دیکھی جو محسوسات سے پرے غیب تک پھیلی ہوئی تھی اور میں اس کو اتنا عرصہ دیکھتا رہا کہ میں اس میں گم ہو گیا۔ علی ہذا ان کے اس وصفِ بقاء میں کوئی ایک فانی شے بھی ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ فناء وبقاء دو متضاد چیزیں اور متخالف اوصاف ہیں۔

یہ فناء و بقاء وہ نہیں جو عوام الناس کے نزدیک عام معانی و مفہوم میں لی جاتی ہیں بلکہ یہ مقام روحانیت ہیں وہ وصف ہیں جو الفاظ کے حدود اربعہ میں نہیں آ سکتے۔ کیونکہ یہاں علم کا کام نہیں، مشاہدہ کی کارفرمائی ہے۔ اور اگر

الفاظ میں لاکر سمجھانے کی سعی بھی کی جائے تو عوام کی عقول کے ٹھوکر کھا جانے کا اندیشہ ہے ۔ مثلاً ابلیس اور منصور نے ایک ہی قسم کا جرم کیا ۔ ابلیس نے آنا کہا تو لعنت پڑی اور منصور کی زبان پر یہی لفظ آیا تو اسے درجۂ تقرب عطا کردیا گیا ۔ فرعون نے دعوئے خدائی کیا تو ذلیل ورسوا ہو کر سارے جہان میں بدنامی کی موت مرا اور ایک بزرگ من خدائم، من خدائم، من خدا کہتا ہے تو وہ مقبول بارگاہ کہلاتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ حسن نیت وحسن ارادہ پر ہی حسن عمل کا حکم لگایا جاسکتا ہے ۔ ابلیس کا مطلب اس لفظ سے بقا وبقا تھا ۔ اس لئے اس عطا کردہ نعمت چھین لی گئی ۔ اور اس کا منصب مسلوب ہوگیا ۔ لیکن حضرت منصور کا مطلب فنا تھا کہ وہ خودی بخدا کے بغیر باقی رہے ۔ اس لئے اس کو مجلس وصال کی شرکت کا فخر حاصل ہوگیا ۔ گویا یہ اس کی ذاتِ واحد میں فنا اور ابلیس اپنے آپ میں بقا کا مدعی بنا غرضیکہ یہ فنا وبقا کے مقامات عالیہ کا ایک وہ روحانی مسئلہ ہے جس کے سمجھنے کے لئے بے انتہا بلند اہلیت بھی ہونی ضروری ہے ۔ بہرکیف چشمِ باطن کشادہ رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ بندے تجلیات کے میدان میں بقدر قابلیت واستعداد ہوتے ہیں ۔ اور یہ تجلیات بھی حوصلہ وظرف کے مطابق ہوتی ہیں ۔ یعنی کسی پر کوئی صفت متجلی ہوتی ہے اور کسی پر کوئی وصف تجلی فرماتا ہے ۔

محو واثبات

محو نام ہے صفات عادی کے ادا ہو جانے کا اور اثبات نام ہے احکام عبادت کے قائم ہو جانے کا پس جس نے اپنے احوال سے صفات بد کو دُور کر دیا اور ان کی بجائے افعال واحوال حمیدہ پر قائم ہو گیا ۔ وہ صاحب محو واثبات ہے ۔

فنائیت فی اللہ کے اسرار

الغرض فنا ایک وہ مقامِ بلند ہے جس پر متمکن انسان ایک پیکرِ روح رہ جاتا ہے اور جب وہ فنا فی الشیخ ہوتا ہے تو تدریجی طور پر اس کی قوتیں بڑھتی اور شیخ کی قوتیں اس کو ایک حد تک حاصل ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد کچھ درمیانی مراحل طے کرنے کے بعد (جن کا ذکر یہاں کتاب کی طوالت کی وجہ سے نہیں کیا گیا) وہ فنا فی الرسول کے رفیع تر مقام میں داخل ہوتا ہے ۔ جہاں اس میں تدریجی طور پر ایک حد تک نبوی اخلاق ورسولی محاسن پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ طاقتیں بڑھ جاتی ہیں ۔ اور روحانیت قوی ہو کر منزل بمنزل راہ طے کرتا ہوا وہ فنا فی اللہ کے مقام بلند اور قصرِ رفیع میں پہنچ جاتا ہے ۔ ذات احدیت غیر محدود طاقتوں کی حامل ہے ۔ اس میں انسان جتنی ترقی کرتا ہے اتنی ہی اس کی قوتوں میں زیادتی ہوتی جاتی ہے ۔ اور یہ

زیادتی ایسی ہوتی ہے جس کی کوئی انتہا ہی نہیں رہتی۔ ذاتِ احدیت کے اختیارات لامتناہیہ کا یہ ایک معمولی کرشمہ ہے کہ وہ ایک لفظ کُن میں سب کچھ کر سکتی ہے اور بندہ بھی جب فنا فی اللہ کی حقیقت میں اتر جاتا ہے تو اس میں بھی اس کی عنایات بے غایات سے کُن فیکونی قوتیں ودیعت ہو جاتی ہیں۔ بندہ بھی اس وقت ایک لفظ کُن سے جو چاہے بارادۂ الٰہی کر سکتا ہے اور اس کی زبان سے جو نکل جائے اسی وقت ہو جاتا ہے اور یہ دعویٰ و درجہ کوئی تجاوز عن الحد چیز نہیں جس پر ناواقف حاملانِ علم ظاہری کافر و مشرک بنانے والی مشین کو متحرک کر سکیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جس کی نسبت حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں جب بندہ کو محبوب بنا لیتا ہوں تو وہ میری آنکھ سے دیکھتا ہے۔ میرے کانوں سے سنتا اور میری زبان سے بولتا ہے۔ پھر جب سب کچھ اس کا ہو گیا تو اب کُن کہنے والا بھی وہی ہو گا اور آواز بھی اسی کی ہو گی صرف حلق بندے کا ہوتا ہے۔ جیسے کہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔ شعر

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

چنانچہ شیخ عبدالکریم جیلی اپنی کتاب انسان کامل کے باب ۱۳ میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالےٰ اپنے بندے پر تجلی فرماتا ہے تو بندہ اس کے نور میں فانی ہو جاتا ہے۔ پس اگر پکارنے والا کوئی شخص اس حالت میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو یہ بندہ فانی اس کا جواب دیتا ہے اور مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ کا نقشہ جم جاتا ہے۔ اور اگر بندہ ترقی کر کے بمقام بقاء واصل ہو تو اللہ تعالیٰ اس بندے کے پکارنے والے کو جواب فرماتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص کسی بزرگ کو یا شیخ فلاں کہہ کر پکارے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں لبیک فرمائیں گے۔ سمجھنے کے لئے یہ ایک مثال کفایت کرتی ہے کہ لوہے کو اگر آگ میں ڈالا جائے تو آگ کی تمام صفات اس پر وارد ہو جاتی ہیں اور وہ اعمال کے لحاظ سے جلانے، پھونکنے اور روشن ہونے میں اگر اپنے آپ کو آگ کہہ کر اس حرف کُن کا مدعی ہو جائے تو کیا استحالہ لازم آتا ہے۔ وہ جلا بھی سکتا ہے اور روشن بھی کر سکتا ہے۔ اللہ کریم جل مجدہٗ کی رحمت و عنایت تو بہت بے پناہ اور بڑی چیز ہے۔ اور پھر اس بے انتہا پر ہی موقوف نہیں۔ بعض اوقات یہ طاقتیں فنا فی الشیخ اور فنا فی الرسول کی منزلوں میں بھی اولیاء و اصفیاء کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ وَذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ

عوام و ناواقف نہ سمجھیں مگر واقف اسرار خوب جانتے اور سمجھتے ہیں کہ جس طرح فنافی الشیخ اور فنافی الرسول ہو کر انسان شیخ اور رسول نہیں بن جاتا اسی طرح فنافی اللہ ہو کر بھی اس میں خواہ کتنی ہی قوتیں اور قدرتیں پیدا ہو جائیں اور وہ لفظ کُن میں سب کچھ کر سکے مگر خدا نہیں بن جاتا۔ رہتا پھر بھی بندہ ہی ہے۔ بلکہ یہاں پہنچ کر اس کی مسکینی و انکساری اور عاجزی و عبودیت، تقوٰی و خشیت میں بے انتہا اضافہ ہو جاتا ہے اور سب طاقتیں حاصل ہونے کے باوجود بندۂ تسلیم و رضا ہی کہلا سکتا ہے۔ مخلوق کے ہر قسم کے جور و استبداد سہتا ہے مگر قوت کا مظاہرہ نہیں کرتا اور مشیت ایزدی میں اسکا دخیل ہونا بھی شاذ ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس مقام پر اس کے لئے سب سے بڑی صفت عبودیت و راضی برضا ہونا ہوتا ہے۔ اور بقول شاعر "زندہ ہے جو زندہ سے سروکار رکھیگا" اس وقت یہ بندہ گو فانی ہوتا ہے۔ مگر جس میں فنا ہوا ہے وہ باقی ہے۔ اس لئے یہ فانی بھی فانی نہیں رہتا۔ اور اس درجہ پر پہنچ کر فی الحقیقت اس کا مرتبہ اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ اس کی یہ قوتیں ظاہری جسمانی موت و انتقال کے بعد بھی قائم رہتی ہیں۔ اور وہ زیر لحد بھی پڑے ہوئے سب کچھ کر سکتا ہے۔ کیونکہ اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا یَمُوْتُوْنَ وَلٰکِنْ یَنْتَقِلُوْنَ مِنْ دَارٍ اِلٰی دَارٍ۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اولیاء اللہ مرتے نہیں بلکہ وہ ایک گھر کو چھوڑ کر دوسرے گھر میں آ جاتے ہیں۔ جو صرف نقل مکانی ہوتی ہے۔

اوراد و وظائف

چونکہ ہمارے حواس محض جسموں کو ٹٹولنے، دیکھنے، ان کی سننے اور ان کو سونگھنے تک محدود ہیں اور جس ذات کی ہمیں تلاش ہے وہ مجرد اور ہمارے ہر خیال سے اتنی بلند و برتر ہے کہ ایک ہیچ مایہ انسان اس کے اتصال کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس مسئلے پر غور کرانا اور سمجھانا صرف تصوف کا موضوع ہے۔ تصوّف قال نہیں حال ہے اور وہ انسان کے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا کرنے کا خواہشمند ہے۔ جس سے انسان کا دل خداوند عالم جل وعلا شانہ' کو خود اپنی نظروں سے دیکھے اور اس کی قدرت کو اپنے سامنے متجسم پائے۔ ہمارے نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کے جواب میں اس حقیقت کی جانب بدیں الفاظ اشارہ فرمایا تھا کہ عبادت اس طرح کرنا گویا خدا کو تم دیکھ رہے ہو۔ یا اگر یہ کیفیت طاری نہیں تو یوں سمجھو کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے۔

تصوّف اور صوفی کی تعلیم ہر متلاشی انسان کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ اپنے مولا کریم و رب رحیم کو دیکھ سکے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیونکر۔ اس کا جواب ایک اور صحیح یہ ہے کہ تصوف کے نزدیک خداشناسی کا راستہ بندہ کی خود اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے۔ اور جب بندہ اپنے آپ پر دھیان کرتا ہے۔ اور سوچتا ہے۔ کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ کہاں سے آیا اور کہاں جاؤں گا۔ تو گویا اس نے اپنے آپ کو پانے کا رستہ اختیار کر لیا پھر جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اس نے خدا کو پہچان لیا اور مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ بِالْفَنَاءِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ بِالْبَقَاءِ

اپنے آپ کو پانے اور پہچاننے کے لئے صوفیاء کرام ذکر و اذکار و اعمال و اشغال تجویز فرماتے ہیں۔ ریاضتیں مجاہدے اور مراقبے بتاتے ہیں۔ چلہ و نفس کشی اور تصوّر کرنے سکھاتے ہیں۔ اور کبھی ارادتمند پر خود اپنی توجہ ڈال کر باطنی قوتوں کو بیدار کرنے کی جو بھی صورتیں ہو سکتی ہیں، ان کی مشقیں کرواتے ہیں تاکہ ان طریقوں سے متلاشی کا نفس باطنی بیدار ہو جائے کیونکہ شریعت میں جو حیثیت عبادات و احکام کی ہے بعینہ وہی حیثیت طریقت و تصوف

میں جذب وسلوک کی ہے، جو حقیقت عمل ہماری فقہ میں حنفیت، شافعیت، مالکیت، حنبلیت کی ہے، ویسے ہی سہروردی، نقشبندی، قادری، چشتی طریقوں کے درویش نفس باطنی کے تصفیہ اور ترقی کے لئے اپنے اپنے اوراد و وظائف بتاتے ہیں۔ اور جیسے ہمارے یہ فقہی مسائل مذاہبِ اسلام کے قانون کی تفسیر ہیں۔ ایسے ہی تصوّف کے یہ طریقے بھی اسلام کی اصل بنیاد، احسان کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ جن سے انسان میں اپنے معبودِ برحق کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس مقامِ بلند پر اپنے مشاہدہ کی کمند پھینکتا ہے۔ جہاں ذاکر، ذکر اور مذکور ایک ہو جاتے ہیں۔

گویا مقامات احسان وعرفان کی ابتدا یوں ہے کہ آدمی کے دل میں ایک پُر درد و پُر زور اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ ایمان والایقان حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات اس کو اپنے پرانے اصولوں اور وراثت میں ملے ہوئے عقیدوں پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ ایمان والایقان اس کے قلبِ حق طلب سے یوں پھوٹیں جس طرح چشمے سے پانی پھوٹتا ہے۔ آہستہ آہستہ اوراد و وظائف کے عمل سے اس کے دل سے تمام اوہام وشکوک کی ظلمت چھٹتی اور بے اطمینانی کی تاریکی دُور ہوتی جاتی ہے۔ شیخ کامل کی توجہ سے وہ آگے بڑھتا ہے اور تقویٰ وزہد کے مدارج طے کر کے ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا دل تمام نفسانی آرزوؤں اور خواہشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور اسے وجدانی ذوق کی لذّت نصیب ہوتی ہے۔ غرضیکہ ایسے بے شمار منازل و مقام ہیں جن کے طے کرنے اور اپنے نفس کے تصفیہ و ترقی یافتہ بنانے کے لئے سالک کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کا واحد ذریعہ وہی اوراد و وظائف، وہی اعمال و اشغال، وہی چلّے اور مراقبے ہیں۔ جن کو پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اور کچھ اس بحث کے ضمن میں کیا جائے گا۔ کیونکہ اسی غرض وغایت کے پیش نظر فقیر کے متوسلین میں سے بعض احباب نے اختتام کتاب ہٰذا پر یہ التجا کی کہ سلسلہ عالیہ سہروردیہ کے بعض وظائف واوراد اور ختم خواجگان سہروردیہ رحمہم اللہ تعالےٰ ودعائے متوسلہ وغیرہم آخر کتاب میں ضم کر دیئے جائیں۔ تاکہ طالبین کو تلاش وتردد نہ ہو۔ لہٰذا حسب استدعا احباب بعض اوراد و وظائف کو ذکر کر دیا جاتا ہے۔ مولا کریم توفیق عمل عطا فرمائے۔

یاد رہے کہ ان تذکار و اشغال کے علاوہ جو کتاب ہٰذا میں مذکور ہو چکے ہیں، مبتدی کو حسب ضرورت ان

وظائف کا عامل بننا چاہئے جو اس کو گمراہی کے گڑھے میں نہ پھینک دیں۔ کیونکہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بغیر کسی کامل کی اجازت کے خود ساختہ وظائف پر عمل کر کے ایسے خطرات نفسانیہ و وساوس شیطانیہ میں گھر گئے ہیں کہ پھر ان کو شیطانی تصرف سے بچ نکلنے کی راہ ہی نہیں ملی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگانِ دین کے فرمودہ طریقوں پر عمل کرنے سے بھٹکنے کا کوئی خوف نہیں ہوتا اور کامیابی کی منزل سامنے ہوتی ہے۔ اگر خدانخواستہ مبتدی کی کمی استعداد سے اس کو اپنی طلب میں جلد کامیابی نہ بھی ہو تو نامراد بھی نہیں رہیگا۔ کسی بزرگ سے کسی حاجتمند نے کسی غرض کے لئے کوئی وظیفہ پوچھا تو انہوں نے جو مناسب حال خیال کیا فرما دیا۔ وہ طالب کچھ عرصہ کے بعد پھر آیا اور عرض کرنے لگا کہ حضرت مجھے آپ کے فرمودہ وظیفہ سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا، اور نہ ہی مطلب پورا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ میاں مسنون طریق پر ذکر الٰہی کرنا اور اس کو اپنی طلب وجلب منفعت کا وسیلہ بنانا ایسا ہے جیسے گیلی مٹی یعنی پانی میں ملی ہوئی مٹی کا غلولہ بنا کر اگر کسی جگہ پھینکا جائے تو پہلی بات یہ ہے کہ وہ جہاں پھینکا جائے وہاں چمٹ جاتا ہے اور رائیگاں نہیں جاتا اور اگر خدانخواستہ وہ نہ چمٹے اور گر بھی جائے تو دیوار پر اپنا نشان ضرور چھوڑ آتا ہے۔ تو جا اور پوری احتیاط و بلند ہمتی سے اکل حلال وصدق مقال اور تقویٰ و ورع کے ساتھ پھر کر، مولا کریم کامیاب فرمائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سائل کامیاب ہو گیا۔

پس فقیر یہاں وہ وظائف درج کتاب ہذا کر دیتا ہے جو درویشان سہروردیہ کا معمول رہے ہیں۔ اور جن پر عمل پیرا ہونے سے بفضلہ تعالیٰ مبتدی کبھی ناکام و خاسر نہیں رہے گا۔ مگر استقامت قلبی و قوت ارادی کی ضرورت ہے۔

۱۔ تلاوت کلام اللہ یہ سب سے بہتر اور نہایت ضروری وظیفہ ہے۔ جس قدر ممکن ہو پابندی سے تلاوت کرنا اور اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ پر شدت سے عامل ہونا چاہئے اور تلاوت کلامِ الٰہی کا سب سے بہتر وقت فجر کا ہے۔ کیونکہ اسی وقت کے لئے ارشاد ہوا ہے اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا یعنی بوقت فجر تلاوت کلام اللہ مشہود بنائی گئی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ میں خداوند تعالیٰ جل وعلا شانہٗ سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل کروں تو وہ قرآنِ کریم پڑھے۔

قرآن کریم کا پڑھنا عوام میں مختلف طریقوں سے رائج ہے۔ مگر صحیح طریق وہ ہے جو حفظ کر کے اور ترجمہ سمجھ کر نہایت غور و فکر سے پڑھا جائے اور اس بات پر انتہائی سوچ بچار کو کام میں لایا جائے کہ ہمارے حکیم مطلق نے کیا تعلیم فرمائی ہے

فی زمانہ تراجم کی اس قدر بھرمار ہے کہ صحیح عقائد کے ترجمے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ جتنی بدعقیدگی کے ماتحت ترجمہ ہوتا ہی اس کو رنگینیوں اور خوبصورتی میں چھپایا جاتا ہے تاکہ اس حسنِ طباعت کے جلوے میں یہ بدعقیدگی کی زہر اپنا پورا اثر کر سکے۔ مگر مسلمان ہیں کہ ان کے نزدیک عقیدے کی پاکیزگی کوئی ضروری شے ہی نہیں رہی۔ ہر بدعقیدہ کے ترجمے کو پڑھنے اور ہر بے راہرو کے علم وعمل کو اپنانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ عمل سے زیادہ نازک مقام عقیدہ کا ہوتا ہے۔ اور اگر عقیدہ صحیح نہ ہو تو قرآن پڑھنے کو عیسائی، یہودی، آریہ اور سکھ معترضین نے بھی پڑھا ہوتا ہے جو مسلمان یا حق پرست کہلانے کے مستحق نہیں ہوتے۔ اس لئے خود قرآنِ کریم سمجھنے کے لئے ترجمہ وہ منتخب کرنا چاہئے جس میں مرادی معنوں اور تاویلوں کا دخل نہ ہو۔ ورنہ ایمان کا ضائع ہو جانا کوئی بعید نہ ہوگا۔ العیاذًا باللہ فقیر کی دانست میں اکثر تراجم ان ہی نقائص کے حامل ہیں اور حقیقت کے قریب ترجمہ حضرت اعلیٰحضرت قبلہ فاضل بریلوی (مولٰنا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ) کا ہے۔ جو تلاوت کے وقت پیش نظر رکھنا چاہئے۔

۲۔ لطائفِ ستہ درویش کو چاہیئے کہ جب اوراد و اذکار سے فراغت فرمائے اور قدم اس کے آگے جادۂ افکار کی جانب بڑھائے تو ثابت قدم رہ کر عزم مستحکم رکھے اور فقیر کو لطائفِ ستہ کے متعلق اپنے پیرومرشد رحمۃ اللہ علیہ سے جو ارشاد ہوا ہے پوری طرح معلوم کرکے اپنے دل میں جگہ دے۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ نے اپنی حقیقت کا نمونہ بنایا ہے۔ اور اس کے اندر لطائف ستہ پیدا فرمائے ہیں اور اسے اپنی جمالی وجلالی صفتوں سے نواز کر سرفراز وممتاز فرمایا۔ اور تمام نیکیوں اور سعادتوں کا منبع گردانا اور اپنے نور سے اسے منوّر کیا۔

اوّل لطیفۂ نفس ہے۔ یہ اس کو نصیب ہوتا ہے جو ذوق وشوق سے خداوند قدّوس کو یاد کرے۔ وہ کون مبارک درخت ہے کہ اس میں یہ پھل آئے اور کون وہ درویش ہے جو ذکرِ خدا میں رات کو دن بنائے۔ اور کون وہ فقیر ہے جس کا وقت اس کی فکر میں ہی صرف ہو۔ نورِ ذات وہ نور ہے کہ اس کا بیان بشکل اور اس کی کیفیتیں بغیر نشان کے محال۔ ہاں بزرگانِ دین نے راسخ العقیدہ مریدوں کی تعلیم کے لئے چند علامتیں مقرر فرمائی ہیں اگر ان علامتوں کو معمول بنائے تو مطلوب ومقصود سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

لطیفۂ نفسی کا بیان اسم اللہ کو بترۂ سے کہ اسے لطیفۂ نفسی اور قلب نیلوفر کہتے ہیں اس طریق پر ملاحظہ کرے۔ کہ

وضو کر کے اور قبلہ رو ہو کر سر کو مراقبہ میں جھکا کہ ناف پر نظر رکھتے ہوئے نام پاک اللہ اللہ ناف سے ذرا اوپر دل سے ذکر کرے اور زبان بند رکھے اور اندرونی آواز سے مشغول ہو اور جیسا کہ استاد شاگرد کو تعلیم دیتا ہے۔ سالک خود بھی ساتھ اللہ اللہ کرے۔ اور یہ مراقبہ اس طریق پر ہو کہ فرش زمین سے عرش تک سوائے ذات اللہ کے اور کچھ اس کے خیال میں نہ آئے یہاں تک کہ فیوضِ الٰہی اسے ڈھانپ لیں۔ اور ذات پاک اللہ جلّ شانہٗ میں جذب کر دیں۔ اور نورِ حق کے سوا اس کے لئے اور کچھ نہ ہو۔ اور اسی حالت میں تجلیات غیبی اور ذات حق سبحانہٗ تعالیٰ کا ظہور ہو۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے ؎

نیست غیر از یک صنم در پردۂ دیر و حرم — کے بود آتش دو رنگ از اختلافِ سنگہا

بیت:- بفکرِ نیستی ہرگز نمی افتند مغروراں — اگرچہ صورتِ مقراض را باشد گریباں ہا

دوم لطیفہ قلبی

سلسلۂ عالیہ قادریہ سہروردیہ کے بزرگان رحمہم اللہ نے اس کے متعلق یوں ارشاد فرمایا ہے۔ کہ قلب بائیں پہلو میں ایک مخروطی اور انڈے کی شکل کی ایک چیز ہے۔ جسے قلبِ صنوبری کہتے ہیں۔ اور وہ بائیں پستان کے نیچے ہے۔ سالک کو چاہئے کہ صبح اور دوپہر دن میں اور شام کو علیحدہ ہو کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر زبان کو تالو سے لگا کر لفظ اللہ جو کہ باری تعالیٰ کی ذات اور صفات پر حاوی ہے۔ سر نیچے کر کے قلبِ صنوبری پر ضرب دے۔ اور اتنی ہی دیر تک یہ وظیفہ جاری رکھے۔ کہ لفظ اللہ دل سے سنا جا سکے۔ بلکہ آہستہ آہستہ جیسا کہ جانور کو تعلیم کرتے ہیں زبان سے بغیر کہے ہوئے دل سے انشاء اللہ تعالیٰ کہے۔ عنایتِ الٰہی اور توجہاتِ مرشد ارشاد پناہی سے دل سے آواز پیدا ہو گی۔ جو دو طرح سے ہوتی ہے۔

ایک یہ کہ جسے دل کہتے ہیں۔ اس کی حرکت سے آواز پیدا ہو۔ دوئم یہ کہ قلب سے مل کر تمام بدن سے آواز برآمد ہو اور یہ طریقہ اعلیٰ وارفع ہے۔ رنگِ قلب سرخ رنگ ہے۔ اور تجلیاتِ الٰہی جو آگ کی مانند ہیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور ان کے حاصل ہونے سے سالک اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ اور اس کے تمام گناہ اور لغزشیں نیکیوں سے بدل جاتی ہیں۔ دل کا نور اسی شغل سے اس قدر ضیا پاش ہو جاتا ہے کہ تاریک رات میں بھی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔ اور اولیاء اللہ کی زیارات سے مشرف ہوتا رہتا ہے۔ اور جذبات وعنایات الٰہی سے الیسا پُر ہو جاتا ہے کہ خداوندِ عالم اسے اس درجہ پر فائز فرما دیتے ہیں جس سے طالب اس شغل سے بلند ترین درجہ پر پہنچ کر خود کو ڈھونڈتا ہے۔ مگر نہیں پا سکتا۔ اور کوئی نشان اپنا اسے نظر نہیں آتا۔

پس قلبِ صنوبری اس چیز کا مظہر ہے کہ قلبِ محمدی سے آمیختہ یعنی ملا ہوا ہے۔ اور آپ کے نور سے منور ہے اور قلبِ محمدی قلبِ بیرنگ کا مظہر ہے۔ جس نے نشان اسکی بے نشانی سے لیا ہے۔ اور اسطرح اسکی نسبت مرتبہ بیرنگی ہے۔ اور یہ وحدت کا ظہور ہے۔ اگر نقشِ اللہ کا دل پر قائم اور درست نہ ہو تو چاہیئے کہ لفظ اللہ کاغذ پر لکھ کر نظر کے سامنے رکھے اور اس طرح اس کی طرف نظر جمائے۔ یہاں تک کہ اس کا مشاہدہ ہو۔ اور جب نقش اللہ بغیر لکھا دیکھے ہوئے نظر کے سامنے آجائے تو اپنی نظر کو ہٹا کر دل کی طرف لے جائے اور اللہ کی ذات کا مشاہدہ اس پر کرے انشاء اللہ کامل استعداد مرشد کی برکت اور رب العزت کی عنایت سے اللہ کا نشان دل پر درست ہو جائیگا۔ اور آنکھیں اور دل مراقبہ میں اسے بعینہٖ دیکھ سکیں گے۔

سوئم لطیفۂ روحی

درویش پر جب لطیفۂ قلبی کی حقیقت کماحقہٗ کھل جائے اور وہ تجلیاتِ خداوندی کی کیفیت پالے انوار کا مشاہدہ کرلے اور اللہ کی رحمت اسے آغوش میں لے لے تو پھر اسے لطیفۂ روحی کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ لطیفہ حامل انوارِ الٰہی اور نا ختم ہونے والی تجلیات کی بنا ہے۔ اس طریقہ سے سالک کو چاہیئے کہ اپنی توجہ روح کی جگہ پر متوجہ کرے جو کہ دائیں طرف قلب کے سامنے داہنی پستان کے نیچے ہے۔ لفظ اللہ کو اندرونی آواز سے روح کو تلقین کرے۔ اور یہ اس طرح ہو کہ زبان کو مطلق اس کی خبر نہ ہو۔ اور اتنا کھو جائے کہ عالمِ اجسام سے عالمِ ملکوت اور سیر الی اللہ وسیر فی اللہ من وعن ظاہر ہو۔ اور عالمِ مثال اور عالمِ جبروت نظر آئیں اور روح کو کہ سبز رنگ ہے ملاحظہ کرے۔ اس لئے کہ ذاتِ باری کا رنگ عارف کے مشاہدہ میں سیاہ رنگ ہے اور روح کا رنگ سبز ہے۔ اور سبز رنگ کو سیاہ رنگ سے نسبتِ تامہ ہے۔ اس لئے کہ ذات اور روح کے رنگ میں بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ روح احدیت کا مظہر ہے۔ پس جو کچھ مظہر میں ہے وہی سب کچھ مظہر سے ظاہر ہوگا۔ پس جب سالک روح کو اس رنگ میں دیکھے تو یقین کرے کہ ذاتِ باری کا عکس روح پر پڑے گا۔ اس ورد سے پہلے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ظاہر نظر آتا ہے وہ عین مظہر ہے اور اس واسطے تجلیات اس پر اس طرح وارد ہوں گی کہ اسے بیخود بنا دیں گی۔ اور نقشِ غیبت اور دوئی دل سے بالکل محو ہو جائے گا۔ اس لئے نظر کو اس لطیفہ میں جمائے اور روز و شب اس یکتا کی یاد میں گذارے اور ان تجلیات رنگا رنگ کا منتظر رہے۔

رباعی:- اے بلبلِ جانِ مست زیاد تو مرا ولے نامہ غم بست زیاد تو مرا
لذاتِ جہاں رانہ از پائے فگند ذوقے کہ دہد دست زیاد تو مرا

چہارم لطیفۂ سرّی

درویش جب لطیفۂ روحی سے کامل طور پر مستفیض ہو جائے اور اسطرح جان جائے جیسا کہ جاننے کا حق ہے تو اسے لطیفۂ سرّی کی طرف رجوع کرنا چاہئیے۔ یہ لطیفہ دونوں چھاتیوں کے درمیان واقع ہے۔ سالک کو چاہئیے کہ وقت مراقبہ لفظ اللہ اللہ کو سینہ پر کہ لطیفۂ سرّی کی جگہ ہے اس طرح لکھے جیسے جانوروں کو سکھایا جاتا ہے۔ اس طرح لفظ اللہ کو کہ بے کیف ذات کی تعبیر ہے یاد کرلے۔ لیکن زبان کو بغیر ہلائے ہوئے محض اندرونی آواز کے ساتھ اس طرح ذکر میں مشغول ہو کہ فکر اور تصوّر میں ڈوب جائے۔ اور ہر چیز سوائے اس کی یاد کے محو ہو جائے۔ اور اللہ کے بھید میں ہل جائے۔ اور رنگ لطیفہ سرّی کہ سبز ہے مائل بہ رنگ سبز و سفید نظر آئے۔ یہ تجلیات کے رنگ ظاہر ہونے کے بعد اس لطیفہ کا رنگ سفید تجلیات میں وارد ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے عشق کی آگ ہر غیر خواہش کو ڑا کرکٹ اور کانٹے کو جلا دے گی۔ اور شجر مراد سے صدائے (انی انا اللہ) کہ میں خود خدا ہوں پیدا ہوگی۔ خداوند عزّو جل سلامتی کی وادی سے نمودار ہوں گے اور طالب کا دل موسیٰؑ کی مانند آواز فاخلع نعلیکؑ یعنی جوتا اتار کر آئیے سنے گا۔ اور کفر و ایمان سے علیحدہ ہو کر دیدارِ مطلوب پائیگا شعر

کفر و ایماں در رہش پویاں وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

پنجم لطیفۂ خفی

پنجم لطیفۂ خفی کہلاتا ہے۔ طالب کو جب اللہ تعالیٰ یہ توفیق بخشے کہ وہ ہر چہار لطائف پر جو انسان کے جسم سے تعلق رکھتے ہیں عامل ہو جائے تو لطیفۂ خفی کی طرف رجوع کرے۔ دو لطیفہ سر سے تعلق رکھتے ہیں، ایک خفی دوسرے اخفی درویش پر ظاہر کئے جاتے ہیں۔ لطیفۂ خفی کا مرکز و مکان دونوں (حاجبین) ابرو ملی کے درمیان ہے اور اسکو قلب عبرت اور قلبِ انوار بھی کہتے ہیں۔ طالب کو چاہئیے کہ لفظ ہُو کو دونوں ابروؤں کے درمیان سے اندرونی آواز کے ساتھ نیچے لے جائے۔ جہاں کہ لطیفۂ سرّی و نفسی ہے۔ اور دہان و زبان کو اس کی مطلق خبر نہ ہو اور حاجبین کے درمیان سے بائیں طرف کھینچے اور لطیفۂ سرّی کے درمیان لے جا کر لطیفہ نفسی پر پہنچائے۔ یعنی ہُو کو پیشانی کے اوپر سے تمام قوت سے نیچے کی طرف لائے اور دوسری مرتبہ لفظ ہُو کو دونوں حاجبین کے درمیان لمبا کر کے نیچے سے اوپر کو لے جائے اور اسی طرح دیر تک یہ عمل دوہراتا رہے ۔ اور

بے کیف ذاتِ مطلق کی تفتیش کرے۔ اور نور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاجبین کے درمیان تلاش کرے۔ اور نور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ذات اللہ کی مدد اور فیض چاہے۔ نیز چاہیئے کہ یہ بھی سعی کرے۔ کہ دونوں کانوں سے ہُو کی آواز متواتر باہر آئے اور یہ آواز، آوازِ ذاتِ خدا ہوگی۔ اور اس آواز کی تفصیل یوں ظاہر کی جاتی ہے کہ اس لطیفہ کا رنگ برنگِ نور ہے اور نور کی تجلیات نورانی بجلی کی مانند اور طور کے شعلوں کی طرح جس جگہ دونوں حاجب ملتے ہیں سے باہر آتی ہیں اور مشغول کو اس کی ہستی سے باہر کر دیتی ہیں۔ سالک کو چاہیئے کہ نورِ حقانی اور نورِ وحدت کی جانب کہ لطیفہ خفی میں بے انداز ہے متوجہ ہو اور نور و نور ہو جائے۔ کیونکہ حقیقتاً یہ نور خداوند تعالیٰ کا نور ہوتا ہے جو (چھ) طرفوں سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے اور اس طرح تصور کرے کہ اپنے جسم کو خود نور سمجھتے ہوئے اس نور میں داخل ہو جائے۔

چنانچہ اس آوازِ ہو میں مستغرق ہو کر اپنے آپ میں اپنے سے غیر کا نشان تک نہ پائے۔ اور محویت میں محو ہو جائے اور خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے انوار اور نشانات بہت سے بہت بغیر علیحدہ ہوئے یا ملے ہوئے ملا منے ہوتے چلے جائیں۔ اور سالک کو ذاتِ واحد میں محو ہو جانے دیں۔ جب یہ لطیفہ مکمل طور پہ کھل جائے تو بے شمار عجائبات اور ان گنت غرائبات طالب کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن تعلق مراقبہ و مشاہدہ اور ہمیشگی فکر و ذکر قائم رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ کثرتِ ذکر و فکر سے نتائج میں بھی کثرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی کثرتِ اذکار و اشغال اللہ تعالیٰ سے قریب تر کر دیتی ہے۔ طالب کو بہت سا وقت اسی شغل میں مشغول رہنا بہتر ہوتا ہے۔

ششم لطیفہ اخفیٰ

ہے۔ جب طالب پہ حقیقتِ لطیفہ خفی پوری طرح کھل جائے تو لطیفہ دوئم کہ سر سے تعلق رکھتا ہے کی جانب متوجہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا ظاہر ہونا نہایت ضروری ہے اور اس کو لطیفہ اخفیٰ اور جمع الجمع بھی کہتے ہیں۔ اولیاء اللہ اس کا مکان و نشان ام الدماغ بیان فرماتے ہیں۔ قلب احمر اور قلبِ مدوّر بھی اسی کے نام ہیں۔ میرے شیخ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اس طرح فرمایا کہ ہر طالب کو جو لطیفہ اخفیٰ کا طالب ہو انوار و اسرار ام الدماغ سے ڈھونڈنے چاہئیں۔ اور اس کے ڈھونڈنے کا یہ طریقہ ہے کہ جب لطیفہ قلبی اور وہ انوار و اسرار جو اس میں پوشیدہ ہیں تجھ پہ منکشف ہوں اور اللہ اللہ کی آواز جو کہ ذات کو پہنچاتی ہے قلب کے اندر سے ظاہر ہو اور حقیقت لطیفہ روحی اور اس کے آثار و اطوار اللہ اللہ کی آواز روح کے

مکان کے اندر سے ظاہر ہو اور کیفیات لطیفہ نفسی مکمل طور سے تجھ پہ اظہار کریں۔ اور اللہ اللہ کی ندا لطیفہ سِرّی سے ہویدا ہو اور لطیفہ سِرّی بطور بیان معلوم و روشن ہو جائے تو طالب کے شایانِ شان یہ ہے کہ یہ آواز کہ جو ان لطیفوں سے آتی ہے سب کو جمع کر کے اور ہُو کی صورت میں لا کر امّ الدّماغ کے اندر سے کہ قلبِ احمر اور قلبِ بیرنگ اور قلبِ مدوّر بھی کہلاتا ہے۔ اور گیارہواں دروازہ بھی اسی کو کہتے ہیں۔ باہر لاتے ہوئے عرشِ مجید پہ لے جائے اور یہ تصوّر کہ عرش سے تحت الثریٰ تک ہُو یعنی ذاتِ اللہ ہی ہے ہونا چاہئے۔ اور یہ بھی کہ ہُو نے تمام موجوداتِ عالم کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ ھُوَ الاوّل والاٰخر والظاھر والباطن وھو بکل شیئٍ محیط اور اپنی ذات و صفات کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں فانی کر دے۔ اور اپنے آپ کو (لاشیٔ) یعنی کچھ نہ سمجھتے ہوئے ذاتِ باری کو باقی اور موجود جانے اور اس کو لطیفۂ اخفیٰ کے سامنے دیکھے کیونکہ خداوند عالم اسی میں ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی مکان نہیں لیکن کوئی جگہ اس سے خالی بھی نہیں۔ اور اولیاء اللہ بالیقین اس کو اسی جگہ میں طلب کرتے اور پاتے ہیں۔ اس شغل کے بعد جو کچھ معلوم ہو اور سمجھ کے احاطہ میں آ سکے قلم و زبان اس کے بیان کرنے سے قاصر ہوں گی۔ پوشیدہ راز اور انوار و تجلیات سالک پر اس طور سے وارد ہوتی ہیں۔ کہ ان کا تحریر میں آنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سالک کو معلوم ہونا چاہئے کہ انسان کے بدن میں گیارہ سوراخ ہیں۔ جن کی حقیقت سمجھنا نہایت ضروری ہے:۔

۱ٗ	۲ٗ	۳ٗ و ۴	۵ٗ و ۶	۷ٗ و ۸	۹ٗ و ۱۰	۱۱ٗ
قلب	دہن	ناک کے دو سوراخ	دو چشم کے	دو سوراخ کانوں کے	دو سوراخ مخرجین	دریچہ امّ الدّماغ

ہے۔ جو اللہ کے مناظر سے ایک منظر ہے اور اسی دریچہ سے خداوند عالم و قدّوس مومن کے قلب کو جو کہ اصل بابِ اللہ ہے دیکھتا ہے۔ اس حدیثِ قدسی کے موافق " لایسعنی ارضی ولا سمائی ولاکن یسعنی قلب عبدی المومن " یعنی میرے زمین و آسمان میری وسعت سے تنگ اور عاجز ہیں۔ مگر مومن بندے کا دل، کہ میں اس میں سما جاتا ہوں اور قیام فرماتا ہوں اور پھر بھی وہ فراخ رہتا ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے:۔

انّ فی قلب بنی ادم مضغۃً اذا اصلحتْ صلح الجسدَ کلّہٗ واذا فسدتْ فسدَ الجسدُ کلّہٗ

تحقیق بنی آدم کے دل میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے۔ اگر وہ درست ہو تو تمام جسم درست اور اگر خراب ہو تو تمام جسم خراب ہو جاتا ہے۔ نیز فرمایا رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انّا فی جسدِ بنی آدم قلب و فی قلبِ

رُوحٌ وفی الرُّوحِ نفس وفی النفس سِرٌّ وفی السّرِ خفیٌ وفی الخفیِ اخفی وفی الاخفیٰ انا۔ تحقیق فرزندِ آدم کے جسم میں دل ہے اور دل میں روح اور روح میں نفس اور نفس میں سِرّ اور سِرّ میں خفی اور خفی میں اخفیٰ ہے اور اخفیٰ میں مَیں ہوں۔ اور بعض اولیاء اللہ نے لطیفۂ اخفیٰ کو اس طرح فرمایا ہے۔ کہ طالب سروقد کھڑے ہو کر دائیں پاؤں کے ناخن سے سر کی چوٹی تک اللہ کا پہلا الف ملاحظہ کرے اور اپنی ذات کو اس کی ذات تصوّر کرتے ہوئے اس طرح سمجھے کہ حق مجھ میں ظاہر ہے۔ اور میں اس میں۔ یعنی اس کے واسطے گویا کہ خود میں ظاہر ہوں اور میں اس میں ہوں اور وہ مجھ میں ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے۔ لایزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتیٰ احبتہٗ فاذا احبتہٗ کنتُ سمعہٗ وبصرہٗ ویداہٗ ورجلاہٗ۔ یسمع بی ویبصر بی ویبطش بی ویمشی بی۔ یعنی ہمیشہ میرا بندہ زیادہ بندگی اور عبادت سے میری نزدیکی اور قرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ میں اس کا دوست ہو جاؤں۔ پس میں اس کے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں بن جاتا ہوں۔ اور وہ مجھ سے سنتا ہے اور دیکھتا ہے اور مجھ سے پکڑتا اور چلتا ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ جب میرے بندے کو میرا قرب حاصل ہو جاتا ہے تو وہ، وہ نہیں رہتا۔ بلکہ ذات بن جاتا ہے۔ یا ذات کے اتنا نزدیک ہو جاتا ہے کہ وہ خود کچھ نہیں رہتا ؂

عین آبم عین ما آب است و آب   زیر و بالا پیش و پس آب است آب
از زمین و از لیار و اکتساب   تو منی من عین تو بے ارتیاب

خواہ بالا دار مژگاں خواہ زیرِ تیغ چشم   کشتہ شو ہر جا کہ خواہی لذتِ بسمل یکے است
خواہ در مسجد نشین و خواہ در بتخانہ باش   گر دے پُر درد داری ہر دو را حاصل یکے است

۳۔ حقیقت سلطان الاذکار

درویش پر جب ان چھ لطیفوں کی حقیقت جیسی کہ وہ ہے کھل جائے اور احوال و اعمال ہر ایک لطیفے کے کماحقہٗ علیحدہ علیحدہ اس پر عیاں ہو جائیں تو اس کو سلطان الاذکار کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ کہ اسے صوتِ سرمدی صوتِ ذاتِ مطلق و صوتِ اَن حد بھی کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان کے دونوں کانوں سے لفظ ہُو کی آواز پیہم باہر آئے اور اس آواز

کی کوئی حد و حصر نہیں اور نہ کوئی اس کی انتہا ہے۔ جب یہ آواز دونوں کانوں میں پختگی پر پہنچ جاتی ہے تو تمام بدن بلکہ ہر بال کے سر سے یہی صدا آتی ہے اور ہر عضو سے بھی یہی جاری ہوتی ہے۔ اور تمام گھر بلکہ جنگل اسکی آواز سے بھر جاتے ہیں۔ چنانچہ موسمِ سرما میں اگر پانی کا پیالہ بھی ٹوٹے تو پانی کے ہر قطرہ سے دھوآں ظاہر ہو۔ اسی طرح انسان کے ہر ایک جزو سے بلکہ ہر ایک بال سے آواز ہو پیدا ہو جائے اور اس آواز کے پختہ ہونے پر ناقوس، کوس و آسیا کی آواز بھی مغلوب ہو جائیگی اور یہ آواز سب پر غالب ہو گی۔ اور سالک ہوش سے بے ہوش ہو جائے گا۔ اور مطلقاً اسے ہوش نہ ہو گی۔ لیکن جب اسے باہوش کرنے کے لئے جھنجھوڑا جائے اور اس آواز کی مختلف صدائیں ہیں۔ اور اسی آواز پر سیّدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں اکتالیس روز یا زیادہ قیام فرماتے رہے۔ اور یہی آواز جبرئیل علیہ السّلام کی آواز کے مشابہ تھی۔ اور کبھی کبھی اس آواز کی تشبیہ زنبور اور شہد کی مکھی کی آواز سے بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ لہٗ صوتٌ کصوتِ الزنابیر والذّباب یعنی اس کی آواز زنبور اور مگس کی آواز کی مانند ہوتی ہے۔ اور کبھی چکی کے چلنے کی آواز کی مانند کبھی ایسے جیسے دیگ میں جوش آرہا ہو۔ لہٗ صوتٌ کصوتِ الرحاءِ ولہٗ صوتٌ کصوتِ المرجلۃ۔ اور کبھی اس آواز کو آوازِ جرس اور گھنٹی کی آواز سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔ یعنی یوں ارشاد ہوا ہے کہ "یاتینی مثلُ صلصلۃ الجرس" اور بشمار حدیثیں اسی آواز کے اثبات میں خداوندِ تعالیٰ سے منسوب ہیں۔ اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ۔ ہم بندے کے لئے اس کی شاہرگ سے زیادہ نزدیک ہیں۔ اور تم جہاں ہو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ پس ان آیاتِ مبارکہ سے اللہ پاک کا انسان کے ساتھ قریب تر ہونا ہمیشہ کے لئے ثابت ہے۔ اور یہ آواز سرمدی بھی ہمیشگی پہ ہے۔ جیسے کہ حق تعالیٰ بندے کی شاہرگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ دونوں کانوں میں یہ آواز بھی نزدیک تر ہے۔ اور جس طرح حق سبحانہٗ تعالیٰ بندے کے ساتھ ہے۔ جہاں بھی ہو۔ اسی طرح یہ آواز بھی جہاں بھی وہ ہو اس کے کان میں پہنچتی ہے۔ لیکن یہ امر لازمی ہے کہ داہنی جانب کی طرف رغبت ہو۔ اور بائیں جانب کی آواز کو پست کر دے اگرچہ بائیں جانب کی آواز ہمیشہ موجبِ فلاح و صلاح ہے۔ پس اے طالب بہت سی اشیاء انسان سے جُدا نہ ہونے والی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کان کی آواز ہے۔ اور بہت سی بے رنگیاں نا زائل ہونے والی جسم کے ساتھ ہیں جو باقی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اس بے رنگ کی طرف راہِ ہدایت ہے۔

قوتِ شامہ و باصرہ، سامعہ و لامسہ و فخامہ یا مدرکہ یہ پانچوں حواس باطنی اور ان کی بے رنگی اس ذاتِ واحد بے رنگ کی طرف راستہ دکھاتی ہیں۔ لیکن یہ سب شیخ کی توجہ پر منحصر ہے۔ اور بعض مشائخ سلوک اپنے مریدوں کو اپنی آواز سے سناتے ہیں۔

لیکن طریقہ قادریہ فاضلیہ میں یہ طریقِ قرب اچھا نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ اَنَّ الی اللہِ طریق بعدد انفاس المخلوقات کے طریق پر بیان کیا گیا ہے۔ یعنی تحقیق اللہ کی طرف جانے کے بے شمار راستے ہیں۔ اس فقیر کو یہ معلوم کرایا گیا ہے اور منکشف ہوا ہے کہ جب وہ مولیٰ کریم اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو راہ دکھانی چاہتا ہے اس کے واسطے سبب پیدا فرما دیتا ہے۔ اور اس سبب میں اپنے آپ کو بے شمار قسم کی تجلیات و شیونات عجیبہ سے جلوہ دکھاتا ہے۔ اور اپنے آپ میں محو کر دیتا ہے۔ اور خود بخود ہی ذات میں جذب کرتا ہے اگر اس کی طرف سے یہ جذب نہ ہو تو کسی بھی قسم کے سالک کو اس کی طرف راستہ نہ ملے۔ اگرچہ اس کی عمر عمرِ نوح کے برابر ہو اور خزانۂ قاروں بھی صرف کر دے ؎

تو در و گم شو وصال این است و بس
تو مباش اصلا کمال این است و بس

۴۔ کلماتِ طیبات

ان سے مراد وہ چھ کلماتِ طیبات ہیں جو مسلمانوں میں معروف ہیں۔ جن کے ہر روز پڑھنے سے عامل شش جہات کی آفات و بلیات سے محفوظ رہتا ہے۔ پھر ان میں اوّل کلمہ توحید اس قاعدے کے ماتحت اپنا معمول بنانے سے (جو قاعدہ پیچھے ذکر ہوا ہے) ایک قاری کے دل کو نور اور آنکھوں کو سرور بخشتا ہے۔ بلکہ اصفیاء و اولیاء کے نزدیک معرفتِ الٰہی کا زینہ ہے۔ کلماتِ طیبات حق سبحانہٗ تعالیٰ کی جانب عروج کرتے ہیں اور عملِ صالح انہیں بلند کرتا ہے۔ قاری کو چاہیئے کہ ان چھ کلموں کو ملاحظہ معانی کے ساتھ نہایت ذوق و خوش الحانی اور خشوع و خضوع سے صحیح تلفظ میں ادا کرے تاکہ ان کی برکات سے کماحقہٗ مستفید و مستفیض ہو سکے۔

۵۔ درود شریف

درود شریف کا ورد کرنا نص قرآنی سے ثابت ہے۔ جس کو تمام علماء و صلحاء امت نے وجوب کا درجہ دیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ درود شریف کے ورد کے بغیر کسی

وظیفہ کی اجابت، کسی دُعا کی قبولیت اور کسی امرِ صالح میں برکت نہیں ہوتی۔ بلکہ باطنی کشود کار بغیر درود شریف ایک امر محال ہے۔ اولیاء کرام و بزرگانِ انام کا تجربہ شاہد ہے کہ جس قدر درود شریف میں کثرت کی جائے۔ اتنی ہی جلد کشودِ کار و مطلب براری ہوتی ہے۔ فقیر کے سلسلۂ سہروردیہ میں معمول و مختار درود شریف ہزارہ ہے۔ جو بزرگانِ سلسلہ سے باجازت مؤکد طور پر ارادتمندوں کو پڑھایا جاتا ہے۔

۶۔ اسماء الحسنیٰ یعنی رب العزت جل و علا شانہٗ کے ننانوے اسماء مبارکہ کی تلاوت ہر روز بلکہ ہر نماز کے بعد ایک ایک بار یا صبح کے وقت تین بار کرنے سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اور نفس و شیطان کی تسخیر اور ظاہری و باطنی آفات و بلیات سے مامون و مصئون رہنے کے لئے اس کو اہل اللہ نے سپر (ڈھال) فرمایا ہے۔ لہٰذا فقیر کامل سند کے ساتھ مع اعداد بحساب ابجد و صفات جلالی و جمالی اسماء مبارکہ ذیل میں درج کرتا ہے۔ مولا کریم سب کو ذکر و فکر کی توفیق رفیق فرمائے۔ مگر ان تمام اسماء الحسنیٰ کی تلاوت جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے ہر روز کر لینا تو موجب صد ہزار خیر و برکت ہے۔ مگر کسی اسم مبارک کو بطور عمل چلہ کشی میں پڑھنا اور اس سے غرض کچھ دنیوی اغراض رکھنا اجازت عامل کے بغیر نہ پڑھنا چاہئے۔ کیونکہ خود بخود بغیر کسی معین طریق کے چلہ کشی کرنا بعض اوقات دیوانہ بنا دیتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ رب العزت جل و علا شانہٗ کے اسماء مبارکہ میں یہی تاثیر ہے کہ اپنے عامل کو پاگل بنا دے۔ بلکہ خود عامل ہی کی بے ڈھنگی تعلیم اور چلہ کشی اس کو اس حد تک پہنچا دیتی ہے۔ جو عموماً پاکیزگی میں بد پرہیزی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا وذروا الذین یلحدون فی اسمائہ

بسم	اللہ	الرحمٰن	الرحیم	ھو	اللہ	الذی	لا الٰہ	الا	ھو
اَللّٰہُ معبود	رَحمٰنُ بہت بخشنے والا	رَحِیمُ بہت رحم والا	مَلِکُ شہنشاہ	قُدُّوسُ بزرگ تر	سَلَامُ سلامت رکھنے والا	مُؤمِنُ امن دینے والا	مُھَیمِنُ نگہبان	عَزِیزُ غالب	جَبّارُ زبردست
مُتَکَبِّرُ بڑائی والا	خَالِقُ پیدا کرنیوالا	بَارِئُ سب کا پیدا کنندہ	مُصَوِّرُ صورت گر	غَفّارُ گناہ بخشنے والا	قَھّارُ سب پر غالب	وَھّابُ بہت دینے والا	رَزّاقُ روزی دینے والا	فَتّاحُ کھولنے والا	عَلِیمُ جاننے والا
قَابِضُ تنگ کرنیوالا	بَاسِطُ فراخ کرنیوالا	خَافِضُ پست کرنیوالا	رَافِعُ بلند کرنیوالا	مُعِزُّ عزت دینے والا	مُذِلُّ خوار کرنیوالا	سَمِیعُ سننے والا	بَصِیرُ دیکھنے والا	حَکَمُ حکم کرنیوالا	عَدلُ انصاف کرنیوالا
لَطِیفُ باریک بین	خَبِیرُ خبردار	حَلِیمُ بُردبار	عَظِیمُ بزرگ تر ذات و صفات میں	غَفُورُ بخشش کا مالک	شَکُورُ قدردان	عَلِیُّ بلند مرتبہ	کَبِیرُ سب سے بڑا	حَفِیظُ نگاہ رکھنے والا	مُقِیتُ قوت دینے والا
حَسِیبُ حساب والا	جَلِیلُ بزرگ قدر	کَرِیمُ کرم کرنیوالا	رَقِیبُ واقف کار	مُجِیبُ قبول کرنیوالا	وَاسِعُ بہت دینے والا	حَکِیمُ استوار کار	وَدُودُ دوست رکھنے والا	مَجِیدُ بزرگ	بَاعِثُ اٹھانے والا
شَھِیدُ حاضر	حَقُّ ثابت	وَکِیلُ کارساز	قَوِیُّ قوت والا	مَتِینُ مضبوط	وَلِیُّ دوست	حَمِیدُ حمد والا	مُحصِی گھیرنے والا	مُبدِئُ ابتدا بخشنے والا	مُعِیدُ انتہا والا
مُحیِی جلانے والا	مُمِیتُ مارنے والا	حَیُّ قائم	قَیُّومُ قائم رہنے والا	وَاجِدُ پانے والا	مَاجِدُ بزرگی والا	وَاحِدُ یکتا	اَحَدُ ایک	صَمَدُ بے پرواہ	قَادِرُ قدرت والا
مُقتَدِرُ قدرت ظاہر کرنیوالا	مُقَدِّمُ آگے والا	مُؤَخِّرُ پیچھے والا	اَوَّلُ پہلا	آخِرُ پچھلا	ظَاھِرُ واضح	بَاطِنُ نہایت پوشیدہ	وَالِیُ کام بنانے والا	مُتَعَالِیُ بہت اعلیٰ	بَرُّ نیکو کار
تَوّابُ توبہ قبول کرنیوالا	مُنتَقِمُ صاحب انتقام	عَفُوُّ معاف فرمانیوالا	رَؤُفُ مہربان	مَالِکُ المُلکِ دو جہان کا مالک		ذُوالجَلَالِ وَالاِکرَامِ صاحب بڑی بخشش و کرم کا		مُقسِطُ انصاف کرنیوالا	جَامِعُ جمع کرنے والا
غَنِیُّ بے پرواہ	مُغنِیُ بے پرواہ کرنیوالا	مَانِعُ باز رکھنے والا	ضَارُّ ضرر دینے والا	نَافِعُ نفع دینے والا	نُورُ روشن	ھَادِیُ راہ دکھانیوالا	بَدِیعُ بے نمونہ پیدا کنندہ	بَاقِیُ ہمیشہ رہنے والا	وَارِثُ بعد فنا رہنے والا
رَاشِدُ جہان کا رہنما	صَبُورُ بُردبار	والسلام علی محمدن الذی امرنا طریقتہ الوظیفۃ الاسماءِ الحسنیٰ فالحمد للہ الذی ھدٰنا لھذا							

یَااَللّٰہُ - یہ اسم مبارک ذاتی ہے - جس کے ۶۶ عدد ہیں - مقبول بارگاہِ الٰہی ہونے کے لئے اس اسم مبارک کا ایک ہزار بار، صاحبِ ایمان ہونے کے لئے بعد ہر نماز ایک سو بار، صاحب عرفان وکشف ہونے کے لئے گیارہ سو بار اور کسی ضروری حاجت برآری کے لئے تین ہزار تین سو تیرہ بار پڑھنا اور ہر روز اتنا پڑھنا اکتالیس دن تک مقصود کو پورا فرماتا ہے۔

یَارَحْمٰنُ - یہ اسم مبارک جمالی ہے اور اس کے دو سو اٹھانوے عدد ہیں - جو شخص طلب رحمت الٰہی کے لئے اس کے اعداد کے برابر بعد نماز فجر پڑھے کامیاب ہوتا ہے - اور ہر نماز کے بعد اس کا بطور معمول وظیفہ کرنا قساوت قلبی اور نسیان وعصیان اور طغیان وعدوان سے بچاتا ہے۔

یَارَحِیْمُ - یہ اسم مبارک بھی اپنی تاثیر وخاصیت کے لحاظ سے جمالی ہے - اور اس کے دو سو اٹھاون عدد ہیں - اس کا ہر روز بعد نماز عصر یا عشا بطور وظیفہ پڑھنا خلق خدا میں مقبول بناتا ہے اور افلاس وغربت سے محفوظ رکھتا ہے۔

یَامَلِکُ - اس اسم مبارک کی خاصیت بھی جمالی ہے اور نوّے اعداد ہیں - اور نوّے ہی بار بعد نماز ظہر پڑھنے سے دل کو منور کرتا اور عوام میں عزت وحرمت بخشتا ہے - اگر کوئی شخص یَامَلِکُ یَاقُدُّوْسُ دونوں اسمار کا ملا کر وظیفہ کرے، نفس کو تابع اور ظاہری املاک لازوال پائے۔

یَاقُدُّوْسُ - بھی خاصیت میں جمالی اور تاثیر میں کمالی حقیقت رکھتا ہے - اس کے ایک سو ستّر عدد ہیں اس کا ہر روز بعد نماز مغرب ایک ہزار گیارہ بار پڑھنا دنیا واہلِ دنیا سے بے نیاز کرتا ہے - سفر میں عام بے تعداد پڑھنا سفر کے فتنوں سے بچاتا ہے اور مریض کے لئے روٹی کے ٹکڑے پر آیت فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا کے ساتھ اکیس بار لکھ کر دینا شفا بخشتا ہے - اور اگر مریض چوتھے بخار کی باری کے دن اسی خشک روٹی کو کھا کر دودھ، سالن، میٹھا وغیرہ سے بچے نہ روٹی کے ساتھ کھائے اور نہ بعد کو تو بخار سے نجات پائے۔

یَاسَلَامُ - اس اسم پاک کے ایک سو اکتیس عدد ہیں اور جمالی ہے - شفاء مریض کے لئے ایک ہزار ایکسو اکتالیس بار پڑھ کر مریض کو دم کرنا بحد مفید ہے اور ہر نماز کے بعد سات سو چھیاسی [۷۸۶] بار اس کا وظیفہ کرنا ظلم و

عمل اور پاکیزہ رزق کو زیادہ کرتا ہے۔

یَا مُؤمِنُ ۔ یہ اسم الٰہی بھی جمالی ہے۔ جس کے ایک سو چھتیس عدد ہیں۔ ہر روز علی الصبح اٹھتے ہی تین بار پڑھنا خطرات سے بچاتا ہے۔ اور بطور وظیفہ گیارہ سو بار بعد نماز مغرب پڑھنے سے ظاہری و باطنی امورات میں برکت بخشتا ہے۔ اور اس کا عامل کسی حال میں بھی مفلس اور تنگ نہ ہوگا۔ پھر اسم یَا دَحِیمُ کے ساتھ ملا کر پڑھنا تو بے پناہ خاصیت رکھتا ہے۔ جس کے لئے اجازت حاصل کرنا لازم ہے۔

یَا مُهَیمِنُ ۔ اس اسم مبارک کے ایک سو پنتالیس عدد ہیں۔ اور جمالی اسماء میں سے ہے۔ ہر روز انتیس بار پڑھنے سے غم نہیں آتا اور غسل کر کے ایک سو پندرہ بار پڑھا جائے تو انکشاف باطنی و ظاہری ہو جاتا ہے۔

یَا عَزِیزُ ۔ یہ اسم شریف تاثیر میں جمالی اور اعداد چورانوے رکھتا ہے۔ اس کو بعد نماز مغرب ایسی جگہ بیٹھ کر سات سو بار پڑھنا جہاں چھت نہ ہو اور آسمان دکھائی دیتا ہو دنیوی مصائب اور ہر قسم کے افلاس سے محفوظ رکھتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ جب ایک سو بار پڑھ لیں آسمان کی جانب منہ اٹھا کے پھونک ماریں اسی طرح بار بار کریں۔ اس اسم شریف کو آخر شب میں دو ہزار بار اگر بارانِ رحمت کے لئے پڑھا جائے تو مینہ برستا ہے۔ بعد نماز فجر اکتالیس بار اور بعد نماز عصر ایک سو چھیانوں بار پڑھنا مخلوق میں عزیز اور غالب کرتا ہے۔

یَا جَبَّارُ ۔ یہ اسم پاک جلالی ہے اور اس کے دو سو چھ عدد ہیں۔ چھبیس دن ہر روز بعد نماز کے چھبیس بار اگر پڑھا جائے تو ہر حاجت پوری ہوتی ہے۔

یَا مُتَکَبِّرُ ۔ یہ اسم بھی اسمائے جلالیہ میں سے ہے۔ اس کے چھ سو باسٹھ عدد ہیں۔ عورت کی قربت کے وقت سے پہلے اگر اپنے پاکیزہ بستر پر بیٹھ کر صرف دس بار پڑھا جائے پھر قربت کی جائے۔ تو فرزند نرینہ پیدا ہو۔ خواب میں ڈرنے والا سونے سے پہلے بہتر بار پڑھے تو یہ تکلیف دور ہو جاتی ہے۔

یَا خَالِقُ ۔ اس اسم شریف کو جمالی لکھا گیا ہے۔ اور اس کے سات سو اکتیس عدد ہیں۔ اس کو بطور وظیفہ بعد نماز اشراق ہر روز ۳۳ سے سات سو تینتیس بار پڑھنا عبادتِ الٰہی میں ذوق پیدا کرتا ہے۔ اور غفلت دور ہو جاتی ہے۔

یَا بَارِئُ - جمالی اسم ہے - اس کے دو سو تیرا ں عدد ہیں - عذاب قبر اور خطرات نفسانیہ سے محفوظ رہنے کیلئے اس اسم شریف کا ہر روز غروب آفتاب کے وقت پچیس بار اور بوقت جمعہ فرضوں اور سنتوں کے درمیان خطبہ سے پہلے اکتیس بار پڑھنا کامیاب رکھتا ہے -

یَا مُصَوِّرُ - جلالی اسم ہے - اور اس کے تین سو چھتیس عدد ہیں - دینی دنیوی دشواریوں کے لئے اس کا کسی ایک معین وقت میں صرف ستادن بار پڑھنا ہر حاجت کو پورا کرتا ہے - اور بانجھ عورت کو اگر ہر روز بارش کے پانی پر دم کر کے اکتیس روز پلایا جائے تو بفضلہ تعالیٰ اولاد ہو -

یَا حَکَمُ - یہ اسم شریف تاثیر میں جمالی ہے اور اس کے اٹھہتر اعداد ہیں - اس کا بے تعداد اس قدر پڑھنا کہ پڑھنے والا پڑھتے پڑھتے بیہوش ہو جائے معرفت الٰہی کے اسرار کو کھولتا ہے - مگر وقت رات کا ہونا چاہئے - طلوع سے غروب آفتاب تک نہ پڑھنا چاہئے - ہر نماز کے بعد تین سو ساٹھ بار پڑھنا محتاجی سے بچاتا اور معدن اسرار بناتا ہے - پانی پر دم کر کے مریض کو پلانا وبائی امراض میں نہایت مفید ہے

یَا عَدْلُ - یہ اسم مبارک جلالی ہے - اس کے ایک سو چار عدد ہیں - جمعرات کی شام کو اس کا ایک سو چار بار پڑھنا اور روٹی کے چار ٹکڑوں پر اسی تعداد کے مطابق ایک ایک سو چار چار بار لکھ کر اسی شام کو کھانا تسخیر خلق کے لئے نہایت سریع الاثر ہے - اور ہر روز بعد نماز مغرب ایک ہزار بار پڑھنا آفات و بلیات سے بچاتا ہے -

یَا لَطِیْفُ - جمالی اسم شریف ہے - اس کے ایک سو انتیس عدد ہیں - اس اسم شریف کا چینی کی رکابی میں تعویذ حروف مقطعات کے باہر اس کے تعداد حروف کے برابر گلاب و زعفران سے لکھ کر آسیب زدہ کو پلانا اور اس پر چھڑکنا، ام الصبیان اور سوکھا کے مریض بچوں کو دودھ میں گھول کر پلانا اور اسی دودھ کی مالش کرنا بفضلہ تعالیٰ صحت بخشتا ہے - ہر روز بوقت تہجد اگر غسل کر کے گیارہ سو بار پڑھا جائے، پھر سر کو سجدہ میں رکھ کر دعا مانگی جائے تو ہر حاجت روا ہو - جوان لڑکی کے نکاح کی فکر میں اگر ایک سو انتیس بار لکھ کر لڑکی کے گلے میں ڈال دیا جائے تو خدا کے فضل سے اتنے ہی دنوں کے اندر نکاح ہو جائے -

یَا خَبِیْرُ - جلالی اسم مبارک ہے - آٹھ سو بارہ اس کے اعداد ہیں - اس کا رات کو دوگانہ پڑھ کر اور اس

کے بعد انچاس مرتبہ درود شریف ہزارہ پڑھ کر آٹھ سو باراں بار پڑھنا اصلاحِ نفس امارہ فرماتا ہے۔ اور اسی مصلّی پر بیٹھ کر یَا خَبِیْرُ اَخْبِرْنِیْ بطور استخارہ پڑھنا گمشدہ چیز کا پتہ دیتا ہے۔ اس کا ہر وقت وظیفہ بعض غائبانہ ہستیوں سے ملاپ کا سبب بھی ہوتا ہے۔

یَا حَلِیْمُ ۔ اٹھاسی اعداد کا جمالی اسم شریف ہے ۔ اس کا گلاب و زعفران سے بطور نقش بحساب ابجد لکھنا اور بارش کے پانی میں گھول کر پینا اٹھراہ والی عورت کو مفید ہے ۔ کسی کھیتی کی مٹی پر ۸۸ بار دم کر کے کھیتی میں مٹی کو بکھیر دینا کھیتی کو موذی جانوروں سے محفوظ فرماتا ہے۔

یَا عَظِیْمُ ۔ یہ اسم مبارک بھی جمالی ہے ۔ جس کے ایک ہزار بیس عدد ہیں ۔ اس کا ایک ہزار بیس مرتبہ سات کنوؤں کے پانی کو ملا کر اس پر دم کرنا اور وبائی امراض کے مریض کو پلانا خدا کے فضل سے شفا بخشتا ہے۔

یَا غَفُوْرُ ۔ اس اسم مبارک کی تاثیر بھی جمالی ہے ۔ ایک ہزار دو سو چھیاسی اعداد ہیں ۔ اس اسم کا تپ محرقہ کے مریض کو اس کی تعداد حروف کے برابر لکھ کر پلانا صحت دلاتا ہے ۔ جلالی جمالی پرہیز کے ساتھ اس کا بستی سے باہر تنہائی میں کسی عامل سے اجازت لے کر سوا لاکھ پڑھنا اور سنکھ کی راکھ پر دم کر کے مریض فالج کو کھلانا نہایت زود اثر ہے۔

یَا شَکُوْرُ ۔ یہ جمالی اسم شریف ہے ۔ اور اس کے پانچسو چھبیس اعداد ہیں ۔ تنگیٔ معاش، خلاصیٔ مقدمہ، بریت تہمت کے لئے صرف سات بار آسمان کی طرف منہ کر کے پڑھنا نجات دلا دیتا ہے ۔ رشپ، کوری کے لئے اکتالیس بار سفید پیالہ پر دم کرنا اور اس کا پانی سلائی سے لگا کر آنکھ میں متواتر ڈالنا شب کوری کو دور کرتا ہے ۔ ہر روز اس کا پانچ ہزار بار بوقت تہجد پڑھنا بفضلہ تعالیٰ اضطراب قیامت سے بری کرتا اور درجات بلند فرماتا ہے۔

یَا عَلِیُّ ۔ جلالی اسم شریف ہے اسکے ایکسو دس ۱۱۰ عدد ہیں، بلندیٔ مراتب حصولِ برکات میں اس کا اثر نہایت بلند و بالا ہے ۔ دردِ سر، وجع المفاصل، ہر قسم کے ورم کے لئے اس کا اکیس بار پڑھ کر تین حصوں میں دم کرنا صحت بخشتا ہے۔

یَا کَبِیْرُ ۔ یہ اسم مبارک جمالی ہے ۔ اس کے دو سو بتیس اعداد ہیں ۔ اس کی تلاوت ہر روز پانچ سو بار

انسان کو عالی قدر بناتی ہے۔ بشرطیکہ سمائے تلاوت ایک ہی ہو۔ یا کم از کم مصلیٰ ایک رکھا جائے۔ اور ایک ہی وقت بھی معین رہے۔ مہمات امور کی انجام دہی کے لئے اس کا لکھ کر گلے میں ڈالنا ہر مقام پر کامیابی بخشتا ہے۔

یَا غَفَّارُ - یہ جمالی اسم شریف ہے۔ اسکے ابجد ہزار دسواکاسی عدد ہیں۔ مغفرت کا اس اسم پاک سے خاص تعلق ہے۔ اس اسم پاک کی بدولت ہر گنہگار اس کا وظیفہ کرنیوالا گناہوں سے بخشا جاتا ہے۔ اور قیامت میں بھی امیدوار مغفرت ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص جمعہ کے روز فجر کی سنتوں اور فرضوں اور جمعہ کی سنتوں اور فرضوں اور عصر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان ایک ہزار اکتالیس بار اس اسم پاک کا وظیفہ کرے اس کے جملہ گناہوں کی معافی کا مرنے سے پہلے یقین ہو جائے

یَا قَهَّارُ - یہ جلالی اسم پاک ہے۔ اعداد اس کے تین سو چھ ہیں۔ مقہوریٔ اعدا کے لئے وظیفہ اس کا اکسیر ہے۔ بروز بدھ اگر دوگانہ وضو کا ادا کر کے بوقت ظہر قبل نماز ظہر تین سو چھ بار پڑھا جائے تو دنیا کی محبت دل سے نکل جاتی ہے۔ اور خاتمہ بالخیر ہوتا ہے۔

یَا وَهَّابُ - اس اسم مبارک کو بعض حضرات جلالی اور بعض جمالی لکھتے ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ جمالی ہے۔ اور اس کے چودہ عدد ہیں۔ جو چودہ طبقوں کی نعمتوں کا حامل ہے۔ اس کا وظیفہ کرنے والا فاقہ میں نہیں رہ سکتا۔ بلکہ لامعلوم غیب سے روزی پاتا ہے۔

یَا رَزَّاقُ - جمالی اسم شریف ہے۔ اس کے تین سو آٹھ عدد ہیں۔ کشائش رزق کے لئے اکثر لوگ اس کا وظیفہ کرتے ہیں اور اکثر بزرگ اس کی اجازت فرمایا کرتے ہیں۔ مفلسی کو دور کرنے کے لئے اس کا رات کو سوتے وقت ننانوے ننانوے بار اور صبح اٹھتے ہی دس دس بار پڑھ کر مکان کے چاروں کونوں میں پھونکنا اور قطب ٹالے کونے سے شروع کرنا دنیا و دین کی دولت سے مالدار کر دیتا ہے۔

یَا فَتَّاحُ - اس اسم پاک کو بھی جمالی لکھا گیا ہے۔ اس کے اعداد چار سو نواسی ہیں۔ ہر نماز فجر کے بعد اکیس اکیس بار اوّل آخر درود شریف پڑھ کر اور اپنے سر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو کر اس اسم کا ستر بار پڑھنا ہر مطلب و کشود کار کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

یَا عَلِیمُ - جمالی اسم شریف ہے اور ایک سو پچاس عدد ہیں۔ اس کا کسی راز کے معلوم کرنے کیلئے دوگانہ استخارہ پڑھ کر جائے نماز پر ہی داہنے پہلو لیٹ کر اکیسو اکتالیس بار پڑھتے پڑھتے سو جانا راز کو کھول دیتا ہے

اور اس پر کثرت کرنا صاحب مکاشفہ بنا دیتا ہے۔

یَاقَابِضُ ۔ اس اسم مبارک کو جلالی بتایا جاتا ہے۔ اس کے نو سو تین اعداد ہیں۔ حضرت ابوالخیر فرماتے ہیں کہ جو شخص چالیس روز تک اس اسم پاک کو ہر روز روٹی کے چار ٹکڑوں پر لکھے اور پیاز لہسن کے بغیر پکے ہوئے سالن سے کھائے یا کسی میٹھی چیز سے تناول کرے عذاب قبر اور بھوک کی تنگی اور محتاجی سے امن میں رہے۔

یَابَاسِطُ ۔ یہ اسم بھی جلالی ہے۔ اور بہتر اعداد رکھتا ہے۔ اس اسم شریف کو بطور وظیفہ پڑھنا دین و دنیا میں سرفراز فرماتا ہے۔ فقیر نے ایک درویش سے سنا کہ یہ اسم شریف سات سو چھیاسی بار بعد نماز تہجد پڑھ کر اور سر سجدے میں رکھ کر دعا مانگنا، مانگنے والے کو اس حد تک مستغنی عن الخلق کر دیتا ہے کہ اس کو مخلوق سے کوئی حاجت نہیں رہتی اور شیشے میں لکھوا کر اس اسم پاک کا تصور کرنا اور بوقت سحر تصور سمیت ایک ہزار بار پڑھنا قلب کو نور الٰہی سے بھر دیتا ہے۔

یَاخَافِضُ ۔ جمالی اسم شریف ہے۔ جس کے ایک ہزار چار سو اکاسی اعداد ہیں۔ ہر دشمن کے شر سے محفوظ رہنے کے لیئے اس کے اعداد ہی کے مطابق اس کا تین دن روزہ رکھ کر چوتھے روز ایک مقام معین پر بیٹھ کر پڑھنا کامیاب بناتا ہے۔

یَارَافِعُ ۔ خاصیت میں جلالی اور اعداد میں تین سو اکاون ۳۵۱، ایک خصوصی تعداد رکھتا ہے۔ تینوں زوال کے اوقات میں اس کا سو سو بار باوضو پاکیزہ جگہ پر قبلہ رُخ آنکھیں بند کر کے کھڑے ہو کر پڑھنا مخلوق میں ممتاز اور خلائق سے بے نیاز کرتا ہے۔

یَامُعِزُّ ۔ یہ اسم شریف جمالی ہے۔ اس کے ایک سو سترہ عدد ہیں۔ اس کا جمعرات کی شام کے بعد گیارہ سو بار کسی مکان کی چھت پر بیٹھ کر وظیفہ کرنا وہ ظاہری عزت و حرمت بخشتا ہے کہ سوائے خداوند عالم جل و علا شانہٗ کے کسی طرح کا خوف و ہراس نہیں رہتا۔

یَامُذِلُّ ۔ اس اسم شریف کے سات سو ستر عدد ہیں اور تاثیر کے لحاظ سے جلالی ہے۔ ہر دشمن سے بےخوف ہونے اور ہر شر سے محفوظ رہنے کیلئے ہر روز بعد نماز فجر اکتالیس بار پڑھ کر اور دشمن کا تصور زمین پر رکھ کر پانچ جوتے مارے جائیں بلا مبالغہ کامیابی ہوتی ہے۔ یہ عمل کم از کم گیارہ روز کرنا چاہیئے۔ اعداء کو مقہور کرنے کا یہ ایک بےمثال عمل ہے۔

یَا سَمِیعُ ۔ یہ قبولیتِ دعا کے لئے بعد نماز چاشت ایک ہزار اکانوے بار پڑھنا اکسیر کا حکم رکھتا ہے مگر وہاں ہی پڑھنا چاہئے جہاں نفل پڑھے ہوں اور حاجت کو دل میں جگہ دی جائے۔ تاثیر میں جلالی ایکسواسی اعداد ہیں۔

یَا بَصِیرُ ۔ یہ اسم مبارک جمالی ہے۔ اور تین سو دو عدد رکھتا ہے۔ مرگِ مفاجات سے مامون رہنے آنکھوں کی بینائی کو محفوظ رکھنے اور بے انتہا رحمت الٰہی کے حاصل کرنے کو اس اسم شریف کا عشاء، عصر، فجر اور ظہر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان ہر روز ننانوے بار پڑھنا خاص طور پر سرفرازی بخشتا ہے۔

یَا حَفِیظُ ۔ جمالی اسم شریف ہے۔ اس کے نو سو اٹھانوے اعداد ہیں۔ یہ اسم شریف مریض کے لئے ہر مرض پر سات ہفتہ تک ہر روز اعداد کے مطابق بعد نماز فجر آبِ تازہ پر دم کر کے پلانے سے بفضلہ تعالیٰ صحت عطا کرتا ہے۔ اور سفر و حضر کے خطرات، طغیانی، آندھی، دشمن کے خوف کے لئے اسکا لکھ کر بصورت تعویذ بازو پر باندھنا امن و سلامتی بخشتا ہے۔

یَا مُقِیتُ ۔ یہ اسم شریف جلالی ہے۔ پانچسو پچاس اعداد ہیں۔ آشوب چشم و دیگر امراض چشم کے لئے گیارہ بار پڑھ کر دم کرنا اور دیگر امراض روحانی و جسمانی کے لئے خالی کورے آبخورے پر ایک سو کیس بار دم کر کے اس میں پانی پینا اور غریبی دور کرنے کے لئے ہر روز سات سو بار ورد کرنا بفضل خدا کامیابی بخشتا ہے۔

یَا حَسِیبُ ۔ جمالی اسم مبارک ہے اور اسی اعداد ہیں۔ ہر خوف و ہراس کے لئے ہمسایہ کی اذیت و دشمن کی دشمنی سے محفوظ رہنے کے لئے آٹھ روز بعد نماز فجر و بعد نماز مغرب ستر ستر بار پڑھنا نہایت فائدہ بخش ہے اور اگر حَسْبِیَ اللّٰہُ الْحَسِیبُ پڑھا جائے تو اور زیادہ امن و امان و برکات کا باعث ہو۔

یَا جَلِیلُ ۔ یہ اسم شریف بھی جمالی ہے اور اس کے تہتر اعداد ہیں۔ اس اسم کا لکھ کر پاس رکھنا یا گھول کر پینا عزت و حرمت بخشتا ہے۔ اور اگر چوری کا ڈر ہو تو اپنے مال پر دس بار پڑھ کر دم کر دینے سے بفضلہ تعالیٰ مال محفوظ رہے گا۔

یَا مُجِیبُ ۔ جلالی اسم شریف ہے۔ اور پچپن ۵۵ اعداد ہیں۔ قبولیت دعا کے لئے اس کا کثرت سے وظیفہ کرنا اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ درد سر کے لئے تین بار دم کرنا اور وبائی امراض کے لئے ایکسو ایک بار زعفران و گلاب سے چینی کی رکابی میں لکھ کر پلانا موجب صحت ہے۔ لکھ کر بچے کے گلے میں ڈالنا آسیب وغیرہ سے

امان میں رکھتا ہے۔

یَاکَرِیْمُ - یہ اسم مبارک جمالی ہے - دو سو ستر اعداد ہیں - اس کا ورد اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت اور بستر پر سوتے وقت رات کو بے تعداد پڑھتے پڑھتے سوجانا رحمت الٰہی کا قرب دلاتا ہے اور اسکی توقیر و تعظیم کیلئے ملائکہ الٰہی دعا کرتے ہیں۔

یَارَقِیْبُ - یہ جمالی اسم شریف ہے اسکے اعداد تین سو بارہ ہیں - ہر نماز کے بعد اس کا ایک سو سات بار پڑھنا اور مال واملاک و بیوی بچوں پر دم کرنا آفات و بلیات سے بچاتا ہے - اور پانی پر پھونک کر مریض کو سات دن پلانا نہایت مفید اور موجب صحت و سلامتی ہے ۔

یَاوَاسِعُ - اسماء الحسنیٰ سے یہ اسم پاک جلالی ہے - جس کے ایک سو سینتیس ۱۳۷ اعداد ہیں - کشادگی رزق کیلئے اسکو گیارہ ہزار بار روزانہ بعد نماز مغرب یا تہجد پڑھنا اکسیر کا حکم رکھتا ہے - ستر بار پڑھ کر اگر عقرب گزیدہ کو دم کیا جائے بفضلہ تعالیٰ فوراً آرام ہو - فقیر کے ایک دوست نے اسکو معمول بنایا تو خواب میں اسکو کسی بزرگ نے کیمیا کا ایک مختصر سا نسخہ فرما دیا جسکو وہ اپنی زندگی میں کرتے رہے - مگر یہ ایک عجیب بات تھی کہ انہوں نے ازراہ ہمدردی جس غریب دوست کو بتایا - اسکو کوئی نفع نہیں پہنچا - شاید اس میں شرط اجازت پوشیدہ ہو -

یَاحَکِیْمُ - جمالی اسم شریف ہے - اس کے اٹھتر اعداد ہیں - ہر مہم کے لئے صرف گیارہ بار کسی بزرگ کے مزار پر جاکر پڑھے - اور خاموش واپس چلا آئے - بفضلہ تعالیٰ کام پورا ہو جائیگا - اور بعد نماز ظہر ہر روز نوے بار اس کا ورد کرنا جہان میں سبکدوشی اور وقار بخشتا ہے ۔

یَاوَدُوْدُ - اس اسم پاک کو بھی جمالی فرماتے ہیں - اس کے اعداد اکیس ہیں - اس کی برکات وصفات اور فضائل بہت زیادہ ہیں - مولا کریم سے مودت کیلئے اس کی باقاعدہ تلاوت قرب بخشتی ہے - کسی محبت کے سلسلے میں اسکا پانچسو بار بعد نماز مغرب پڑھنا کامیاب فرماتا ہے - بشرطیکہ مطلوب کا تصور رکھ کر پڑھا جائے - اگر کسی کی اولاد نافرمان ہو تو بعد نماز جمعہ مسجد جامعہ میں ہی باوضو قبلہ رُخ بیٹھ کر ایک ہزار اکیس بار پڑھنا اور کسی شیرینی پر دم کر کے نافرمان کو کھلانا بفضلہ تعالیٰ صلاحیت پیدا فرماتا ہے - ہاں یہ امر یاد رہے کہ جب اکہزار اکیس بار پڑھ چکے تو اسی مقام پر فوراً کھڑا ہو جائے اور دو رکعت نماز نفل برائے اعانت سوال لازم فی الذہن بھی ادا کرے ۔

یَامُجِیْبُ - اس اسم شریف کو جمالی لکھا گیا ہے - اور ستاون ۵۷ اعداد ہیں - اس کی خوبیوں اور تاثیروں سے

ایک بات یہ بھی ہے کہ جس کو کوڑھ (جذام) یا سُرخ باد یا پھلبہری اور جنبل وغیرہ ہو وہ چاند کی تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخوں کے تین روزے رکھے اور ہر روز روزہ کی افطاری سے پہلے اس اسم شریف کو گیارہ ہزار بار پڑھ کر پانی اور زخم پر دم کرے۔ اور پھر اسی پانی سے ذرا سا نمک ملا کر روزہ افطار کرے۔ خداوند عالم شفا بخشیگا۔ اور اگر کسی کو کسی سے مقابلہ پڑ جائے تو کامیابی اور قیام و وقار کے لیئے ہر نماز کے بعد صرف ستانوے بار یہ اسم مبارک پڑھنا سرخرو فرماتا ہے۔

یَابَاعِثُ - یہ اسم الٰہی بھی جمالی ہے۔ اور ابجد کے لحاظ سے پانچسو تہتر اعداد رکھتا ہے۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ اس کی برکات بہت زیادہ ہیں۔ کام دینی ہو یا دنیوی آسمان کی طرف منہ کر کے صرف سات مرتبہ یہ اسم شریف پڑھنے سے بفضلہٖ تعالیٰ ( ) ہو جاتا ہے۔ البتہ شاہی درباروں میں باوقار ہونے کے لیئے طلوع آفتاب کے وقت تفکرات سے نجات پانے کے لیئے بعد نماز تہجد اور دل زندہ کرنے کو سوتے وقت پڑھنا چاہیئے۔ نیز کشف قبور کے لیئے اس اسم پاک کو اکیس ہزار بار قبر پر بیٹھ کر تلاوت کرنا اور اکتالیس دن کرنا صاحب کشف کر دیتا ہے۔ اور ایک سو ایک بار چینی کی رکابی پر زعفران سے لکھ کر مریض کو گیارہ یوم پلانا خدا کے فضل سے شفا بخشتا ہے۔

یَاشَهِیْدُ - جمالی اسم ہے۔ تین سو انیس اعداد ہیں۔ ہر نا فرمان کے لیئے اس کا تصور رکھ کر اور ایسی جگہ کھڑے ہو کر جہاں آسمان نظر آئے اور چھت نہ ہو صرف اکیس بار پڑھ کر پھونک دینا اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اور نافرمان اولاد کے لیئے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اور آسمان کی جانب نگاہ کر کے پڑھنا چاہیئے۔ بفضلہٖ صالح ہو جائیگی۔

یَاحَقُّ - یہ اسم پاک جلالی ہے۔ اور اس کے ایک سو آٹھ عدد ہیں۔ اور ایک سو آٹھ ہی درجات بخشتا ہے گمشدہ چیز کے لیئے اس کو کسی کاغذ کے چاروں کونوں پر لکھ کر بیچ میں گمشدہ شئے کا نام لکھے اور رات کو آسمان کی جانب کر کے وہ تعویذ کہیں رکھ دے۔ بفضلہٖ تعالیٰ مال گمشدہ مل جائے گا۔ اور کسی معاملہ میں حق و باطل کا مقابلہ ہو تو تین سو سات بار لکھ کر پلانے یا کسی دوسرے مناسب طریق پر استعمال کرانے سے حق حق اور باطل باطل ظاہر ہو جاتا ہے۔

یَاوَکِیْلُ - جمالی اسم مبارک ہے۔ اور اس کے چھیاسٹھ اعداد ہیں۔ اتفاقی حوادث مثلاً بارش، تیز آندھی، بجلی

وغیرہ کا خوف ہو تو اس اسم پاک کا فوراً تلاوت کرنا امان بخشتا ہے۔ جنگل، رات کی تاریکی، قبرستان یا کسی دوسرے خوف کے مقام میں اسکا پڑھنا قلب کو فراخی اور استقامت عطا کر کے نڈر کر دیتا ہے۔ اور زندہ دشمن کی دشمنی سے محفوظ رہنے کے لئے بوقت عصر ہر روز صرف سات بار بعد نماز عصر پڑھنا حفاظت کی کلید ہے

یَا قَوِیُّ - یہ اسم شریف جلالی ہے۔ جس کے ایک سو سولہ اعداد ہیں۔ شرِ دشمن سے امن و سلامتی مطلوب ہو تو اس اسم کو ایک سو سولہ بار چاندی کی پلیٹ میں یا جس پر چاندی کا پانی چڑھا ہوا ہو مشک و زعفران اور گلاب سے لکھے۔ پھر گلاب ہی میں دھو کر اس میں تھوڑا سا آٹا گیہوں کا گوندھے اور اس کی ایک ہزار ایک سو سولہ گولیاں بنا کر بہ نیت دفعیہ دشمن ایک ایک گولی اٹھاتا جائے اور "یَا قَوِیُّ" پڑھ کر مرغ یا کسی جانور کے آگے ڈالتا جائے یعنی اس کو کھلا دے تو دشمن مقہور ہو گا۔ اور دشمنی چھوڑ دے گا۔

یَا مَتِیْنُ - جمالی اسم ہے۔ ستر عدد ہیں۔ اس کا ستر بار پڑھنا اور پڑھ کر مریض کو پانی پلانا بالخصوص چھوٹے بچوں کے لئے اکسیر ہے۔

یَا وَلِیُّ - یہ اسم شریف بھی جمالی ہے۔ چھیالیس عدد رکھتا ہے۔ خانگی حالات کی درستی۔ میاں بیوی کے اتفاق اور مخلوق میں نیک نام ہونے کے لئے اس اسم کا کثرت سے تلاوت کرنا سرفرازی بخشتا ہے۔ خاوند اگر نا اتفاق بیوی کے لئے اور بیوی بدسلوک خاوند کے لئے اگر کچھ روز بطور وظیفہ بہ نیت سلوک پڑھے تو کامیاب ہو۔

یَا حَمِیْدُ - یہ اسم بھی جمالی ہے اور اسکے باسٹھ اعداد ہیں۔ اخلاق کی درستی کیلئے پڑھنا اور بدگوئی سے حفاظت کیلئے لکھ کر پاس رکھنا اور فکر و غم سے آزاد ہونے کے لئے چینی کے پیالہ میں نو د بار لکھ کر پینا انتہائی تاثیر دکھاتا ہے۔

یَا مُحْصِیُ - یہ اسم مبارک جلالی ہے اور اس کے ایک سو اڑتالیس اعداد ہیں۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص جمعرات کو بعد نماز عشاء ایک ہزار ایک بار اس اسم شریف کی تلاوت کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب قبر، عذاب حشر اور خطرات پلصراط سے مامون فرما دیتا ہے۔ اور جو کوئی ہر روز بعد نماز فجر ایک سو ایک بار پڑھتا رہیگا۔ ہر روز کے آنے والے فتنوں اور آفات سے محفوظ ہو گا۔

یَا مُبْدِئُ - یہ اسم پاک بھی جلالی ہے۔ اور اس کے چھپن عدد ہیں۔ اس اسم مبارک کی تاثیر میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ اگر کسی عورت کا حمل ساقط ہو جاتا ہو۔ یا وقت سے زیادہ وضع حمل میں تاخیر ہو جائے۔ یا حمل میں خوف

وغیرہ آتا ہو یا کوئی اور عارضہ حمل کے متعلق ہو تو اس عورت کا خاوند بعد نماز تہجد نوّے بار اس اسم شریف کو پڑھے، اور انگشت سبابہ پر دم کرکے پیٹ کے گرد پھیرے بفضلہٖ تعالےٰ حمل ساقط نہ ہوگا۔ اور صحیح وقت پر بلا تکلیف بچہ پیدا ہوگا۔ نہ پڑھ سکنے کی حالت میں اس اسم شریف کا گلاب اور زعفران سے کسی چینی کی پلیٹ میں باوضو لکھ کر مریضہ کو چالیس دن میں پلانا یہی اثر رکھتا ہے۔

یَا مُعِیْدُ ۔ یہ جمالی اسم پاک ہے اور اس کے ایک سو چوبیس اعداد ہیں۔ اس کو بعض بزرگانِ دین نے بطور گمشدہ کے پڑھنا تلقین فرمایا ہے۔ یعنی اگر کسی کا کوئی عزیز گم ہو جائے یا پتہ ہو اور وہ گھر نہ آئے تو گھر کا کوئی بزرگ اس اسم کو ستر ستر بار مکان رہائشی (جس میں رہتا ہو) کے چاروں کونوں میں پڑھے اور بعد ۂ یوں کہے۔ کہ الٰہی میرے فلاں بن فلاں (اسکا نام اور اسکی والدہ کا نام) لے کر کہے کہ اس کو گھر واپس لا۔ تو بفضلہٖ تعالیٰ سات یوم ایسا کرنے سے وہ خود آجائے گا۔ یا اس کی خبر مل جائے گی۔

یَا مُحْیِیْ ۔ یہ اسم مبارک جلالی ہے۔ اور اس کے اڑسٹھ عدد ہیں۔ رنج و مصیبت میں مبتلا ہونے والا اگر اس کی اس طرح تلاوت کرے کہ ایک صاف جگہ میں پانی پھیر کر خشک ہونے پر اس کے گرد حصار کی لکیر کھینچکر اس کے اندر خود بیٹھ جائے اور اس اسم شریف کو اول آخر سات سات بار درود شریف ہزارہ پڑھ کر اس کے اعداد کے مطابق پڑھے تو ایک ہی دن کے ایسا کرنے سے مصیبت سے نجات پائے۔ وجع المفاصل کے لئے اس کا ہر روز ستّر بار فجر کو پڑھ کر گیارہ دن آٹھ کنوؤں کے پانی پر دم کرکے پینا اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اور بعض اولیاء اللہ نے دل کے زندہ کرنے کو بھی گیارہ سو بار ہر روز پڑھنا اور ہمیشہ پڑھتے رہنا فرمایا ہے۔

یَا مُمِیْتُ ۔ یہ اسم الٰہی بھی جلالی ہے۔ اس کے چار سو نوّے اعداد ہیں۔ جادو کے اثر سے مامون و محفوظ رہنے کے لئے اس کی ہر روز بہتّر بار تلاوت بعد نماز مغرب نہایت کا اثر رکھتی ہے۔ اور جس آدمی کو عبادت میں رغبت نہ ہو وہ رات کو سوتے وقت دل پر ہاتھ رکھ کر بے تعداد پڑھتا سو جائے۔ انشاء اللہ متّقی ہو جائیگا۔

یَا حَیُّ ۔ اسماء الحسنیٰ سے اس کو بھی جلالی اسماء میں لکھا گیا ہے۔ اور اٹھارہ اعداد ہیں۔ دل کی زندگی، بیماری سے شفا مسافر سے قربت، اولاد سے سلوک، بیوی سے تابعداری کی تمنا پر اس کو اٹھارہ یوم، اٹھارہ سو بار ہر روز بعد نماز ظہر یا اشراق پڑھنا خدا کے فضل سے کامیابی بخشتا ہے۔ کسی دوسرے بیمار کے لئے اگر ستّر بار پڑھ کر دعا کی

جائے تو وہ صحت پائے اور عمر اس کی دراز ہو۔

یَا قَیُّوْمُ - یہ اسم شریف بھی جلالی ہے۔ اور اس کے ایک سو چھپن عدد ہیں۔ بعد نماز تہجد اس کا پانچ سو بار پڑھنا خدا کی مخلوق کے لئے تسخیر کا کام دیتا ہے۔ بشرطیکہ اوّل آخر بائیس بائیس بار درود شریف ابراہیمی پڑھا جائے زیادہ پڑھنے کے لئے بھی اجازت ہے۔ مگر درود شریف کی تعداد یہی رہے گی۔

یَا وَاجِدُ - جلالی اسم ہے اور صرف ۱۴ عدد ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی حاجت کے لئے بطور وظیفہ ہر روز ایک لاکھ بار ۱۴ دن تک پڑھے تو مالدار ہو جائے۔ کھانا کھاتے ہوئے ہر لقمہ کے ساتھ ساتھ اگر ایک ایک بار کھانا کھانے والا پڑھتا جائے تو کھانے کو مفید پانے کے علاوہ اپنے اندر نورانیت بھی محسوس کرے۔ جنگل میں تنہا بیٹھ کر پڑھنے والا غیب سے امداد پائے اور محتاج نہ رہے۔

یَا مَاجِدُ - یہ اسم مکرم جلالی ہے۔ اور اس کے اڑتالیس عدد ہیں۔ اس کو خلوت میں ہر روز سوا لاکھ بار پڑھنے والا انوار الٰہی اور تجلیات نامتناہی پاتا ہے۔ اور مخلوق میں برگزیدہ اور مقبول ہو جاتا ہے۔

یَا وَاحِدُ - یہ اسم معظم بھی جلالی ہے۔ جس کے انیس عدد ہیں۔ پڑھنے والا اس کے وظیفے سے صاحب اولاد ہو جاتا ہے اور خلوت و تنہائی میں ۱۹ دن پڑھنے سے اس کو بیشمار اسرار کھلتے ہیں۔ اگر پانی پر دم کر کے کسی مریض کو پلایا جائے تو شفا ہو۔

یَا اَحَدُ - جلالی اسم شریف ہے۔ اور اعداد تیرا ہیں۔ اس کو تیرا بار تلاوت کر کے جس کسی حاکم یا بڑے آدمی کے پاس جائیں وہ عزت و سرفرازی سے پیش آئے۔ اور اگر ایک سو ایک بار پڑھ کر سانپ کے کاٹے کو دم کیا جائے تو شفا ہو۔

یَا صَمَدُ - یہ اسم مبارک جمالی ہے اور اس کے ایک سو چودہ عدد ہیں۔ بعد نماز تہجد سر کو سجدے میں رکھ کر اس کا اس کے اعداد کے مطابق پڑھنا انسان کو صاحب حال و قال بنا دیتا ہے۔ دنیا اس کی برکت قدم سے نفع حاصل کرتی اور اس کے پیچھے دوڑتی ہے۔ کوئی ظالم اس پر قابو نہیں پا سکتا۔ اور نہ ہی اس کا عامل دنیا میں کسی کا محتاج رہتا ہے۔ قیدی اگر پڑھے رہائی پائے۔

یَا قَادِرُ - یہ اسم مکرم جلالی ہے۔ اس کے تین سو پانچ اعداد ہیں۔ ظلم کے شر سے محفوظ ہونے اور غربت وطن

سے بچنے کے لئے بیحد نافع ہے۔ اس کے پڑھنے کا طریق یہ ہے کہ عین مکان یا کمرے کے درمیان میں ننگے سر اور ننگے پاؤں آنکھیں بند کر کے اور کھڑا ہو کر تین سو پانچ بار اپنی حاجت کو خیال میں رکھ کر پڑھے۔ اور پڑھ چکنے کے بعد سیدھا سجدے میں گر جائے اور بارگاہِ باری تعالیٰ میں سات بار عرض کرے کہ اے قادرِ مطلق تجھکو میری حاجت یاد ہے اور فارغ ہو جائے۔

یَا مُقْتَدِرُ ۔ یہ جلالی اسم مبارک ہے۔ اور سات سو چوالیس اعداد ہیں۔ اس پر عمل کی مدامت کرنے والا ذکر الٰہی سے غافل نہیں رہتا۔ ہر روز درود شریف کچھ تعداد میں پڑھ کر سات سو چوالیس بار اس کا پڑھنا ہر میدان میں کامیاب رکھتا ہے

یَا مُقَدِّمُ ۔ یہ بھی اسم شریف جلالی ہے اور اس کے ایک سو چوراسی عدد ہیں۔ اگر یہ کسی کو لکھ کر پلایا جائے تو محبت کرے جنگ کے موقع پر پڑھا جائے کامیابی ہو۔ شیرینی پر پڑھ کر بچے کو کھلائیں تو حافظہ تیز ہو جائے۔

یَا مُؤَخِّرُ ۔ جلالی اسماء سے ہے۔ آٹھ سو چھیالیس عدد ہیں۔ یاد الٰہی کے ساتھ دلبستگی اور غیر خیالیوں سے نجات پانے کیلئے گیارہ یا اکیس یا اکتالیس یوم اسکا اس کے اعداد کے مطابق بعد نماز عصر پڑھنا پورا اثر دکھاتا ہے۔ اور نفس کی ایسی اصلاح ہوتی ہے کہ سرمو انحراف نہیں کرتا اور مطیع ہو جاتا ہے۔

یَا اَوَّلُ ۔ تاثیر کے لحاظ سے یہ اسم پاک بھی جلالی ہے۔ اور سینتیس عدد رکھتا ہے۔ بے اولاد اگر اسکو چالیس دن سامنے ۹ چھوہارے رکھ کر ہر روز ایک ہزار ایک بار پڑھے اور ہر روز نو چھوہاروں پر دم کرتا جائے۔ حتیٰ کہ چالیس یوم گذر جائیں۔ پھر عورت کو بعد غسل حیض وہ چھوہارے تین دن تک تین تین روزانہ کھلاتا رہے اور چوتھے دن قربت کرے تو خدا کے فضل سے اولاد حاصل ہو۔ اور عورت حاملہ ہو جائے۔

یَا اٰخِرُ ۔ یہ جلالی اسم شریف ہے۔ اور آٹھ سو ایک عدد رکھتا ہے۔ مسافر کے لئے سفر کو جاتے وقت اور ملازم کے لئے مقام ملازمت پر جاتے ہوئے اور افسروں کا سامنا کرتے ہوئے اور تاجر کے لئے دکان کے دروازے پر اس اسم کا اکتیس بار پڑھنا اور پھر مطلب کو رجوع کرنا یقینی طور پر کامیابی بخشتا ہے۔ اور جو شخص بہت ضعیف اور شیخ فانی ہو چکا ہو اور اعمال صالح میں کمی محسوس کرتا ہو تو اس اسم کو ہر روز باوضو بعد نماز عشاء، یا قبل نماز فجر تین ہزار تین سو تین بار تلاوت کیا کرے۔ بفضلہ تعالیٰ عاقبت بخیر ہو جائے گی۔

یَاظَاهِرُ - یہ بھی اسمائے جلالیہ سے ایک متبرک اسم ہے - جس کے اعداد ایک ہزار ایک سو چھ ہیں - اس کا بعد نمازِ اشراق سوا لاکھ کی تعداد میں وظیفہ کرنا تسخیرِ خلائق کے لئے اکسیر ہے - دنیا کا ہر چھوٹا بڑا اس کے عامل سے برکت ڈھونڈے گا - اور غلامی کی خواہش کرے گا - اس کے ہر رات کو گیارہ بار پڑھ کر سرمہ کی سلائی پر دم کرکے سرمہ آنکھوں میں لگانے سے آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں - اور رتوندی نہیں ہوتی - آندھی وغیرہ کا یا وبائی امراض کا ڈر ہو تو مکان کے دروازے یا دیوار پر لکھنے سے بفضلہ تعالےٰ محفوظ رہے - بعد نمازِ ظہر پانچسو بار اس کا پڑھنا اور بدن پر دم کرنا ہر قسم کی بیماری سے صحت بخشتا ہے - اگر کسی جگہ سے کنوآں کھودا جائے اور پانی نہ نکلے تو اس اسمِ شریف کو ہر روز بعد نماز اشراق سوا لاکھ بار پڑھ کر کسی پانی پر دم کرکے اس کنوئیں کے خشک گڑھے میں اکتالیس یوم ڈالتے رہیں - خدا کے فضل سے پانی جوش مارکر نکلے گا اور نہایت شیریں و بارد ہوگا -

یَابَاطِنُ - یہ اسمِ مبارک جمالی ہے - اور اس کے باسٹھ عدد ہیں - صاحبِ باطن بننے اور مقبولِ خدا و منظورِ خلق ہونے کے لئے اس اسم شریف کی ہر روز گیارہ ہزار بار تلاوت کسی قبرستان میں بیٹھ کر کرنا اور اکتالیس دن کرنا اکسیر کا حکم رکھتی ہے - اور ہمیشہ مداومت کرنے والا جہان میں عزیز ہوگا -

یَاوَالِیُ - جمالی اسم ہے اور سینتالیس اعداد رکھتا ہے - ہر نماز کے بعد ہر روز سینتالیس بار اسکا پڑھنا نورِ ایمان کو بڑھاتا ہے - اور بے آباد مکان میں اگر پانی پر دم کرکے چھڑکا جائے تو آباد و بارونق ہو - تسخیرِ خلائق کے لئے بھی بعض حضرات نے اس کو مفید بیان فرمایا ہے - مگر فقیر کا تجربہ نہیں ہے -

یَامُتَعَالِیُ - یہ اسم مبارک جلالی ہے اور اس کے پانچسو اکاون اعداد ہیں - اس کو ہر گھڑی تلاوت کرنے والا اور بہت زیادہ پڑھنے والا ہر میدان میں کامیاب ہوتا ہے - جس عورت کا حیض بند ہو تخمیناً ان ایام کا اندازہ لگا کر بہت زیادہ تلاوت کرے تو حیض جاری ہو جائے - اور تمام رحمی بیماریوں سے محفوظ رہے -

یَابَرُّ - یہ اسمِ پاک بھی جلالی اسماء الحسنیٰ سے ہے اور اس کے دوسو تیرہ اعداد ہیں - نشے والی اشیاء سے بچنے اور شراب وغیرہ کی عادت کو دور کرنے کیلئے اس اسم پاک کا پانی کے کنارے بعد نماز عصر کھڑے ہوکر دوسو تیرہ بار پڑھنا اور دوسو تیرہ ہی دن پڑھنا بفضلہ تعالیٰ کامیاب فرماتا ہے - شیر خوار بچے پر اگر اسی تعداد میں پڑھ کر دم کر دیا جائے تو اسکی برکت سے جوان ہونے تک اکثر آفات و بلیات سے مامون و محفوظ رہے - اور وبائی امراض سے بچنے کیلئے تو ایام بیماری میں پڑھنا بیحد نافع اور امان

بخشنے والا ہے۔

یَا تَوَّابُ ۔ یہ اسم مبارک جمالی ہے۔ اس کے چار سو نو عدد ہیں۔ اس اسم شریف کے تین سو ساٹھ بار پڑھنے سے سچی توبہ اور اعمال صالحہ کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ پڑھنے کا وقت بعد نماز چاشت ہے۔ بزرگانِ دین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس کا عامل محتاج نہیں رہتا۔

یَا مُنْتَقِمُ ۔ یہ جمالی اسماء سے ہے اور چھ سو تیں اعداد ہیں۔ اگر اعداد کی تعداد کے مطابق بروز جمعہ تلاوت کیا جائے ہر دشمن پر غلبہ ہو۔ کسی حاجت کے پورا ہونے کے لئے بعد نماز تہجد تلاوت کرنا اکسیر ہے۔ اگر بدلہ لینے کی نیت سے دشمن کے تصور پر پھونکا جائے تو دشمن ہلاکت میں پڑے یا جگہ چھوڑ کر بھاگ جائے۔

یَا عَفُوُّ ۔ یہ اسم مقدس اسمائے جلالیہ سے ہے۔ اور ایک سو چھپن اعداد ہیں۔ عفو معصیت کیلئے اس پر مداومت کرنا اور ایک سو چھپن دن ہر روز سات سو چھیاسی بار پڑھنا گناہ کی توفیق ہی سے نجات دیدیتا ہے۔ اگر بیس بار پڑھکر بشرطیکہ پہلے اس کا عمل کیا ہو کسی تلوار چھری یا تیز دھار آلہ پر دم کر دیا جائے وہ بحکم الٰہی قطعی اثر نہ کرے گا۔

یَا رَؤُفُ ۔ جلالی اسم ہے۔ اسکے دو سو چھیاسی عدد ہیں۔ سفارش کیلئے اسکا دس بار پڑھنا مطلب براری کیلئے گیارہ بار پڑھ کر کسی کے سامنے جانا ظالم اور قید سے نجات حاصل کرنے کیلئے ہر روز بعد نماز فجر تیرہ بار پڑھنا اور کسی کی محبت میں کامیابی کیلئے بہ پابندی اکتالیس دن تک آٹھ نمازوں کے بعد چودہ بار تلاوت کرنا خدا کے فضل سے کامرانی بخشتا ہے۔

یَا مَالِكُ الْمُلْكِ ۔ جلالی اسمائے مبارکہ سے وہ جلالی اسم ہے جس کا جلال بے پناہ ہے۔ اس کے دو سو بارہ عدد ہیں۔ مہمات و حاجات کیلئے اسکی تلاوت کی مداومت کرنا دین و دنیا میں کامیاب کرتا ہے اس کا وظیفہ گنتی کے ایام میں تونگر کر دیتا ہے اور محتاجی نام کو نہیں رہتی۔ غریبی سے بچنے کیلئے چار سو بیس بار یہ اسم شریف کسی جنگل میں بیٹھ کر پڑھنا چاہئے۔

یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۔ یہ اسم پاک بھی جلالی ہے اور ایک ہزار چورانوے اعداد رکھتا ہے بعض بزرگان دین نے اس کو اسم اعظم فرمایا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ اگر بیماری کے لئے سو دفعہ یہ اسم مبارک باقی ان الفاظ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ بِيَدِكَ الْخَيْرُ وَ

هُوَ عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ سے ملا کر پڑھیں اور پانی پر دم کر کے مریض کو پلائیں تو خدا کے فضل سے شفا کلی حاصل ہو۔

یَا مُقْسِطُ - یہ اسم مبارک بھی جلالی ہے - اس کے دو سو نو اعداد ہیں - شیطانی وسوسہ سے محفوظ رہنے کیلئے اس اسم کا ایکسو ایک بار پڑھنا اور کسی دیگر کام کے لئے سات سو بار تلاوت کرنا اور دفعیہ رنج و پریشانی کے لئے بعد ہر نماز ستر بار عمل رکھنا نہایت خوشی بخشتا اور کامیاب فرماتا ہے۔

یَا جَامِعُ - یہ اسم جلالی ہے اور ایکسو چودہ عدد ہیں - جس کے کوئی عزیز و اقارب کسی حادثہ سے منتشر ہو گئے ہوں اور ان کا پتہ نہ چلتا ہو تو یہ اسم شریف بوقت چاشت غسل کر کے اور کسی ایسی جگہ بیٹھ کر جہاں آسمان دکھائی دیتا ہو یعنی چھت نہ ہو اور آسمان کی طرف منہ کر کے ایک لاکھ چوبیں ہزار بار پڑھے بفضلہ تعالیٰ ایک ہی دن کے کرنے سے چند دنوں میں سب اقارب اور منتشر افراد جمع ہو جائیں گے - پراگندہ قلبی کے لئے بھی اسکا ہر نماز کے بعد ایکسو چودہ بار تلاوت کرنا اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

یَا غَنِیُّ - اسمائے جلالیہ سے ایک اسم متبرک ہے - جس کے ایک ہزار ساٹھ عدد ہیں - جو شخص اس کو بروز جمعرات بعد نماز تہجد یا اشراق اس کے اعداد کے مطابق پڑھے غنی ہو جائے - ہر نماز کے بعد ستر بار اس کی تلاوت کرنے والا ہمیشہ کی برکات پاتا ہے - اور محتاجی اس کے قریب نہیں پھٹکتی۔

یَا مُغْنِیُ - یہ اسم شریف جمالی ہے اور اعداد کے لحاظ سے ایک ہزار ایکسو عدد رکھتا ہے - یہ دونوں اسماء ملا کر پڑھنے سے غائبانہ رزق ملتا ہے اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوتی ہے - جو شخص باون جمعے یعنی پورے سال کے جمعوں میں ہر جمعہ کو ایک لاکھ چوبیں ہزار مرتبہ بطور وظیفہ پڑھے اس پر اللہ کریم کی وہ رحمتیں ہوں کہ اہل جہان اس کے قدموں سے برکت حاصل کریں - اور وہ دنیا و مافیہا سے بے پرواہ ہو جائے فقیر کے ایک عزیز کو ایک بزرگ نے فرمایا تھا کہ تم اگر عورت کے معاملہ میں علاج سے مایوس ہو گئے ہو - تو اسم یَا مُغْنِیُ جماع سے قبل اکتر بار پڑھ کر اپنے سر کی پشت سے لے کر کمر کی ہڈی تک داہنے ہاتھ پر دم کر کے پھیر لیا کرو - بغیر کسی دوائی کے امساک کی لذت پاؤ گے۔

یَا مَانِعُ - یہ جلالی اسم شریف ہے - اور اس کے ایک سو اکسٹھ عدد ہیں - ہر انسان کی خفگی کو دور کرنے میں

بیوی کی کشیدگی کو رفع کرنے اور محتاجی سے بچنے اور بُرے بھیانک خوابوں سے محفوظ رہنے کے لئے سوتے وقت صرف چھپن بار پڑھنا بے حد مفید ہے۔

یَاضَآرُّ - یہ اسم شریف بھی جلالی ہے۔ اور ایک ہزار ایک عدد ہیں۔ اس کو ہر گھڑی باوضو رہ کر کسی تنہا جگہ میں پڑھنا اور اس پر مداومت کرنا تقرب الٰہی کا مستحق بناتا ہے۔ اور اہل قرب سے کر دیتا ہے۔ بعض اہل اللہ نے لکھا ہے کہ حال کو مقام میں بدلنے اور مقام کے جلدی حاصل کرنے کیلئے بہترین وظیفہ ہے۔

یَانَافِعُ - یہ بھی جلالی اسم شریف ہے اور دو سو ایک اعداد ہیں۔ کسی کام میں کامیابی اور حصول مطالب کے لئے اسکا بے تعداد تلاوت کرنا اور کشتی میں سوار ہوتے وقت دو سو ایک بار پڑھ کر سوار ہونا انتہائی حفاظت اور کامرانی بخشتا ہے۔ شب معراج اس کی تلاوت ہر قسم کی پاکیزگی کے ساتھ اسرار الٰہی کے کشف کا موجب ہوتی ہے۔

یَانُوْرُ - یہ اسم مکرم جمالی ہے اور اس کے دو سو چھپن عدد ہیں۔ اس اسم مکرم کا وظیفہ اگر طلوع سورج یا چاند کے وقت سے لیکر اس کے غروب تک غیر معین تعداد میں پوری یکسوئی کے ساتھ کیا جائے۔ یا ہر شب جمعہ میں ایک ہزار اکیس ایک بار کھلی فضا میں بیٹھ کر پڑھا جائے اور اس کے اول آخر سات سات بار سورہ نور بھی تلاوت کی جائے تو دل اور سینہ انوار الٰہی سے منور ہو جاتے ہیں اور طالب کو ایک وہ نور عطا ہوتا ہے۔ جس سے وہ پہلے آشنا نہ تھا۔

یَاهَادِیُ - جمالی اسم ہے۔ بیس اعداد ہیں۔ اس اسم کو ہر نماز کے بعد بیس بیس بار پڑھنا اور بیس یوم پڑھنا اور پھر اکیسویں دن اتنا پڑھنا جتنا کل بیس یوم میں پڑھا گیا اور پھر اس کے بعد ایک بار دعائے مغنی حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ پڑھنا قاری کو اہل معرفت سے بناتا ہے۔ اور ظاہری و باطنی روشنی بخشتا ہے۔

یَابَدِیْعُ - یہ اسم پاک جلالی ہے۔ اور اس کے چھیاسی اعداد ہیں۔ جو کوئی کسی مصیبت یا مہم کے حل کرنے کے لئے اس اسم شریف کو ستر ہزار مرتبہ پڑھے تو یکبارگی کے وظیفے سے مقصود پورا ہو۔ اور اگر ہر روز بعد نماز تہجد یَابَدِیْعَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ایک ہزار بار پڑھے نورانیت سے بہرہ وافر پانے کے علاوہ دنیوی زندگی بھی باعزت و احترام گزارے۔ اگر یہی وظیفہ رات کو سوتے وقت پڑھ کر سوئے خواب میں وہ سیر روحانی کرے جو پاکباز لوگوں کا حصہ ہے۔

یَا بَاقِیُ - یہ اسمِ معظم بھی جلالی ہے - اور اس کے ایک سو تیرہ عدد ہیں - جو شخص اس اسم معظم کی ہمیشہ غیر معین تعداد میں تلاوت کرے اور بلا ناغہ پڑھتا رہے وہ اس قابل ہو جائے کہ باقی رہنے والوں میں اسکا نام ہو - اعمال صالحہ اسکے یقیناً قبول ہوں اور دشمنوں سے بچنے کے لئے اسکی تلاوت اکسیر ہے۔

یَا وَارِثُ - جمالی اسمِ شریف ہے - اور سات سو چودہ اس کے اعداد ہیں - اگر کوئی بے اولاد شخص اس کو ہر روز اسکے اعداد کی تعداد کے مطابق بعد نماز فجر یا ظہر لبِ دریا بیٹھ کر اور جلالی و جمالی پرہیز کر کے حصول اولاد کیلئے اول آخر یہ اور درمیان میں رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ ط اسی تعداد کے برابر پڑھے - اور دریا سے پانی لیکر اس پر دم کر کے بیوی کو پلائے اور خود بھی پئے - بحکم الٰہی اولادِ صالح پیدا ہو - نیز کسی کام کے کرنے کیلئے پڑھنا اور مصیبت و رنج کے دفعیہ کے لئے مداومت کرنا بجید فائدہ بخش ہے۔

یَا رَاشِدُ - یہ بھی جمالی اسم ہے - پانچسو پانچ اعداد ہیں کسی مطلب کے حصول کیلئے نو ہزار بار پڑھنا مطلب میں کامیاب فرماتا ہے - اور نماز مغرب کے بعد کسی مقامِ بلند پر بیٹھکر پڑھنا عقدہ کشائی کراتا ہے - غرضیکہ مہمات کے سرانجام دینے کے لئے بہترین وظیفہ ہے ۔

یَا صَبُوْرُ - جلالی اسم شریف ہے اور دو سو اٹھانوے اعداد ہیں - ہر نماز کے بعد سینتیس بار پڑھنے سے روزی غیب سے ملتی ہے - اور اگر کوئی چاہے کہ اس کے دشمن کی زبان بندی ہو جائے تو اس اسم شریف کا ہمیشہ وظیفہ کرے - دشمنوں کی طرف سے اطمینان پائے گا۔

۷ - عجیب و غریب درود شریف یہ وہ درود شریف ہے جس کی اجازت شاید اس فقیر کے سوا کسی دوسرے درویش کو نہ ہو - کیونکہ یہ خاص الخاص حقائق کے ماتحت اس فقیر کو تلقین فرمایا گیا تھا - جب بہ شرائط خلوت بحالت تجرد کسی پر خطر مقام میں معتکف تھا - اس کی جو برکات ظہور پذیر ہوئیں بیانِ قلم سے قاصر ہے - فقیر درج کتاب ہذا تو کر دیتا ہے - مگر ہر قاری کو اجازت حاصل کرنا شرط ہے - تاکہ اس کی شرائط و مخصوص ہدایات حاصل کر کے عمل کی سعی کرے - ہر شخص ہر جائز و مستحسن غرض کے لئے بطور عمل بھی اس درود شریف کو پڑھ سکتا ہے - خلافِ شرع اور ناجائز کام کے لئے پڑھنے سے آدمی برباد ہو جاتا ہے - لہٰذا احتیاط سے پڑھنا چاہئے - درود شریف یہ ہے - یَا مُحَمَّدُ وَعَلَى الصَّلٰوةِ -

۸ - سورۂ یٰسین شریف

عاملین حضرات نے عمل سورۂ یٰسین شریف کے متعلق بہت سے طریق بیان فرمائے ہیں۔ مگر وہ اس قدر مشکل اور تعداد کے لحاظ سے اسقدر دشوار ہیں کہ ہر خواہشمند ان کو پورا نہیں کرسکتا۔ فقیر ایک سادہ اور سہل طریق لکھتا ہے۔ جو حضرات چاہیں کہ عمل کریں، ان کو اجازت ہے۔ طریق یہ ہے کہ ہر روز بعد نماز تہجد پہلے بسم اللہ شریف سات سو چھیاسی بار پھر سورۂ فاتحہ اکیس بار پھر درود شریف ابراہیمی گیارہ بار، پھر ایک مرتبہ سادہ سورۂ یٰسین پڑھے۔ پھر اس کے بعد عمل کے طور پر شروع کرے اور ہر مبین تک جس وقت پہنچے پھر شروع سے شروع کرکے اگلی مبین تک جائے اور اسی طرح سات مبین تک ہر بار شروع سے لگ کر ختم کرے۔ پھر اس کے بعد ایک سو اکیس بار یاخفی الالطاف نجنی مما اخاف پڑھے اور دعا مانگے۔ اکتالیس دن ایسا ہی کرنا چاہئے۔

۹ - سورۂ مزمّل شریف

سورۂ مزمّل شریف کے پڑھنے کا مشہور اور اچھا طریق یہ ہے کہ عامل پہلے تین سو تیرہ بار اعوذ باللّٰہ پڑھے۔ پھر سات سو چھیاسی بار بسم اللہ شریف، پھر بائیس بار درود شریف ہزارہ پھر سورہ مزمل شریف کو شروع کرے اور تین بار پڑھے یاایھا المزمّل صلی اللہ علیہ وسلّم۔ پھر چوتھی بار آگے چلے اور درود شریف درمیان میں نہ پڑھے۔ اور ہر آیت کے اختتام پر اس کے آخری لفظ کا گیارہ بار تکرار کرے۔ پھر اس تکرار کے بعد اگلی آیت تلاوت کرے۔ اس طرح سے اٹھارہ مقام ہیں۔ جہاں اس کو تکرار کرنا پڑے گا۔ اس قاعدے سے ایک بار پڑھ چکنے کے بعد پھر آخر میں درود شریف بائیس بار۔ بسم اللہ شریف سات سو چھیاسی بار اور اعوذ باللّٰہ تین سو تیرہ بار پڑھے۔ اور سر کو سجدے میں رکھ کر جو چاہے دعا مانگے۔ اس طرح اکتالیس دن بطور عمل کے پڑھنے سے بعد پھر ہر روز صرف تکرار کے ساتھ ایک مرتبہ پڑھ لیا کرے۔ پھر پہلے اور پیچھے بسم اللہ و اعوذ وغیرہ کی پابندی نہیں۔ ہاں درود شریف پڑھ لینا چاہئے۔ یا ایک ایک بار اعوذ و بسم اللہ۔

۱۰ - سورۂ فاتحہ

سورۂ فاتحہ نہایت بابرکت سورت ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ سورت فاتحہ موت کے سوا تمام آفات و بلیات اور جمیع امراض و اعراض کا علاج ہے۔ اگر اس قاعدے پر اسکو بطور وظیفہ معمول بنایا جائے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی آخری میم کو الحمد کے

لام سے ملاکر پڑھیں اور تین بار "الرحمٰن الرحیم" کا تکرار کریں اور تین بار ایاک نعبد وایاک نستعین کا تکرار کریں اور تکرار کرتے وقت مقصود کو سامنے رکھیں اور پھر بقیہ سورت پوری کرکے اس طرح اکتالیس بار ہر روز پڑھیں۔ اللہ کریم ہر حاجت پوری فرمائے گا۔

سورۂ یوسف بعد نماز تہجد یا عین نماز تہجد میں سورۂ یوسف کی تلاوت پر ہمیشگی کرنا بحکم خدا محتاجی سے بچاتا ہے اور پڑھنے والوں کو مخلوق سے بے نیازی حاصل ہوجاتی ہے۔ حضور محبوب سبحانی غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں۔ کہ اوّل درود شریف دس بار۔ بسم اللہ شریف سات بار الر تلک آیت الکتب المبین دس بار ویتم نعمتہ علیک دس بار واللہ المستعان علی ما تصفون ایک سو بار واللہ غالب علی امرہ دس بار فهو کظیم دس بار لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین دس بار افوض امری الی اللہ دس بار پڑھ کر سر زمین پر رکھے اور بصورت سجدہ نعم المولی ونعم الوکیل غفرانک چالیس بار اور بارک وسلم چالیس بار پڑھے۔ پھر سورت شریفہ شروع کرے اور جب انی لطیف لما یشاء پر پہنچے تو اس کا سو بار تکرار کرے۔ اسی طرح انت ولی فی الدنیا سو دفعہ پڑھے اور سورۃ کو ختم کرکے یہ دعا مانگے۔ توفنی مسلما والحقنی بالصلحین۔ رسالہ کیمیا میں حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص روزانہ اس طریق سے سورۂ یوسف کی تلاوت کرے گا۔ مخلوق سے بے پرواہ ہوجائیگا ایک تابعی سے مروی ہے کہ سورۂ یوسف کو جو شخص کسی غم والم میں پڑھے گا رزق میں ترقی پائیگا۔ بلا سے محفوظ اور ہر شخص کے نزدیک معزز ہوگا۔ ایک بزرگ کے نزدیک پڑھنے کا طریق یہ بھی محقق ہے کہ سورۃ کو تلاوت کرتے وقت جہاں جہاں حضرت یوسف علیہ السلام کا نام نامی آئے وہاں وہاں ایک سو چھپن بار یا عزیز پڑھنا اور مقصد کا خیال رکھنا مقصد میں کامیابی بخشتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ
اللّٰھم اشرکنا فی دعآءِ صالح المؤمنین ط

دُعائے فیضی

مجرّبہ از ابوالفیض قلندر علی سہروردی

سبحان اللہ رحمت اور کرم وہ بے نہایت اور رافت و رحم وہ بے حساب ہے کہ دینے والا نہ صرف یہ کہ مانگنے والوں کو اپنے آستان پر پہنچنے کا طریقہ سمجھائے۔ بلکہ انہیں حکم فرمایا کہ آنے والو آؤ۔ میرے دروازے پر آؤ۔ مجھ سے مانگو مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار سنوں گا۔ سُنتا ہوں۔ تمہاری طلب پوری کروں گا۔ تم جو مانگو گے، جو کچھ مانگو گے ہیں تمہیں دوں گا۔ اور یاد رکھو مجھ سے مانگو۔ جو نہیں مانگیں گے ان کے لئے ایک خوفناک سزا تیار ہے وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دٰاخِرِیْنَ۔ ایک کائنات ہے کہ لٹائی جا رہی ہے۔ اور کیا کچھ ہے، جو نہیں دیا جا رہا۔ نہ اس کائنات کی کوئی حد، نہ اس دولت کا کوئی حساب۔ نہ دینے والے کے دیئے ہوئے کا کچھ شمار۔ حکم فرمایا کہ لوگو بہت مانگو۔ بہت پکارو۔ بار بار مانگو۔ کیونکہ تم اس سے مانگ رہے ہو جو بندوں کی طرح بار بار سوال کئے جانے سے اُکتا نہیں جاتا۔ اور نہ اس کے خزانے محدود ہیں۔

بندگی یہی ہے کہ مالک کے سامنے اس کی طرف سے عائد کیا ہوا تقاضائے بندگی پورا ہوتا رہے آقا وہ ہے، جو سب دینے والوں سے بڑا دینے والا، کروڑوں ستاروں کا مالک، مکان و لامکان کا مختارِ مطلق ناظمِ کل۔ ازل و ابد کا حاکم۔ اس کائنات کا جہاں حدّ و جہت ہے اور اس کائنات کا جہاں حد و جہت نہیں۔ قابض و مالک۔ اتنے بڑے آقا کا بندہ اپنے مولا کی جود و کرم کی کائنات سمیٹنے کے لئے اس کے آستان پر عرض گذار نہ ہو تو یہ اپنے مولا کی رافت و رحمت سے روگردانی نہیں تو اور کیا ہے

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ ط قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ - اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَاًنِ الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط نہ صرف یہی بلکہ اس کی رحمت ہر محسوس اور غیر محسوس چیز سے کہیں زیادہ وسیع ہوئی۔ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ہاں رحمت کو اپنی ذات کا لازمہ بنایا۔ اِنِّیْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ط اپنی رحمت کو وہ کچھ فرمایا جیسے کسی آن، کسی لمحہ، کسی موقعہ، کسی مقام پر، کسی صورت میں، کسی حیثیت میں اپنی ذات سے علیحدہ نہیں بتایا۔ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔

اس کی رحمت ہی ہے کہ اپنے مقبولانِ بارگاہ کے وسیلے سے مانگنے والوں کو یہ بھی بتایا۔ کہ کس طرح مانگیں۔ اپنے مقربین کی زبان سے پکار کے الفاظ ارشاد فرمائے۔ کبھی وہ الفاظ آدمؑ و نوح علیہما السلام کی زبان پر رواں فرمائے، کبھی یونسؑ و موسیٰ علیہما السلام کی وساطت سے ظاہر کئے اور کبھی یہ بھی ہوا کہ رحمت نے اپنی رحیمی کے صدقے رحمت طلب کرنے کا طریق بتانے کا کرم بھی فرمایا۔

صفحات آئندہ پر مندرج دعا بھی ایک مقبول بارگاہِ رحمت کی دعا ہے۔ رحمت وسیع ہے۔ رحمت کے لئے پکار بھی وسیع ہے۔ یہ بھی پکارنے کا ایک انداز ہے۔ پکارنے والے ان الفاظ میں رحمت کو پکاریں اور اپنے دامنِ ایمان کو رحمت کی فراوانیوں اور دونوں جہان کی شادکامیوں سے منتسب کرلیں۔ کیونکہ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ فرما کر رحمۃ للعٰلمین کو رحمتِ مجسم بنا کر اس جہانِ آب و گل میں بھیج دیا۔ تاکہ متلاشی ٹھوکر نہ کھائیں۔

یہ دعائے مبارک دین و دنیا کی ہر طرح کی خیر و برکت کے لئے مفیض و مجرب ہے۔ یہ دعا خلوصِ قلب سے جس مقصد کے لئے بھی بطور وظیفہ پڑھی جائے گی رحمتِ عالمین کی طفیل کامیابی ہوگی، حاجات دینی و ضروریات دنیوی کے لئے کفالت کرے گی۔ ہاں کسی خاص مطلب کے تحت پڑھنا ہو تو فقیر سے اس کی اجازت طلب کرلی جائے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

اللہ کا نام لیکر شروع کرتا ہوں جو رحمان اور رحیم ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ یَا اَوَّلَ الْاَوَّلِیْنَ وَیَا اٰخِرَ الْاٰخِرِیْنَ اَنْ تُصَلِّیَ وَتُسَلِّمَ عَلٰی

اے اللہ۔ اے اوّل الاوّلین و الآخرین میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ ہمارے

سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ وَ اَسْئَلُکَ

سردار اپنے محمدؐ پر اور حضورؐ کی ساری آل اور سارے اصحاب پر درود اور سلام بھیج اے سارے جہانوں کے پروردگار اور میں تجھ سے

بِالْقُرْاٰنِ وَتِلَاوَتِہٖ وَبِالْعَرْشِ وَرِفْعَتِہٖ وَالْکُرْسِیِّ وَسِعَتِہٖ وَ اللَّوْحِ وَحِفْظِہٖ

قرآن پاک اور اس کی تلاوت کے صدقے اور عرش اور اس کی بلندی کے صدقے اور کرسی اور اسکی کشادگی کے صدقے اور لوح اور اسکی نگہداری کے صدقے

وَالْقَلَمِ وَجَرْیَتِہٖ وَمِیْکَائِیْلَ وَرِسَالَتِہٖ وَجِبْرَئِیْلَ وَ اَمَانَتِہٖ وَعِزْرَائِیْلَ وَ

اور قلم اور اسکے چلنے کے صدقے اور میکائیل اور ان کی پیغام رسانی کے صدقے اور جبرائیل اور انکی امانت کے صدقے اور عزرائیل اور

قَبْضَتِہٖ وَاِسْرَافِیْلَ وَنَفْخَتِہٖ وَرِضْوَانَ وَجَنَّتِہٖ وَمَالِکَ وَ زَبَانِیَتِہٖ وَ

انکے قبضہ کے صدقے اور اسرافیل اور انکے پھونک مارنے کے صدقے اور رضوان اور ان کی جنّت کے صدقے اور مالک اور ان کی زبانیہ کے صدقے اور

اٰدَمَ وَ صَفْوَتِہٖ وَاِدْرِیْسَ وَرِفْعَتِہٖ وَصَالِحٍ وَ نَاقَتِہٖ وَنُوْحٍ وَ

آدم اور انکی بزرگی کے صدقے اور حضرت ادریس اور ان کی بلندی کے صدقے اور حضرت صالح اور انکی اونٹنی کے صدقے اور حضرت نوح اور ان

سَفِیْنَتِہٖ وَھُوْدٍ وَ ذُرِّیَّتِہٖ وَاِبْرَاھِیْمَ وَخُلَّتِہٖ وَعِیْسٰی وَ رَھْبَانِیَّتِہٖ

کی کشتی کے صدقے اور حضرت ہودؑ اور انکی اولاد کے صدقے اور حضرت ابراہیم اور انکی خلعت کے صدقے اور حضرت عیسٰی اور ان کی تنہائی کے صدقے

وَالْخِضْرِ وَسِیَاحَتِہٖ وَلُقْمَانَ وَحِکْمَتِہٖ وَلُوْطٍ وَعُزْلَتِہٖ وَشُعَیْبٍ

اور حضرت خضر اور ان کی سیاحت کے صدقے اور حضرت لقمان اور انکی دانائی کے صدقے اور حضرت لُوط اور انکی گوشہ نشینی کے صدقے اور حضرت شعیب

وَاِبْنَتِہٖ وَمُوْسٰی وَ تَکْلِیْمِہٖ بِلَاوَحْیٍ وَزَکَرِیَّا وَدَعْوَتِہٖ وَ سُلَیْمَانَ

اور آپکی بیٹی کے صدقے اور حضرت موسٰی اور آپکے کلام بلا وحی کے صدقے اور حضرت زکریا اور آپکی دعوت کے صدقے اور حضرت سلیمان

وَمَمْلَكَتِهٖ وَ دَاوٗدَ وَعِبَادَتِهٖ وَ اَيُّوْبَ وَ بَلْوَتِهٖ وَ يَعْقُوْبَ وَ

اور آپکی مملکت کے صدقے اور حضرت داؤد اور آپ کی عبادت کے صدقے اور حضرت ایوب اور آپ کی آزمائش کے صدقے اور حضرت یعقوب اور آپ کی

حَسْرَتِهٖ وَ يُوْسُفَ وَغُرْبَتِهٖ وَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حسرت کے صدقے اور حضرت یوسف اور آپ کی بے وطنی کے صدقے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ

وَشَفَاعَتِهٖ وَ الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَتِلَاوَتِهٖ وَ الْعِلْمِ وَ دِرَاسَتِهٖ

کی شفاعت کے صدقے اور قرآن عظیم اور اس کی تلاوت کے صدقے اور علم اور اس کے حصول کے صدقے

وَاَبِيْ بَكْرٍ وَ خِلَافَتِهٖ وَعُمَرَ وَ فَارُوْقِيَّتِهٖ وَ عُثْمَانَ وَ خَزَانَتِهٖ

اور حضرت ابوبکر اور آپ کی خلافت کے صدقے اور حضرت عمر اور آپ کی فارُوقیت کے صدقے اور حضرت عثمان اور آپ کے خزانہ کے صدقے

وَعَلِيٍّ وَ شُجَاعَتِهٖ وَالْحَسَنِ وَعِفَّتِهٖ وَ الْحُسَيْنِ وَصُحْبَتِهٖ وَاَسْاَلُكَ

اور حضرت علی اور آپ کی بہادری کے صدقے اور حضرت حسن اور آپکی پاکدامنی کے صدقے اور حضرت حسین اور آپ کی صحبت کے صدقے سوال کرتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ الْعَظِيْمِ الْاَعْظَمِ الْكَرِيْمِ الْاَكْرَمِ وَ اَسْاَلُكَ بِحَقِّ بِسْمِ

اور اے اللہ میں تجھ سے تیرے بڑے بہت بڑے نام اور عزت والے بہت عزت والے نام کے صدقے سوال کرتا ہوں۔ اے میرے رب میں تجھ سے

اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْاَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْفَاتِحَةِ

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورہ فاتحہ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْاَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ

کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورہ بقرہ کے اس حق کے صدقے میں سوال کرتا ہوں جو تجھ پر ہے اور اے میرے رب میں تجھ سے

اَسْاَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ اٰلِ عِمْرَانَ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْاَلُكَ بِحَقِّ

سورہ آل عمران کے اس حق کے صدقے میں سوال کرتا ہوں جو تجھ پر ہے۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۂ نساء کے اس حق کے صدقے

سُوْرَةِ النِّسَاءِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْاَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْمَائِدَةِ

میں جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۂ مائدہ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْاَنْعَامِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ

اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ انعام کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ

وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْاَعْرَافِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ

سے سورہ اعراف کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورہ انفال کے

بِحَقِّ سُوْرَةِ الْاَنْفَالِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ

اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورہ توبہ کے اس حق کے

سُوْرَةِ التَّوْبَةِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ یونس کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر

يُوْنُسَ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ هُوْدٍ عَلَيْكَ

ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ ہُود کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔

يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ يُوْسُفَ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ

اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ یوسف کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ

بِحَقِّ سُوْرَةِ الرَّعْدِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ اِبْرَاهِيْمَ

سے سورہ رعد کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سُورۃ ابراہیم کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْحِجْرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ

ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ حجر کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب

وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ النَّحْلِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ

میں تجھ سے سورۃ نحل کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ بنی اسرائیل کے

سُوْرَةِ بَنِیْ اِسْرَائِيْلَ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورہ کہف کے اس حق کے صدقے

الْكَهْفِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ مَرْيَمَ عَلَيْكَ يَا رَبِّ

جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ مریم کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب

وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ طٰهٰ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

میں تجھ سے سورۃ طٰہٰ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ انبیاء کے اس حق کے صدقے جو

الْاَنْبِيَاءِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْحَجِّ عَلَيْكَ

تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ حج کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔

يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْمُؤْمِنُوْنَ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ

اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ مومنوں کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ

بِحَقِّ سُوْرَةِ النُّوْرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْفُرْقَانِ

نور کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ فرقان کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الشُّعَرَاءِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ

ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ شعراء کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں

وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ النَّمْلِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

تجھ سے سورۃ نمل کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ قصص کے اس حق کے صدقے

الْقَصَصِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْعَنْكَبُوْتِ عَلَيْكَ

جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ عنکبوت کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔

يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الرُّوْمِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ روم کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ لقمان کے صدقے جو

لُقْمَانَ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ السَّجْدَةِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ

تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ سجدہ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ

اَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْاَحْزَابِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ السَّبَا

سے سورۃ احزاب کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورہ سبا کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ فَاطِرٍ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ فاطر کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ یٰس کے اس حق کے

يٰسٓ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الصَّافَّاتِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ

صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ صافات کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ ص

سُوْرَةِ صٓ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ زُمَرٍ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ

کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ زمر کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ مومن

بِحَقِّ سُوْرَةِ مُؤْمِنٍ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ السَّجْدَةِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ

کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ سجدہ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں

وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ شُوْرٰى عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الزُّخْرُفِ عَلَيْكَ

تجھ سے سورۃ شوریٰ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ زخرف کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔

يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الدُّخَانِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ دخان کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ جاثیہ کے اس حق کے صدقے جو

الْجَاثِيَةِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْاَحْقَافِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ

تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ احقاف کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے

اَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ مُحَمَّدٍ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْفَتْحِ عَلَيْكَ

سورۃ محمد کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ فتح کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔

يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْحُجُرَاتِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ حجرات کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ ق کے اس حق کے صدقے

قِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الذّٰرِيٰتِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ

جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ ذاریات کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ

وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الطُّوْرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ النَّجْمِ

سے سورۃ طور کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ نجم کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْقَمَرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ

سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ قمر کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ الرحمٰن اور میرے

سُوْرَةِ الرَّحْمٰنِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْوَاقِعَةِ

اس نام کی بلندی ذکر کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ واقعہ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْحَدِيْدِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ

ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ حدید کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے

وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْمُجَادِلَةِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ

سورۃ مجادلہ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ حشر

بِحَقِّ سُوْرَةِ الْحَشْرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ ممتحنہ کے اس حق کے صدقے جو

الْمُمْتَحِنَةِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الصَّفِّ عَلَيْكَ

تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ صف کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں

يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْجُمُعَةِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ

اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ جمعہ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ منافقون

بِحَقِّ سُوْرَةِ الْمُنٰفِقُوْنَ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْأَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ التَّغَابُنِ

کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ تغابن کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الطَّلَاقِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ

کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ طلاق کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ تحریم

بِحَقِّ سُوْرَةِ التَّحْرِيْمِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْمُلْكِ

کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ ملک کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْقَلَمِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ

کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ قلم کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ حاقہ

بِحَقِّ سُوْرَةِ الْحَاقَّةِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْمَعَارِجِ عَلَيْكَ

کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ معارج کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں

يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ نُوْحٍ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ نوح کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ جن کے اس حق کے صدقے

الْجِنِّ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْمُزَّمِّلِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ

جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ مزمل کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے

اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْمُدَّثِّرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

سورۃ مدثر کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ قیامت کے اس حق کے صدقے جو

الْقِيَامَةِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الدَّهْرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ

تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ دہر کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں

وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْمُرْسَلَاتِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ

تجھ سے سورۃ مرسلات کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ نبا کے اس حق کے

سُوْرَةِ النَّبَا عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ النّٰزِعَاتِ عَلَيْكَ

صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ نازعات کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔

يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ عَبَسَ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ

اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ عبس کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ تکویر کے اس حق کے

سُوْرَةِ التَّكْوِيْرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْاِنْفِطَارِ عَلَيْكَ

صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ انفطار کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔

يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْمُطَفِّفِيْنَ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ

اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ مطففین کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ انشقاق

بِحَقِّ سُوْرَةِ الْاِنْشِقَاقِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْبُرُوْجِ

کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ بروج کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الطَّارِقِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ

کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ طارق کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ اعلیٰ

بِحَقِّ سُوْرَةِ الْاَعْلٰى عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْغَاشِيَةِ

کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ غاشیہ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْفَجْرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ

کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ فجر کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ بلد کے

بِحَقِّ سُوْرَةِ الْبَلَدِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الشَّمْسِ عَلَيْكَ يَا

اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ شمس کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے

رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ اللَّيْلِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

رب میں تجھ سے سورۃ لیل کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ ضحیٰ کے اس حق کے صدقے

الضُّحٰى عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْاِنْشِرَاحِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ اَسْئَلُكَ

جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ انشراح کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں ۔اور اے میرے رب میں تجھ سے

بِحَقِّ سُوْرَةِ التِّيْنِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ عَلَقٍ عَلَيْكَ يَا رَبِّ

سورۃ تین کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ علق کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے

وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْقَدْرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْبَيِّنَةِ

رب میں تجھ سے سورۃ قدر کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ بینہ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الزِّلْزَالِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ

ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ زلزال کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ عادیات کے اس

بِحَقِّ سُوْرَةِ الْعَادِيَاتِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْقَارِعَةِ

حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ قارعہ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ التَّكَاثُرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ

ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ تکاثر کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ عصر کے اس حق

بِحَقِّ سُوْرَةِ الْعَصْرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْهُمَزَةِ عَلَيْكَ

کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ ہمزہ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور

يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْفِيْلِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ

اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ فیل کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ قریش کے اس حق کے صدقے

قُرَيْشٍ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْمَاعُوْنِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَ

جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ ماعون کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ کوثر

اَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْكَوْثَرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْكَافِرُوْنَ

کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ کافرون کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا

عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ النَّصْرِ عَلَيْكَ يَا رَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ

ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ نصر کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ لہب کے اس حق

سُوْرَةِ اللَّهَبِ عَلَيْكَ يَارَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْاِخْلَاصِ عَلَيْكَ يَارَبِّ

کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ اخلاص کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں

وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ الْفَلَقِ عَلَيْكَ يَارَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ سُوْرَةِ النَّاسِ عَلَيْكَ

تجھ سے سورۃ فلق کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں تجھ سے سورۃ ناس کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے سوال کرتا ہوں

يَارَبِّ وَاَسْئَالُكَ بِحَقِّ عَظَمَةِ الْاَنْبِيَآءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْمُقَرَّبِيْنَ وَ

اور اے میرے رب میں تجھ سے انبیاء اور رسولوں اور فرشتوں اور تیرے قریب پہنچے ہوئے بندوں اور شہیدوں اور نیکوں

الشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَاَهْلِ طَاعَتِكَ اَجْمَعِيْنَ اَنْ تُصَلِّيَ وَتُسَلِّمَ عَلٰى سَيِّدِنَا

اور تیرے سارے فرمانبرداروں کی عظمت کے حق کے صدقے میں سوال کرتا ہوں کہ تو ہمارے سردار حضرت محمد

مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَاَنْ تُحَفِّظَ حَامِلَ كِتَابِيْ هٰذَا وَاَنْ تَحْرُسَهٗ

صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل اور سارے ساتھیوں پر درود اور سلام بھیج۔ اور میری یہ کتاب پاس رکھنے والے کی حفاظت کرے

بِعَيْنِكَ الَّتِيْ لَاتَنَامُ وَمُلْكِكَ الَّذِيْ لَايُضَامُ وَاَنْ تَشْفِيَهٗ مِنْ جَمِيْعِ

اور اس کی نگہبانی کرے اپنی اس آنکھ کے ساتھ جو سوتی نہیں۔ اور اس مملکت کے ساتھ جو لازوال ہے۔ اور تو اسے ساری کی

الْاَمْرَاضِ بِاَلْفِ اَلْفِ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ اَنْ تُحَفِّظَهٗ

ساری بیماریوں سے کروڑوں لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم کے طفیل شفا بخش۔ اور اے میرے

يَارَبِّ مِنْ كُلِّ سُوْءٍ وَبَلَاءٍ وَحَرْقٍ وَغَرْقٍ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيْهِ وَمِنْ

رب تو اس کی حفاظت کر ہر ایک برائی سے اور مصیبت سے اور جلنے سے اور ڈوبنے سے اور ہر اس چیز سے جو اسے ایذا پہنچائے اور

جَمِيْعِ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ اُنْثٰى وَذَكَرٍ وَجَمِيْعِ الْخَلْقِ اَجْمَعِيْنَ وَبِحَقِّ

تمام انس و جن اور ہر عورت اور ہر مرد اور ساری مخلوقات کی شر سے اور اپنے

الْاِسْمِ الَّذِيْ دَعَاكَ بِهٖ اٰدَمُ فَجَمَعْتَهٗ لِسَيِّدَتِنَا حَوَّاءَ وَبِحَقِّ الْاِسْمِ الَّذِيْ

اس نام کے صدقے میں جس نام سے حضرت آدم علیہ السلام نے تجھے پکارا تو تو نے ہماری سردار حوا کو ملایا۔ اور اس نام کے حق کے

دَعَاكَ بِهِ الْخِضْرُ فَمَشٰى عَلَى الْمَاءِ فَتَوَارَتِ الظَّمَأُ وَبِحَقِّ الْاِسْمِ الَّذِیْ دَعَاكَ

صدقے جس نام سے حضرت خضرؑ نے تجھے پکارا اور وہ پانی پہ چلے اور پیاس بجھائی۔ اور اس نام کے حق کے صدقے جس نام سے

بِهِ الْمُؤْمِنُوْنَ اُلْقُوْا فِي النَّارِ۔ فَاَصْرَفْتَ الْخُضْرَ وَلَقِيْتَ السَّمَآءُ مُعَلَّقَةً

ان ایمان والوں نے جنھیں آگ میں ڈالا گیا تجھے پکارا تو تو نے اسے سبزے میں بدل دیا۔ اور تو نے آسمان کو قدرت سے ٹکائے

بِالْقُدْرَةِ وَبِحَقِّ الْاِسْمِ الَّذِیْ دُعَاكَ بِهِ اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاُلْقِيَ فِي

رکھا۔ اور اس نام کے حق کے صدقے جس نام سے حضرت ابراہیمؑ نے تجھے پکارا اس حال میں کہ وہ آگ

النَّارِ فَكَانَتْ عَلَيْهِ بَرْدًا وَسَلَامًا وَبِحَقِّ الْاِسْمِ الَّذِیْ دَعَاكَ بِهِ مُوْسٰى عَلَيْهِ

میں ڈالے گئے تھے۔ تو وہ آگ ان پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوگئی اور اس نام کے حق کے صدقے میں جس نام سے حضرت موسیٰؑ نے

السَّلَامُ فَانْفَلَقَ لَهُ الْبَحْرُ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ وَبِحَقِّ الْاِسْمِ الَّذِیْ

تجھے پکارا تو ان کے لئے سمندر پھٹ گیا، تو ہر ٹکڑا بڑے تودے کے مانند بن گیا۔ اور اس نام کے حق کے صدقے میں

دَعَاكَ بِهِ نُوْحٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَنَجَّيْتَهُ مِنَ الطُّوْفَانِ وَاَغْرَقْتَ الْقَوْمَ

جس نام سے حضرت نوحؑ نے تجھے پکارا تو تو نے انہیں طوفان سے نجات بخشی اور ظالموں کی قوم کو غرق

الظَّالِمِيْنَ وَبِحَقِّ الْاِسْمِ الَّذِیْ دُعَاكَ بِهِ اِدْرِيْسُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَرَفَعْتَهُ

کر دیا۔ اور اس نام کے حق کے صدقے جس نام سے حضرت ادریسؑ نے تجھے پکارا تو تو نے انہیں بہت اونچے

مَكَانًا عَلِيًّا وَبِحَقِّ الْاِسْمِ الَّذِیْ دُعَاكَ بِهِ يَعْقُوْبُ عَلَيْهِ السَّلَامُ خَرَدْتَ

مکان کی بلندی بخشی۔ اور اس نام کے حق کے صدقے جس نام سے حضرت یعقوبؑ نے تجھے پکارا تو تو نے ان کی بینائی

عَلَيْهِ بَصَرَهُ وَوَلَدَهُ وَبِحَقِّ الْاِسْمِ الَّذِیْ دُعَاكَ بِهِ يُوْسُفُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

اور ان کا بیٹا انہیں واپس دے دیا۔ اور اس نام کے حق کے صدقے جس نام سے حضرت یوسفؑ نے تجھے پکارا تو تو نے

فَنَجَّيْتَهُ مِنَ السِّجْنِ وَوَلَّيْتَهُ مُلْكَ مِصْرَ وَبِحَقِّ الْاِسْمِ الَّذِیْ دُعَاكَ بِهِ

انہیں قید خانے سے نجات بخشی اور انہیں مصر کی بادشاہی عطا فرمائی۔ اور اس نام کے حق کے صدقے جس نام سے

اَیُّوْبُ عَلَیْہِ السَّلَامُ فَکَشَفْتَ عَنْہُ الضُّرَّ وَ اَسْأَلُکَ بِحَقِّ اِسْمِکَ الَّذِیْ

حضرت ایوب نے تجھے پکارا تو تو نے ان سے دکھ دور کر دیا۔ اور میں تجھ سے تیرے اس نام کے حق کے صدقے میں

سَمَّیْتَ بِھَا نَفْسَکَ وَ اَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ وَ عَلَّمْتَہٗ لِاَحَدٍ مِّنْ

سوال کرتا ہوں جس نام سے تو نے اپنے آپ کو یاد کیا اور تو نے اپنی کتاب میں اُسے نازل فرمایا اور تو نے اپنی مخلوقات میں سے

خَلْقِکَ اَنْ تَجْعَلَ حَامِلَ کِتَابِیْ ھٰذَا فِیْ مَکْنُوْنِ حِرْزِکَ وَ اَنْ

کسی ایک کو سکھایا کہ تو میری یہ کتاب اپنے پاس رکھنے والے کو اس طرح اپنی حفاظت میں رکھے جس طرح خول میں تصویر۔ اور

تَرْزُقَہُ الْحَظَّ الْجَمِیْلَ وَ الْعُمُرَ الطَّوِیْلَ وَ النَّصْرَ وَ الْعِزَّۃَ وَ الْھَیْبَۃَ

یہ کہ اسے خوش بختی نصیب کرے۔ اور لمبی عمر اور مدد اور عزت اور رعب اور مقبولیت

وَ الْقَبُوْلَ وَ الْمَحَبَّۃَ وَ اَنْ تَجْعَلَہٗ فِیْ ھُیُوْنِ اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ اِنَّکَ

اور محبت عطا فرمائے اور اسے اس حقیقت میں رکھے کہ آگے بڑھ اور نہ ڈر تو ان لوگوں میں

مِنَ الْاٰمِنِیْنَ لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ

سے ہے جو امن میں ہیں۔ تو نہ ڈر تو ظالموں کی قوم سے نجات پا گیا تم دونوں نہ ڈرو بیشک

مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَ اَرٰی لَا تَخَفْ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ قَالَ

میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔ سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ تو نہ ڈر بیشک میرے پاس رسول نہیں ڈرتے۔ اُن

رَجُلَانِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمَا ادْخُلُوْا الْبَابَ

لوگوں میں سے جو ڈرتے تھے۔ ان دو مردوں نے جن پر اللہ نے انعام فرمایا تھا کہا کہ دروازے سے ان لوگوں

فَاِذَا دَخَلْتُمُوْہُ فَاِنَّکُمْ غَالِبُوْنَ وَ عَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوْا اِنْ کُنْتُمْ

پر داخل ہو جاؤ پس جب تم دروازے سے داخل ہو گئے تو بیشک تم غالب ہو۔ اور اللہ پر توکل رکھو۔ اگر تم ایمان

مُّؤْمِنِیْنَ لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا اِنَّ اللّٰہَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ

والے ہو۔ ان کا فریب تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا۔ تم جو عمل کرتے ہو۔ بیشک اللہ اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ اَللّٰهُمَّ يَا مَنْ خَلَقْتَ فِي السَّمَاءِ الرَّابِعَةِ

اور میں نے تجھ پر اپنی ذات سے محبت القا فرمائی ۔ اے میرے اللہ اے وہ ذات جس نے چوتھے آسمان میں ایک فرشتہ

مَلَكًا نِّصْفُهٗ مِنْ نَّارٍ وَّنِصْفُهٗ مِنْ ثَلْجٍ فَلَا النَّارُ تُذِيْبُ الثَّلْجَ

پیدا فرمایا ہے کہ آدھا جسم اس کا آگ کا ہے اور آدھا برف کا ۔ پس نہ آگ برف کو پگھلاتی ہے نہ برف

وَلَا الثَّلْجُ يُطْفِئُ النَّارَ وَالْمَلَكُ يُنَادِيْ بِلِسَانِ الْاَقْدَارِ اَللّٰهُمَّ يَا

آگ کو بجھاتی ہے اور فرشتہ اپنی باعزت زبان سے پکارتا ہے ۔ اے میرے اللہ اے وہ

مَنْ اَلَّفْتَ بَيْنَ الثَّلْجِ وَالنَّارِ اَلِّفْ قُلُوْبَ الْخَلْقِ وَالْبَشَرِ مِنْ كُلِّ

جس نے برف اور آگ کو آپس میں جوڑ دیا ۔ مخلوقات اور بشر سے آدم کے بیٹوں اور

اُنْثٰى وَذَكَرٍ مِّنْ اَوْلَادِ اٰدَمَ وَبَنَاتِ حَوَّاءَ وَمِنْ اَمِيْرٍ وَّوَزِيْرٍ

حوّا کی بیٹیوں میں سے مرد اور مرد اور ہر امیر اور وزیر اور ہر غنی اور

وَّغَنِيٍّ وَّفَقِيْرٍ عَلٰى مُحَبَّةِ حَامِلِ كِتَابِيْ هٰذَا اَللّٰهُمَّ ارْفَعْ عَنْهُ شَرَّ

ہر فقیر کے دلوں کو میری یہ کتاب رکھنے والے کی محبت پر آمادہ کر دے ۔ اے میرے اللہ اس سے بڑے

الْاَشْرَارِ وَشَرَّ الْعَمٰى وَالرَّمَدِ وَالرُّعَافِ وَالنَّزِيْفِ وَالشَّقِيْقَةِ

لوگوں کی برائی دُور فرما اور اندھاپن اور آشوبِ چشم اور نکسیر اور دردِ سر اور آدھا سر

وَالصُّدَاعِ وَالنَّظْرَةِ وَوَجَعِ الْقَلْبِ وَالطِّحَالِ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ بَدْرِ التَّمَامِ

اور مرگی اور نظرِ بد اور دل کا درد اور تلی کا درد دُور فرما ۔ حضرت محمد الرسول اللہ کے

عَلَيْهِ اَفْضَلُ الصَّلٰوةِ وَالسَّلَامُ وَاجْعَلْ كَيْدَ مَنْ عَادَاهُ فِيْ نَحْرِهٖ وَ

حق کے صدقے جو چودہویں کا پورا چاند ہیں ۔ ان پر بہتر سے بہتر درود اور سلام ہو ۔ اور جو شخص اس سے دشمنی کرے

اَعْقِدْ عَنْهُ اَلْسِنَةَ اَوْلَادِ اٰدَمَ وَبَنَاتِ حَوَّاءَ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ وَ

اسکے مکروفریب کو اسکے اپنے گلے کا پھندا بنائے ۔ اور آدم کے بیٹوں اور حوا کی بیٹیوں کی زبانیں اس سے بند رکھے یہ

وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ

یہ وہ دن ہے کہ وہ نہیں بول سکتے۔ اور نہ انہیں اجازت دی جائیگی۔ کہ وہ کوئی عذر کریں آج کے دن تُف ہے جھٹلانے والوں

لَا يَنْطِقُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا لَّا يَتَكَلَّمُ فِیْ

کیلئے۔ گونگے ہیں۔ بہرے ہیں۔ اندھے ہیں۔ وہ نہیں بول پاتے۔ سوائے اس شخص کے جسے رحمت فرمانے والا اجازت بخشے۔ اور وہ ٹھیک ٹھیک کہہ دے۔

حَقِّ حَامِلِ كِتَابِیْ هٰذَا لِسَانُ الْاَبْيَضِ وَالْاَسْوَدِ وَالشَّيْخِ وَالصَّغِيْرِ

نہیں بول سکتی زبان کسی سفید کی اور کسی سیاہ کی۔ اور کسی بوڑھے کی اور کسی چھوٹے کی

وَسَائِرِ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ بِحَقِّ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَبِحَقِّ هٰذِهِ

اور سارے لوگوں کی میری یہ کتاب پاس رکھنے کے حق میں الحمد للہ رب العالمین کے حق کے صدقے میں اور ان

الْاَسْمَاءِ سوسم خوسم سوسم حوسم حوهم حوحم حوحم ديوم

ناموں کے حق کے صدقے میں۔ سوسم خوسم سوسم حوسم حوہم حوحم حوحم دیوم

ديوم قيوم قيوم عالوم عالوم سالوم سالوم الوصى شماخ شماخ

دیوم قیوم قیوم عالوم عالوم سالوم سالوم الوصی شماخ شماخ

العالى على كل براخ قدوس قدوس ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ شَاهَتِ

العالی علی کل براخ قدوس قدوس یہ اللہ ہے تمہارا پروردگار غالب اور عزت والا۔ پھر گئے

الْوُجُوْهُ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَيُّوْمِ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا وَاَعْقِدْ

سارے منہ حیّ و قیوم کے لئے اور خاک بسر ہوا جس نے ظلم کیا اور آدم کے

اَلْسِنَةَ الْمُتَكَلِّمِيْنَ وَالْمُتَكَلِّمَاتِ مِنْ اَوْلَادِ اٰدَمَ وَبَنَاتِ حَوَّاءَ يَوْمَ تَشَقَّقُ

بیٹوں اور حوا کی بیٹیوں میں سے بولنے والوں اور بولنے والیوں کی زبانیں بند کر دے جس دن آسمان بادل

السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَالْاَقْدَامِ وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَائِهِمْ

کی طرح پھٹ پڑیگا۔ اور جس دن مجرم پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑا جائیگا۔ اور اللہ ان کے اوپر سے گھیرا کئے

مُحِیْطٌ بَلْ ھُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ وَ بِحَقِّ اَلْفَ اَلْفَ

ہوئے ہے۔ بلکہ وہ قرآن ہے بزرگی والا لوح محفوظ میں اور کروڑوں لاحول ولاقوۃ الا

لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ اَللّٰھُمَّ یَا سَلَامُ

باللہ العلی العظیم کے حق کے صدقے میں اے میرے اللہ اے سلام اس شخص کو

سَلِّمْ حَامِلَ کِتَابِیْ ھٰذَا وَ اَعْقِدْ عَنْہُ لِسَانَ الْحَیَّۃِ وَزُبَانَ

جس کے پاس میری یہ کتاب ہو سلامت رکھ اور اس سے سانپ کی زبان اور بچھو کا ڈنگ بند رکھ

الْعَقْرَبِ بِحَقِّ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَ

ان آیتوں کے حق کے صدقے میں کہہ دو یا رسول اللہ کہ وہ اللہ یکتا ہے اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ وہ کسی

لَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ

کی اولاد ہے اور نہ ہوا اس کیلئے کوئی قرابتدار۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ فرما دیجئے یا رسول اللہ کہ میں

الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ وَمِنْ شَرِّ

پناہ مانگتا ہوں۔ ساتھ صبح کے پروردگار کے ہو اس چیز کی برائی سے جو اس نے پیدا کی اور اندھیرا کرنے والی رات کی برائی سے جب وہ

النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔ بِسْمِ

پھیل جائے اور گانٹھوں میں پھونکیں مارنے والی عورتوں کی برائی سے اور حاسد کی برائی سے جب وہ حسد کرے۔ بسم

اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ

اللہ الرحمٰن الرحیم فرما دیجئے یا رسول اللہ میں پناہ مانگتا ہوں۔ ساتھ پروردگار لوگوں کے۔ لوگوں کے

اِلٰہِ النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ

بادشاہ کے۔ لوگوں کے خدا کے۔ اس کی برائی سے جو وسوسہ ڈالتا ہے۔ لوگوں کے سینوں میں جنوں سے

صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَ النَّاس فَرْدٌ جَبَّارٌ شَکُوْرٌ ثَابِتٌ

اور انسانوں سے۔ یکتا ہے۔ زبردست ہے۔ شکر قبول کرنے والا ہے۔ ثابت ہے۔

ظَهِيْرٌ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِىَ الْمُؤْمِنِيْنَ

غالب ہے ۔اور یا رسول اللہ آپ نے کنکر نہیں پھینکے جب آپ نے پھینکے ۔بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکے اور تاکہ ایمان والوں کی اس

مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا اهے اهے اهے اهے اهے اهے كل كل شي شي

بات کے ذریعے بہتر آزمایش کرے ۔ اہے اہے اہے اہے اہے اہے کل کل شي شي

اِحْجُبُوْا عَنْ حَامِلِ كِتَابِىْ هٰذَا شَرَّ كُلِّ مَا يُؤْذِيْهِ مِنَ

جس شخص کے پاس میری یہ کتاب ہو اس سے ہر اس چیز کی بُرائی دُور رکھو جو انسانوں اور

الْاِنْسِ وَالْجِنِّ بِحَقِّ هٰذِهِ الْاَسْمَاءِ وَبِحَقِّ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ

جنوں سے اسے ایذا پہنچا سکتی ہو ۔ان ناموں کے حق کے صدقے اور ان آیتوں کے حق کے صدقے ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِىْ لَا يَضُرُّ مَعَ اِسْمِهٖ شَيْءٌ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى

اس اللہ کے نام کے ساتھ کہ اس کے نام کے ہوتے ہوئے کوئی چیز ضرر نہیں پہنچا سکتی نہ زمین میں نہ

السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبِّ اشْرَحْ لِىْ صَدْرِىْ وَيَسِّرْلِىْ

آسمان میں اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ۔اے میرے پروردگار کھول دے سینہ میرا میرے لئے اور آسان

اَمْرِىْ وَاقْضِ عَنِّىْ حَاجَاتِىْ وَاغْفِرْلِىْ خَطِيْئَاتِىْ بِحَقِّ سَيِّدِ

کر مجھ پر میرا کام اور میری حاجتوں کا بوجھ مجھ سے اُتار دے اور بخشش کر میری خطاؤں سے ساری کائنات کے

الْاَكْوَانِ رَسُوْلِكَ مُحَمَّدٍ عَلَيْكَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ

سردار اپنے رسول حضرت محمدؐ کے اس حق کے صدقے جو تجھ پر ہے ۔آپ پر ایک ایک ذرے کے بدلے

بِعَدَدِ كُلِّ ذَرَّةٍ مِائَةَ اَلْفِ اَلْفِ مَرَّةٍ ۔

کروڑ کروڑ بار درود اور سلام ہو ۔

تصحیح ضروری

کتاب ہذا کا نام (جس کا پہلے اعلان کتاب "صحیفہ غوثیہ" میں ہو چکا ہے)
"خیر فقیر" رکھا گیا تھا۔ مگر بعد میں بعض احباب کی فہمائش پر وہ نام تبدیل
کر کے "الفقر فخری" تجویز کیا گیا ہے۔ مولا کریم شرفِ اجابت بخشے
لہٰذا قارئینِ کرام سے گذارش ہے کہ وہ "خیر فقیر" کے نام پر فقیر کی
تصانیف میں کوئی دوسری کتاب تلاش نہ فرمائیں۔ فقط

فقیر ابوالفیض

ختم شریف

حضرات خواجگان سہروردیہ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	۷۸۶ بار
وصلی اللہ علیٰ حبیبہ محمدٍ وّ آلہ واصحابہ وسلم	۵۱۱ بار
سورہ فاتحہ	۱۱۱ بار
سورہ الم نشرح لکؔ	۱۱۱ بار
سورہ اخلاص	۱۱۱ بار
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ بِعَدَدِ کُلِّ ذَرَّۃٍ مِّائَۃَ اَلْفِ اَلْفِ مَرَّۃٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ	۱۰۱۱ بار
یا قاضی الحاجات	۱۱۱ بار
یا کافی المہمات	۱۱۱ بار
یا شافی الامراض	۱۱۱ بار
یا حل المشکلات	۱۱۱ بار
یا سامع المناجات	۱۱۱ بار
یا مجیب الدعوات	۱۱۱ بار

یا رافع الدرجات ١١١ بار

یا مسبب الاسباب ١١١ بار

یا مفتح الابواب ١١١ بار

یا غالب علی امرہ ١١١ بار

یا ارحم الراحمین ١١١ بار

یا حي یا قیوم برحمتك استغیث ١١١ بار

لا الٰہ الا انت سبحانك انی کنت من الظلمین ٣١٣ بار

حال ماخستہ دلاں للّٰہ نگر ١١ بار

المدد شیخ شہاب الدین عمر

سبحان ربك رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للّٰہ رب العلمین

یہ ختم شریف حلقہ بگوشانِ سہروردیہ کو باوضو پورے خشوع و خضوع سے بعد نماز فجر یا عصر حلقہ کی صورت میں بیٹھ کر پڑھنا چاہئے۔ رب العزت جل شانہٗ کے فضل و کرم سے جملہ دینی و دنیوی حاجات کے لئے ازبس کافی ہے۔

خاتمۃ الکتاب

قارئین کرام آگاہ ہیں کہ توفیق ایزدی سے سابقہ اوراق میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس کا مقصد محض یہ ہے کہ طالب حق کو مکروہاتِ دنیا سے آزاد ہو کر حضور وشہودِ حق سے اپنا دل معمور و آباد کرنے کی صحیح راہ مل جائے۔ اور وہ کامل رہنمائی سے طمانیت قلب کا حامل ہو کر قربِ ربانی کا شرف حاصل کر سکے۔ جو عین منتہائے عبودیت ہے۔ کیونکہ جب متلاشیٔ حق اپنے آپ میں شانِ عبودیت پیدا کر کے استقامت قلبی کے ساتھ راہِ عرفان طے کرتا ہے تو چپے چپے پر معرفتِ الٰہی کے جلوے اور قدم قدم پر فیضانِ ربی کے آثار اسکا استقبال کرتے ہیں۔ اور وہ تجلیات جن کا کبھی متمنی تھا خود بخود اس پر پرتو افگن ہو کر منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہیں۔ صحیح راہ کی تمیز یہی ہے کہ اس کے اختیار کرنے والا بطالت وضلالت سے محفوظ و مصئون رہتا ہے۔ اور صداقت و حقیقت کے عکوس اس کے سر پہ ہر لحظہ سایہ کناں و محیط ہوتے ہیں۔ جن سے وہ ساعت بساعت منزلِ محبوب کے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔

صحیح راستہ معلوم ہونے پر کسی حسد و تعصب کے ماتحت غلط راہ کا اختیار کرنا محض ڈھٹائی گمراہی اور اغوائے شیطانی ہے۔ ہر ذی شعور راستی سے دیدہ دانستہ اعراض اور ہدایت و صداقت سے کبھی اغماض نہیں کر سکتا۔ ہٹ دھرمی، بدعقیدگی، جماعتی افتراق اور ضد کو چھوڑ کر حق کو قبول کرنا اس کا فطری حق ہوتا ہے۔ تاکہ مہالک و خطرات سے سلامتی ہو۔ اور مولا کریم جل وعلا شانہٗ اپنی رحمت نامتناہیہ سے راہ کی مشکلیں آسان فرما کر اپنے مقاماتِ قرب سے حسب استعداد کوئی مقامِ رحمت عطا فرمائے۔

وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

جمالِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

از:- ابوالفیض قلندر علی سہروردی

یہ کتاب ایسے شخص کے لئے نہیں لکھی گئی جو سرورِ کائنات، مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت کا منکر، معجزات میں طعنہ زن، معین آثار و نشانات سے منحرف، دقیع خصائل و جمیع کمالات سے روگرداں اور خصائص کبریٰ و فضائل عظمیٰ میں شک و شبہ کرنے والا ہو۔ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اہلِ محبت کے لئے ہے۔ جو حضورؐ کی ہر دعوت پر لبیک کہنے والے اور نبوت مختتمہ و رسالت نامہ کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ تاکہ ان کی محبت میں تاکیدِ ایمان میں مضبوطی اور اعمال میں زیادتی ہو۔

خداوندِ عالم جل مجدہٗ اس پر قادر ہے کہ وہ نبوت محمدیہ علیہ الصلوات والتسلیمات کے اس روشن پہلو ہی سے لوگوں میں وہ نورِ معرفت نبوت پیدا فرما دے۔ جو بغیر کسی واسطہ کے ان کو اس کا اہل بنا دے۔ اور بے ساختہ بول اٹھیں ؎

خدا کو مانا ہے دیکھ کر تجھ کو اس کی شانِ جمیل تو ہے
خدا کی ہستی پہ میرے نزدیک سب سے روشن دلیل تو ہے

اس کتاب میں سیرت خیر الخلق، ختم نبوت، آدابِ دربارِ رسالت، عظمتِ مصطفےٰ، مسئلۂ علمِ غیب، معجزات علمِ غیب، نظامِ احیائے ملت، مسئلۂ جہاد اور اسلام وغیرہ پر نہایت دیانتداری سے صحیح روشنی ڈالی گئی ہے۔

کاغذ، طباعت نہایت عمدہ، خوشنما رنگین سرورق - قیمت:- پانچ روپے

ملنے کا پتہ

چوہدری محمد یوسف بی۔ اے سیکرٹری مکان 8.A

گلی نمبر ۳۔ دھرمپورہ، لاہور

فہرست تصانیف حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردی مدظلہ العالی

سیاح لامکاں۔ اس کتاب میں مسئلۂ فلسفۂ معراج پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور معترضین کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا گیا ہے۔ قیمت صرف دو روپے (عا)

موعظۃ للمتقین۔ اس کتاب کے متعلق چند علماء کی رائے ہے کہ یہ کتاب لکھ کر حضرت مصنف نے علماء پر احسان کیا ہے۔ قیمت دو روپے (عا)

صحیفۂ غوثیہ۔ قصیدۂ غوثیہ کی شرح ہے۔ اس کا مطالعہ سالکانِ راہِ طریقت کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی ہے۔ قیمت چار روپے (للعہ)

دعوت الحنفیہ۔ یہ وہ رسالہ ہے جس میں اصلاح عقائدِ شیعہ کے لئے وضاحت سے لکھا گیا ہے۔ قیمت ۱۲؍

پردۂ نسواں۔ اس کتاب میں قرآن و حدیث کی روشنی میں بے پردگی کے حامیوں کے لئے مسکت جواب ہے۔ قیمت ۴؍

حلیۃ النبیؐ۔ یہ چھوٹی سی کتاب پنجابی اشعار میں بڑے مقبول طریقہ پہ لکھی گئی ہے۔ قیمت ۴؍

لباس التقویٰ۔ یہ رسالہ ڈاڑھی کی شرعی حقیقت پہ بڑی وضاحت سے لکھا گیا ہے۔ قیمت ۴؍

رسالہ علم غیب۔ یہ رسالہ حضور علیہ السلام کے علم غیب کے متعلق ایک فیصلہ کن تحریر ہے۔ قیمت ۱۰؍

الفقر فخری۔ اس کتاب میں حقیقت تصوف پر تفصیلی بحث ہے۔ قیمت

قمیصِ یوسفی۔ یہ ہیر وارث شاہ کے وزن پر پنجابی زبان میں ایک نہایت درد انگیز قصہ لکھا گیا ہے۔ جو زیر طبع ہے۔

تذکرۂ سہروردیہ۔ جس میں صوفیائے کرام کے دینی کارناموں پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ عہ

تعارف سہروردیہ۔ اس میں دعائے مغنی، شجرۂ عالیہ سہروردیہ حضرت میاں صاحب رح سہروردی حیات گڑھی کی مختصر سوانح حیات، دعائے مناجات وغیرہ تحریر ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ عہ

متفرق تصانیف

میلاد الرسولؐ۔ شعبان المعظم۔ کتاب الصوم۔ صوت ہادی۔ رمضان المبارک۔ اسلامی عورت، زکوٰۃ کا اسلامی نظام

یہ مختلف رسائل مختلف موضوعات پر چھپوا کر مرکزی مجلس سہروردیہ نے محض للہ تقسیم کئے۔

ملنے کا پتہ

چوہدری محمد یوسف بی۔ اے۔ سیکرٹری

مکان 8.A گلی نمبر ۳، دھرم پورہ، لاہور

